اردو زبان کیا ہے؟
ڈاکٹر سلیم اختر
Meer Zaheer Abass Rustmani

ڈاکٹر سلیم اختر

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

491.43909 Saleem Akhtar, Dr.
Urdu Zaban Kia Hai/ Dr. Saleem Akhtar.- Lahore : Sang-e-Meel Publications, 2003.
400p.
Kitabiat: p.387-398
Bibliography-399
1. Urdu Language. 2. History.
I. Title.

2003
نیاز احمد نے
سنگ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-0342-2

Sang-e-Meel Publications
Phones 7220100-7228143 Fax 7245101
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan

ترتیب

۱۔ زبان کیا ہے: ۹

کلام۔ آوازوں کا نقار خانہ۔ سامانِ خود بینی "میش" کا طلوع۔ شجرِ سایہ دار۔ جڑ۔ ہوا کی تحریر۔ لفظ کی حکایت۔ لفظ کا سفر۔ تصویر کا لفظ۔ قدیم ترین زبان۔ زبان: آسمانی تحفہ۔ آدم کی زبان۔ عالمی زبان۔ زبان: عمرانی تناظر۔ لسانی اشتراک۔ پادلوف کا کتا۔ آوازوں کی آبشار۔ حرف کا سانچہ۔ صوتی تفاوت۔ الفاظ کی بستی۔

۲۔ اُردو زبان کے نام: ۶۴

ہندی / ہندوی۔ مغل ہندو اور ہندوی۔ ہندی کے مختلف نام۔ خسرو: مشترک لسانی کلچر کی علامت۔ بنگالِ ہندوش۔ ہندوستانی۔ ریختہ۔ ریختہ ساز: امیر خسرو۔ ریختہ میں تنوع۔ ریختہ اور موسیقی۔ اُردو اور چنگیز خاں۔ اُردو: لشکر۔ مغل اور اُردو۔ اُردوئے معلیٰ۔

۳۔ اُردو زبان کا آغاز: ۱۱۷

اُمّی کی گتھا۔ قافلۂ سخت جان۔ لسانی تحقیق: تناظر۔ آغاز: مقامی نظریات۔ پنجاب میں اُردو۔ اہل زبان کا دبئی: پنجاب۔ "پنجابیوں نے لوٹ لیا"۔ پرانا مسالہ۔ معلّم اول:

غیر ملکی الفاظ کا میزبان: پنجاب ۔ خمارِ گندم ۔ آفتابِ تحقیق ۔ عہد آفرین نظریہ ۔
دکن میں اُردو ۔ عرب ہند تعلقات ۔ عرب دکن میں ۔ گلزارِ دکن ۔ دکنی ۔
کھل جا سم سم ۔ ہاشمی کی الجھن ۔

ریگستان میں نخلستان ۔ عرب سندھ تعلقات ۔ سندھ: اُردو کا پہلا گہوارہ ۔
دائرہ کی تکمیل ۔ اُردو کہاں کہاں ؟

آغاز: زبانوں سے تعلق کے نظریات ۔ ہر کہ آمد ۔ برج بھاشا ۔ ہریانی ۔ قدیم
ویدک بولی ۔ مہاراشٹری ۔ دراوڑی ۔ عمارتِ نو ساخت ۔

۴۔ اصلاحِ زبان کی تحریکیں: ۱۲۸

گلشن گلشن ۔ لفظ کی توانائی ۔ خوب سے خوب تر کی جستجو ۔ اچھوت الفاظ ۔ تلقینِ ترک ۔
مصری کی ڈلیاں ۔ الفاظ کا حقہ پانی بند ۔ تخلیقی الجھن ۔ اسم با مسمٰی: ناسخ ۔ الفاظ کا
گلا گھونٹنا ۔

ایہام: دامِ الفاظ ۔ ایہام: نفسیاتی تناظر ۔ بنا کھلونا ۔ صاف گوئی ۔ دخیل
الفاظ ۔ غریب رشتے دار ۔

۵۔ اُردو رسم الخط: ۲۲۷

فنِ تحریر: دیوتاؤں کی عطا ۔ الفاظ کے چہرے ۔ چڑیا کے پنجے ۔ الف: بیل کا
سر ۔ عربی رسم الخط ۔ باب العلم: اصل خط کوفی است ۔ ابجد ۔ جنتِ نگاہ
فردوسِ گوش ۔ جلال و جمال کا امتزاج: خطاطی ۔ نسخ ۔ تعلیق ۔ نستعلیق ۔
خطاطی کے اسالیب ۔ اُردو رسم الخط کا مسئلہ ۔

۶۔ اُردو میں لغت نویسی: ۲۷۱

لغت کیوں ؟ لغت نویسی کا آغاز ۔ ہندوستان میں قدیم لغات ۔ سب
سے پہلا اردو لغت ۔ منظوم لغات ۔ آرزو کی نوادر الالفاظ ۔ غالب بطور

لغت نویسی۔ آمد اہل فرنگ کی۔ اردو: مکالمہ و کلمات یہ سے ہنری ٹک ―
ڈکشنری بمقابلہ لغت۔ اُردو کی قدیم ترین لغت۔ لغات اٹھارویں صدی میں۔
انگریزوں کی ڈکشنریاں۔

۷۔ اُردو میں قواعد نگاری: ۳۱۶
پہلی قواعد ـ ہندوستانی زبان: قواعد کی پہلی کتاب۔ ہندوستانی گرامر؛
قواعد کی دوسری کتاب؛ انگریز قواعد نویس۔ برطانوی مستشرقین کا باوا آدم ―
گلکرسٹ کی قواعد۔ دریائے لطافت۔ قواعد: کتابیات۔

۸۔ اُردو میں تراجم اور وضع اصطلاحات: ۳۳۲
مستعار روشنی۔ لسانی لین دین۔ تہذیبی لین دین۔ مغرب مشرق کے زیر اثر۔
ایں ہمہ مضامین فارسی۔ تراجم کے دو ادوار۔ پہلا ترجمہ۔ تھوڑی کوشش۔ تراجم
کی اقسام۔ تراجم اور تخلیقی رویے۔
اصطلاح کیا ہے۔ وضع اصطلاح۔ متغیر اصطلاح۔ اصطلاح، نفسیاتی
تناظر۔ اُردو میں اصطلاح سازی۔

۹۔ اردو و لسانیات: نگاہ بازگشت اور مستقبل ۳۶۹
انسان کی زبان۔ ہمہ یہ تمام۔ بنیادی لسانی مباحث جدید لسانی تحقیقات۔
لفظ کا سفر۔ لسانی نظریات۔ لسانیات میں تصور نو

کتابیات ۳۸۷
جرائد/اخبارات ۳۹۷
سیاہ گرانی ۳۹۹

ڈاکٹر اے بی اشرف کے نام

"وَمِنْ آیَاتِہٖ خلق السمٰوات والارض وَ اختلاف
السنتکم وَ اَموالکم" (القرآن)

آسمانوں اور زمینوں کی تخلیق اور زبانوں اور رنگوں
کے اختلافات اللہ کی نشانیاں ہیں۔

۱۔ زبان کیا ہے؟

"علم الادم الاسما کلہا" (البقرۃ)

غارِ حرا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے حضرت جبریل کا اوّلین خطاب: "اقرا!"

"ابتدا میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ ساری چیزیں اُسی کے وسیلے سے پیدا ہوئیں اور جو کچھ پیدا ہوا ہے۔ اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔ اس میں زندگی تھی اور وہ زندہ آدمیوں کا نور تھا اور نور تاریکی میں چمکتا ہے اور تاریکی نے اُسے قبول نہ کیا۔" (یوحنا: باب ۱)

در پسِ آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند!
آنچہ استادِ ازل گفت ہماں می گوئیم

یورشیا کے خواستگاروں نے سونا چاندی اور سیسہ میں سے کسی ایک کے درست

انتخاب کے ذریعے سے پورشیا کو حاصل کرنا تھا اس موقع کی مناسبت سے مرچنٹ آف وینس میں شیکسپیئر کا یہ بلیغ مصرعہ :

"WHO CHOOSETH ME MUST GIVE AND HAZARD ALL HE HATH"

له

بادشاہ عالم تذبذب میں تھا۔ دشمن کے علاقے پر لشکر کشی کرے یا باز رہے ؟ وہ اور اس کے درباری مشورے کے لیے کاہن کے پاس پہنچے جس نے جواب میں کہا: رد کو مت جانے دو !

بقول سید احمد دھلوی :

" ثرت کے جنے ہوئے بچوں کی آواز پر غور کریں تو بلی کے بچے کی آواز سے بہت مشابہ پائیں گے، بلکہ بعض اوقات بعینہٖ بکری کے بچے کی سی آواز مفہوم ہوتی ہے۔ یہ ہی حال جنگلی اور وحشی آدمیوں کا ہے کہ وہ چیں چیں چیں پیں کے سوا کچھ بولنا ہی نہیں جانتے " ؎

بقول مولانا محمد حسین آزاد

" میرے دوستو زبان حقیقت میں ایک معمار ہے کہ اگر چاہے تو باتوں باتوں باتوں میں ایک قلعہ فولادی تیار کر دے۔ جو کسی توپ خانے سے نہ ٹوٹ سکے اور چاہے تو ایک بات میں اُسے خاک میں ملا دے جس میں اسے ہاتھ ہلانے کی بھی ضرورت نہ پڑے۔ زبان ایک جادوگر ہے جو کہ طلسمات کے کارخانے الفاظ کے منتروں سے تیار کر دیتا ہے اور جو اپنے مقاصد چاہتا ہے ان سے حاصل کر لیتا ہے وہ ایک نادر مرصع کار ہے کہ جس کی دستکاری کے نمونے کبھی شاہوں کے سروں کے تاج اور کبھی شہزادیوں کے نو لکھے ہار ہوتے ہیں کبھی علوم و فنون کے خزانوں سے زر و جواہر

اس کے قوم کو مالا مال کرتے ہیں ۔ وہ ایک چالاک عیاّر ہے جو ہوا پر گرہ لگاتا ہے اور دلوں کے قفل کھولتا اور بند کرتا ہے یا مصور ہے کہ نظر کے میدان میں مرقع کھینچتا ہے یا ہوا میں گلزار کھلاتا ہے اور اسے پھول ، گل ، طوطی و بلبل سے سجا کر تیار کر دیتا ہے۔

لیکن جنوں ، بھوتوں اور عفریتوں کا لشکر شہزادے کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکا ۔ کیونکہ اس کے پاس اسم اعظم تھا ۔

اور ملاحظہ ہوں یہ اشعار بھی :

رہی ناگفتہ میرے دل میں داستاں میری
نہ اس دیار میں سمجھا کوئی زباں میری

یارب وہ نہ سمجھے ہیں نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل ان کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور

کوئی محرم نہیں ملتا جہاں میں
مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں

زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم !

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشِ مرصع ساز کا

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آوے

میرے اصرار پہ وہ ہاتھ چھڑا کر آخر
دستخط آپ سے اُردو میں بنانا میرا

(حسرت موہانی)

آوازوں کا نقار خانہ.

آج انسان لاؤڈ سپیکر کی بدولت "SONIC BOOM" کے دور میں داخل ہو چکا ہے۔ لہذا انسانی آوازوں سے معرّا دنیا کا تصور ممکن نہیں۔ یعنی وہ دور جب انسانی زندگی کسی خاموش فلم کا منظر پیش کرتی تھی اور پرند چرند اور حیوانات کو آدم زاد پر کم از کم اس لحاظ سے تو فوقیت حاصل تھی کہ وہ اپنی اپنی بولی رکھتے تھے۔ شاید قدیم ترین انسان کو زبان کی اتنی زیادہ ضرورت ہی نہ ہو۔ ابھی گروہی جبلت دبی دبی سی تھی۔ وہ تنہا تھا اور اپنی بھوک اور خوف کا اسیر بھی زندگی بنیادی احتیاجات کے دائرے میں مقید تھی اور موسم اور درندوں سے محفوظ رکھنے والی پناہ گاہ مرکزِ زیست تھی۔ موسموں کا تغیر، فطرت کے بدلتے ملبوس، طلوعِ آفتاب، غروبِ ماہتاب اور ستاروں کی چشمک زنی۔ یہ سب اس کے لیے معمے تھے۔ اسی لیے وہ اس بھید بھری دنیا سے ہراساں رہتا تھا اور اسی خوف نے فطرت پرستی پر مبنی اصنام تراشے جس کے نتیجے میں گل سانس یعنی مخلوق میں تبدیل ہو گئے تو اشجار نے دیوتاؤں کا روپ دھار لیا۔ یہ مذاہب کی ابتدائی اور قدیم ترین صورت تھی۔ یعنی E

آج اس امر کا تعین ناممکن ہے کہ گوش انسان نے سب سے پہلے کونسی آواز سنی! اپنی یا دوسروں کی ؟ یہ دوسرے دیگر افراد بھی ہو سکتے تھے اور فطرت بھی اگر اس نے سب سے پہلے اپنے ہم جنس کی آواز سُنی تو یقیناً یہ آواز اس کی اپنی آواز کا آئینہ ثابت ہوئی ہو

گی اور اسی آواز سے اس نے اپنی آواز کی شناخت کی ہوگی لیکن — اور یہ لیکن بہت بڑا ہی ہے۔ اگر اس نے فطرت پر کان دھرے ہوں گے تو اسے آوازوں کا نقار خانہ سنائی دیا ہوگا۔ بلحاظ نوعیت یہ آوازیں دو طرح کی ہوں گی۔ ایک پرندوں اور حیوانوں کے حلق سے نکلی ہوئی اور صرف ان ہی سے مخصوص آوازیں جو ان جانوروں کی پہچان بھی تھیں اور باعث شناخت بھی۔ جب کہ دوسری فطرت کی نظر نہ آنے والی وہ پراسرار آوازیں جن سے کوہ و دشت معمور رہتے تھے۔ ان آوازوں کے تنوع شدت بلکہ تندی کا صرف اسی سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ بادِ بہاری کا لطیف جھونکا، سیاہ آندھی اور طوفانی جھکڑ میں تبدیل ہونے تک کتنے صوتی مراحل طے کرتا ہے۔ ادھر بادل کی گرج، بجلی کی کڑک جیسی بوجھل اور دل دہلا دینے والی آوازیں اس بھید بھرے ماحول کی نادیدہ آوازوں پر مستزاد تھیں۔ اس لیے ہم یہ باور کر سکتے ہیں کہ اس عہد کا انسان بھی ایک لحاظ سے صوتی افراط کا ہی شکار تھا۔ ادھر اس کی اپنی بے زبانی ان آوازوں کے بھنور سے وابستہ اسرار، تیزی اور شدت میں مزید اضافہ کر کے انہیں وجۂ پریشانی اور باعث خوف بھی بنا دیتی ہو گی۔ لہذا جب دھرتی گگن اور ان کے درمیان نظر آنے والی اشیاء اور نادیدہ اور پراسرار قوتوں پر قابو پانے کے لیے سرپرست دیوتاؤں، مہربان دیویوں اور رحم دل پریوں کے ساتھ ساتھ جنوں، بھوتوں، عفریتوں، چڑیلوں اور بچھل پائیوں کی تخلیق سے اساطیر کی اساس استوار کی گئی تو بنیادی نفسیاتی اسباب میں نادیدہ کا خوف بھی شامل کیا جا سکتا ہے۔

"سامانِ خود بینی":

نارسس نے تالاب کی آئینہ نما سطح پر اپنا عکس دیکھا تو حسنِ خود کا گرویدہ ہو کر رہ گیا۔ نارسس کو محض ایک یونانی نوجوان کے برعکس علامت کے طور پر لیا جائے تو یہ الفت ذات انسانی شعور کے اتھاہ ساگر میں خودشناسی کی اولین لہر کی صورت اختیار کر جاتی ہے۔ یہ درست ہے کہ یوں اسیر ذات ہو کر اس نے خودشناسی کی سزا بھی بھگتی مگر میں یہ سمجھتا ہوں کہ

یہ عرفانِ ذات کا وہ لمحہ تھا جس نے ایک ہی جست میں انسان کو دیوتا کا ہم قد بنا دیا۔ اور خود شناسی کا یہی عرفانی لمحہ صدیوں بیشتر اس انسان پر بھی کسی رات میں برق کے ید بیضا کی مانند پر منور انکشاف کر گیا ہوگا کہ تو ... وہ گرد جیسے وحشت ناک جنگل، ڈراونے اندر حتیٰ کہ اپنے جیسی صورت اور جسم رکھنے والے ہم جنسوں سے الگ اور منفرد وجود کا حامل ہے۔ یہ انکشاف کیسے ہوا؟ آج قطعی طور پر کچھ کہنا ممکن نہیں تاہم قیاس ہے کہ کسی نارسس کی مانند اس نے بھی آئینۂ آب میں پہلی مرتبہ اپنا سراپا دیکھ کر خود کو شجر و حجر سے منفرد پایا ہوگا اور یوں انسانی شعور کے تاریک افق پر "میں" کی صورت میں پہلی کرن جگمگائی ہوگی اور یہ بھی ممکن ہے کہ پہلی مرتبہ ساتھی (جنسی رفیق؟) کی آنکھوں نے ہی آئینہ کا کام کیا ہو۔ کون جانے؟

انسان کے لیے عرفانِ ذات کا سفر طویل اور کٹھن ہی سہی لیکن جب ایک مرتبہ شعورِ ذات ہوگیا تو اپنے وجود اور دیگر موجودات کی تقسیم و تشریح کے لیے نقطۂ آغاز بھی مل گیا اور یوں "من و تو" کی صورت میں اس ثنویت نے جنم لیا جس نے ین یانگ، یزداں اہرمن اور رحمٰن ابلیس کی صورت میں کائناتی مساوات کا کردار ادا کیا۔

"میں" کا طلوع

انسانی شعور کے افق پر "میں" کے طلوع سے بیشتر انسان غول کی صورت میں انفرادی تشخص سے عاری حیوانی سطح پر زندگی بسر کرتا تھا لیکن "میں" کے احساس نے جہاں اس میں انفرادی وجود کا شعور پیدا کیا۔ وہاں اسی "میں" کی بدولت وجودِ غیر کا احساس بھی ہوگیا۔ بالفاظ دیگر "میں" سے جنم لینے والی انفرادیت کے احساس نے تقابل، تضاد اور شناخت کے لیے جب "غیر میں" کا ادراک کیا تو اسے "تو" قرار دے کر من و تو کی صورت میں انسانوں کو دو شعبوں میں تو تقسیم کر دیا، مگر اس صورت حال سے جنم لینے والے اس تضاد کو نہ سمجھا کہ "تنہا میں" "کثیر تعداد" "تو" کا کیسے ہم پلہ ثابت ہو سکتا ہے؟

بہرحال "میں" اور "غیر میں" دونوں انسان تھے ایک غول / قبیلہ، نسل، رنگ، اسق

ملک، وطن سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے وہ ندی کے دو کنارے بن کر لاتعلق زندگی بسر نہ کر سکتے تھے۔ خود انحصاری بہت محدود ہوتی ہے اور زندگی کو محدود کر دیتی ہے۔ لہذا ابلاغ کی ضرورت محسوس ہوئی۔ حیاتیاتی سطح پر اس ابلاغ نے دو معروف صورتیں اختیار کیں۔ جسمانی ملاپ اور صوتی ملاپ۔ آنکھوں کی زبان اور اعضا کی پکار شاعرانہ بات سہی لیکن یہ قیاس غلط نہ ہوگا کہ صوتی ملاپ کی عدم موجودگی میں جسمانی ملاپ کے ضمن میں آنکھوں کی زبان سے ہی کام لیا جاتا ہوگا۔ اس نکتہ کی صراحت کے لیے سجاد حیدر یلدرم کے افسانے "خارستان و گلستان" سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

آج ان سوالات کا قطعی جواب دینا ممکن نہیں کہ سب سے پہلے زبان کا ظہور کس خطۂ ارض میں ہوا۔ اس کی ابجد کیا تھی اور وہ کن لسانی خصوصیات کی حامل تھی تاہم "من و تو" کے نقطۂ نظر سے تو یہی قرین قیاس ہے کہ انسان نے سب سے پہلے "میں" کہا ہوگا اور "پھر تو"! "میں" شخصی اظہار اور شخصیت کے تخلیقی رویوں کا مظہر بنا۔ نفسیاتی لحاظ سے اس کی اساس نرگسیت پر استوار تھی اور سیدھی سادی خود پسندی سے لے کر خودشناسی کی مشکل اور بعید عرفانی منزل تک راہ میں کئی ہفت خواں طے کرنا پڑتے تھے۔ اس کے برعکس "تو" سماجی روابط اور معاشرتی تنظیم کا غماز تھا کہ یوں جب اپنے وجود کے ساتھ دوسرے کے وجود اور اپنی انفرادیت کے پہلو بہ پہلو دوسرے کی انفرادیت تسلیم کر لی گئی تو پھر اخلاص، دوستی اور محبت جیسے نجی جذبات سے چل کر احترام آدمیت جیسے مجرّد تصورات تک کا سفر دشوار نہ رہا۔ یوں دیکھیں تو زبان کا تمام سماجی کردار "من" و "تو" میں ختم ہو جاتا ہے اور یہ جو بقیہ لاتعداد الفاظ ملتے ہیں تو یہ زبان کی مختصر ترین داستان میں طویل 'فٹ نوٹس' کی حیثیت رکھتے ہیں۔

"شجرِ سایہ دار":

بحیثیت مجموعی زبان کو اس سربفلک شجر سے تشبیہہ دی جا سکتی ہے جو زمین میں دور تک جڑیں اتارے ٹھنڈی چھاؤں کی چھتری تانے نظر آتا ہے۔ جڑ نظر نہیں آتی لیکن وہ دھرتی سے

حیات بخش رس کشید کر کے ڈال ڈال اور پات پات پہنچاتی ہے اور یوں اُسے ہرا بھرا تروتازہ سرسبزو شاداب اور پُر بہار رکھنے کے ساتھ ساتھ اس کی پائیداری اور استحکام کا باعث بھی ہوتی ہے۔ درخت سے وابستہ تمام اجزا یعنی جڑ، تنا، شاخیں، کونپلیں، پتے، پھول، پھل، چھاؤں اور قوتِ نمو یہ سب زبان کی آغاز و نشو و نما اور مستقبل کے امکانات کے لیے موزوں استعاروں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

ارنسٹ کیسرر (ERNEST CASSIER) نے اپنی معروف تالیف "AN ESSAY ON MAN" میں زبانوں کے آغاز، نشوونما اور ارتقا پر مفصل بحث کرتے ہوئے اس خیال کا اظہار کیا تھا:

"جہاں تک زبان کی شروعات کے مسئلے کا تعلق ہے تو اس نے ہر عہد کے انسانی ذہن کو عجیب طور پر مسحور کئے رکھا۔ ذہانت کے اوّلین ظہور کے ساتھ ہی انسان نے اس پر غور شروع کر دیا۔ متعدد اساطیری حکایات کے ذریعے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یا تو انسان نے خود سے نطق حاصل کیا ورنہ کسی ربانی مرشد کی مدد تو یقیناً شاملِ حال تھی۔" [1]

یونانی فلاسفر "ڈیموکرائٹس" (DEMOCRITUS) نے سب سے پہلے زبان کا انسانی جذبات و احساسات سے ناطہ جوڑتے ہوئے الفاظ کو انسان کی ہیجانی آواز قرار دیا۔ اس کے بعد ایپی کیورس (EPICURUS) اور لوکریٹس (LUCERETUUS) نے بھی اسی نظریے کا پرچار کیا۔ یہ تصور خاصا مقبول رہا۔ حتیٰ کہ اٹھارویں صدی کے آواخر تک ویکو (VICO) اور روسو بھی اسی کے قائل نظر آتے ہیں۔ [2]

"جڑ"

دنیا کی کسی بھی زبان کو لے لیجئے وہ تقریر اور تحریر کی صورت میں مدارج ارتقا طے کر کے اتنی ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ آج اس کی اصل یا آغاز کا مطالعہ ناممکن ہے۔ یہ سب

زمانۂ قبل تاریخ اور ماضی بعید کے اندھیروں میں گم ہیں، صرف علم الانسان اور آثار قدیمہ کے ذریعے سے ہی کچھ معلومات حاصل ہو سکتی ہیں۔

زبان کے جو متنوع مطالعات کیے جا چکے ہیں۔ ان میں وہ مطالعات بہت دلچسپ ہیں جو علم الانسان کے ماہرین کے مشاہدات، تجربات۔ رپورٹوں، سروے اور آرا پر مبنی ہیں۔ افریقہ، آسٹریلیا اور لاطینی امریکہ کے متعدد پس ماندہ، غیر متمدن، نیم وحشی، وحشی حتیٰ کہ مردم خور قبائل تک کے بارے میں جمع کی گئی معلومات اور کوائف سے ان کی زبان کے بارے میں بعض دلچسپ معلومات ملتی ہیں۔ اس نوع کے مطالعات پر مبنی ایک دلچسپ کتاب "LITERATURE AND THE IRRATIONAL" اردین شومیکر (۱۹۶۰ THE SHUMAKER) ہے۔ مصنف نے علم الانسان، نفسیات اور گیشٹالٹ کی امداد سے غیر متمدن قبائل کی زبان (ادب اور مصوری) کا بعض مغربی زبانوں (ادب اور مصوری) کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیا ہے ایک موقع پر اس نے غیر متمدن زبان کے خصائص گنواتے ہوئے اس امر پر بطور خاص زور دیا کہ" ادبیات کے ساتھ ساتھ غیر متمدن افراد کی زبان ٹھوس، مخصوص اور حسیاتی الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے۔(ص ۴۵) اسکا مطلب یہ ہوا کہ وہ محض درخت کہنے کی بجائے درخت کا نام لیں گے۔ یعنی اُن کی زبان میں عمومیت کی بجائے تخصیص ملتی ہے۔ اس ضمن میں مصنف نے قدیم دور کے ایک ماہر لسانیات جے ایچ ٹرمبل (J.H TRUMBULL) کا حوالہ دیا ہے۔ جس کے بموجب امریکی انڈین کی زبان میں انگریزی کی مانند پکانا جیسا فعل نہیں ملتا بلکہ وہ بطور خاص اس کا تعین کریں گے کہ خوراک گوشت کی صورت میں ہے یا سبزی یا پھر یہ کہ کھانا انفرادی نوعیت کا تھا کہ اجتماعی (ص ۴۶) اسی سلسلے میں وہ اس بات کی طرف بھی اشارہ کرتا ہے کہ" پسماندہ زبانوں میں جو ٹھوس اور مخصوص پر اتنا زور دیا جاتا ہے تو یہ اس بنا پر کہ وہ ادراک کو جدا کر دینے کی بجائے تشاکلی "CONFIGURATION" صورت میں لیتے ہیں" ص: ۴۹) یعنی وہ دیکھنا فعل کی بجائے دیکھنے کے انداز، زاویۂ نگاہ اور موقع و محل کی مناسبت سے لفظ استعمال کرتے ہیں۔

یہ امر معنی خیز ہے اس لیے کہ بچے کی زبان میں (خصوصاً جب وہ زبان سیکھنے کے عمل سے گذر رہا ہوتا ہے) بعض اوقات اسی کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ دراصل غیر متمدن" نیم وحشی یا وحشی افراد کو عمومیت کے مقابلے میں تخصیص سے زیادہ دلچسپی ہوتی ہے اور وہ مجرّد کی جگہ ٹھوس کے تذکرہ میں سہولت محسوس کرتے ہیں۔ اس حقیقت پر ان ماہرین نے بطور خاص زور دیا ہے جنہوں نے ایسے معاشرہ کا وہاں رہ کر مشاہدہ اور مطالعہ کیا اس ضمن میں فرانز بوس نے اس خیال کا اظہار کیا ہے کہ غیر متمدن افراد" مجرد تصورات پر بحث کرنے کے عادی نہیں۔ غیر متمدن زبان میں وجود سے منقطع خصوصیت عامل کے بغیر عمل اور شے کے بغیر کیفیت کا بیان شاذ ہی ملتا ہے"۔

بعض ماہرین نے یہ بھی بیان کیا ہے کہ بعض غیر متمدن زبانوں میں گنتی کا کوئی تصور نہیں ملتا۔ یعنی وہ اشیار کو گروپ یا سیٹ کی صورت میں دیکھنے کے برعکس انفرادی صورت میں بیان کرتے ہیں۔ ہینز ورنر (HENZ WERNER) نے اپنی کتاب "COMPARATIVE PSYCOLOGY OF MENTAL DEVELOPMENT" میں ساؤتھ سیز کے بعض قبائل کے ضمن میں یہ لکھا کہ اگر انہوں نے چند لوگوں پر مشتمل جماعت کی آمد کی اطلاع دینی ہے تو وہ یہ نہیں گے کہ پانچ لوگ آئے ہیں بلکہ ان کا بیان یوں ہوگا "لمبی ناک والا ایک مرد، ایک بڈھا، ایک بچہ، جلد کی بیماری میں مبتلا ایک مرد اور ایک ٹھگنا باہر انتظار کر رہے ہیں"۔ (ایضاً صفحہ ۵۰)

آج ادبی تخلیقات کے مرصع اسلوب، اہل زبان کے نستعلیق لہجے اور غیر متمدن زبان میں بُعد المشرقین نظر آتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ شاید آج کسی غیر متمدن زبان کا اس کی اصل اور خالص صورت میں مطالعہ بھی ممکن نہ ہوگا، لیکن نفسیاتی لحاظ سے ان کی اہمیت اس امر میں مضمر ہے کہ یہ بھی اجتماعی لاشعور کا حصہ ہیں بالکل اسی طرح جیسے غاروں اور جنگلوں میں رہنے والے بعید ترین انسانی آبار کے خوف، خوشیاں اور غم نسلی وراثت کے ذریعے سے علامات کے روپ میں ہم تک پہنچے ہیں۔ اسی طرح غیر متمدن نیم وحشی یا وحشی زبان بھی کہیں نہ کہیں ہمارے اجتماعی لاشعور میں موجود رہتی ہے۔ یقین نہ آئے تو غیض و غضب، شدید خوشی یا شدید ہیجانی

کیفیت میں ذرا اپنی زبان کی طرف توجہ دیجیے۔

ہوا کی تحریر

زبان کیا ہے؟ الفاظ کا مجموعہ! الفاظ کیا ہیں؟ انسانی حلق سے نکلنے والی مختلف آوازوں کا مخصوص املا کے سانچے میں ڈھل جانا! تلفظ الفاظ کی صوتی انفرادیت کا تعین کرتا ہے۔ ابجد سے اس کی پیکر تراشی ہوتی ہے اور یوں ایک لفظ دیگر الفاظ کی صف میں مقام پاتا ہے تلفظ اور املا کا بنیادی مقصد مختلف اصوات سے تشکیل پانے والے متنوع الفاظ کو بلحاظ مزاج ایک دوسرے سے ممیز کر کے اُن کی انفرادیت اور شناخت کو برقرار رکھنا ہے یوں نہ ہو تو زبان الفاظ کا جنگل بن کر رہ جائے اور فقرہ بھان متی کا کنبہ۔

عربی میں لفظ کا لغوی مطلب بقول سٹین گاس: نکالنا، منہ سے باہر پھینکنا۔ اب اس کے ساتھ اگر لف جمع کرنا، جوڑنا، تہ کرنا۔ ملفوف کرنا، دو چیزوں کو جمع کرنا، ایک جان کرنا، مجموعہ، مختلف لوگوں کا مجموعہ۔ ان سب مفاہیم کو ذہن میں رکھیں تو پھر لفظ کا مفہوم اجاگر ہو جاتا ہے۔

لفظ حروف سے تشکیل پاتا ہے۔ یعنی حروف الفاظ کے اساسی سانچے ہیں۔ اگرچہ جدید لسانیات نے اس ضمن میں بہت کچھ لکھا ہے لیکن قدیم حکما بھی ان مباحث سے آشنا تھے۔ اور ان کی نکتہ طرازیاں آج بھی قابل توجہ ہیں: آئین اکبریؒ میں علامہ ابوالفضل نے حرف کے بارے میں جو دلچسپ بحث کی اس سے آج بھی استفادہ کیا جا سکتا ہے، وہ کہتے ہیں:

"حرف ایک خاص کیفیت کا نام ہے جو ہوا کے اختلاف تموج سے پیدا ہوتی ہے۔ دو سخت چیزوں کے باہمی اتصال (ملنا) کو قرع کہتے ہیں اور ان کے شدید اختراک (جدا ہونا) کو قلع کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ میانہ ہوا پانی کی طرح لہریں لیتی ہے اور اس تموج سے ایک کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کو آواز کہتے ہیں۔ بعض حکما تموج کو سبب قریب مان کر تموج ہوا ہی کو صوت کے نام سے یاد کرتے ہیں اور بعض اس کو مسبب

بعید جانتے ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ تموّج سے قرع اور قلع پیدا ہوتے ہیں اور ان دونوں کیفیتوں کے شدید اتصال کا نام آواز ہے۔ صوت کو دیگر کیفیات عارض ہوتی ہیں، یعنی زبری و عبی و تنگی و پیچیدگی۔ آخری کیفیت گرانی گلو کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ مخارج اور اجزائے ہوائی کی تقطیع سے ایک دوسری کیفیت عارض ہوتی ہے جس سے دو زیروبم و دو غنہ اور دو بحومت (پیچیدگی) باہم ایک دوسرے سے جدا ہوتے ہیں، بوعلی سینا کی رائے ہے کہ محض کیفیتِ ثانی کے عارض ہونے کا نام حرف ہے۔ بعض حکما کی رائے ہے کہ دوگانہ کیفیتوں کے ایک دوسرے سے متمائز جدا ہونے کو حرف کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ ابن سینا عارض کو حرف جانتا ہے اور گروہ دیگر کی رائے میں معروض کا نام حرف ہے۔ لیکن حقیقت شناس گروہ کا مذہب ہے کہ عارض و معروض کے مجموعے کو حرف کہتے ہیں اور خاکسار موئف کی رائے میں بھی مشرب، قرین تحقیق ہے" ؎

اس کے بعد ابوالفضل نے مختلف زبانوں کے حروف کی تعداد گنوائی ہے:- "ہندی زبان میں باون حروف بولتے ہیں۔ فارسی میں اٹھارہ اور عربی میں اٹھائیس۔ جن کی صرف اٹھارہ آوازیں ہیں۔ اگر ہمزہ کو الف سے جدا نہ سمجھیں تو حالت ترکیبی میں صرف پندرہ آوازیں رہ جاتی ہیں۔" ؎

حرف صرف آواز کی نمائندگی کرتا ہے۔ اس لیے مختلف زبانوں کے حروف تہجی کی تعداد میں جو کمی بیشی ملتی ہے وہ دراصل اس زبان کو بولنے والے افراد کے آلاتِ صوت کی مناسبت سے ہوتی ہے۔ ابوالفضل نے ہندی کے ۵۲ حروف بتائے ہیں۔ ان حروف کے بارے میں ابو ریحان البیرونی نے "کتاب الہند" میں جو لکھا اس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ بقول اس کے:

"بعض ہندوؤں نے بیان کیا ہے کہ ان کے حروف کم تھے۔ پھر وہ بڑھتے گئے" یہ قرین قیاس بلکہ یقینی ہے۔ اس لیے کہ آسیدس نے حکمت کو ہمیشہ قائم رکھنے کے لیے سولہ نشانات بنائے تھے۔ یہ واقعہ مصر پر بنی اسرائیل کے تسلط کے زمانے کا ہے۔ پھر قیمیش اور عنون اس کو یونانیوں میں لائے پھر انہوں نے

چاروں حروف بڑھا کر بیس بنا دیا۔ جس زمانے میں سقراط کو زہر دیا گیا۔ سموئون (انگلش) نے چار حروف اور بڑھائے اور اہل اثینہ (اتھینز) کے پاس پورے چوبیس حروف ہو گئے۔ مغربی مصنفین کے مطابق یہ اضافہ اردشیر پسر دارا پسر اردشیر پسر کورش کے زمانے میں ہوا تھا۔ [۸]

ہندی کے ضمن میں البیرونی نے یوں لکھا: "ہندی حروف کی تعداد زیادہ ہونے ہونے کا سبب یہ ہے کہ ایک ہی حرف کے لیے مختلف اعراب اور اجوف و مہموز کا فرق تعدادِ حرکت میں تھوڑی زیادتی ہو جانے سے ایک ایک جداگانہ صورت مقرر ہے۔ نیز اس میں ایسے حروف ہیں جو بحیثیت مجموعی کسی ایک زبان میں نہیں ہیں۔ اگرچہ متفرق طور پر زبانوں میں پائے جاتے ہیں ———————— اور وہ ایسے مخارج سے نکلے ہیں کہ ہمارے آلات (یعنی حلق اور زبان وغیرہ) بہت کم ان کو ادا کر سکتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ ان کے عادی نہیں ہیں بلکہ اکثر ہمارے کان ان کے بہتیرے دو حرفوں کے درمیان فرق نہیں کرتے۔" [۹]

زبان کے عضویاتی پہلو کے مطالعے کے لیے آج بھی یہ بحث کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔ بہر حال موجِ ہوا انسانی نطق پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہے۔ اس کا مظاہرہ حرف سے ہوتا ہے۔ اس ضمن میں صوت دو گونہ کردار ادا کرتی ہے۔ ایک طرف وہ حرف کی تشکیل کرتی ہے تو دوسری طرف انسانی حلق سے ادائیگی پر حرف گوشِ سامع تک بھی صوت ہی کے روپ میں پہنچتا ہے۔ گویا دیکھنا تقریر کی لذت۔ درحقیقت لذتِ صوت ہے۔ یوں دیکھیں تو زبان کا سارا کھیل آواز نے رچایا ہے۔ یہی آواز سُر کی صورت اختیار کر کے تخلیق کی ارفع سطح کو چھو لیتی ہے۔

"لفظ کی حکایت":

الفاظ اپنی اساسی صورت میں دو حیثیتوں کے حامل نظر آتے ہیں یا تو وہ عالمِ وجود سے

متعلق اشیاء، موجودات اور افراد کے اسما ہیں یا پھر بصورت دیگر جذبات، احساسات اور ہیجانات کے اظہار کے لیے ہیں۔ بقول ارنسٹ کیسرر:

"بنیادی طور پر زبان خیالات کا اظہار نہیں کرتی بلکہ احساسات و جذبات کا۔
لفظ اپنے ترقی یافتہ روپ میں مجرد کیفیات کے اظہار پر قادر ہوتا ہے لیکن مجرّد کیفیات کا اظہار بھی عام وجود کے ٹھوس حوالوں کے ذریعوں سے ہی ہوتا ہے۔ لہٰذا اساسی طور پر الفاظ کے یہی دو اہم وظائف قرار پاتے ہیں۔ الفاظ البتہ ان گردہوں سے جنم لینے والی متعدد ذیلی اقسام میں منقسم کیے جا سکتے ہیں۔

جب ہم میز، کرسی، قلم، دوات، کاغذ، پنسل وغیرہ کی بات کرتے ہیں تو یہ الفاظ کچھ اشیاء کی نمائندگی کرتے ہیں یہ نمائندگی اس لحاظ سے مکمل ہوتی ہے کہ لفظ میز صرف میز کے لیے ہوگا کرسی، قلم یا دوات کے لیے نہیں یعنی یہ الفاظ جن اشیاء کے نام ہیں ان کی تصدیق ممکن ہے۔ اس لیے ایسے الفاظ کے ذریعے سے ابلاغ مکمل اور قطعی ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی وجہ سے صفحہ ہستی سے متذکرہ چیز کا وجود مٹ بھی جائے تو بھی اس کے لیے مخصوص لفظ صرف اسی کے لیے استعمال ہوگا کسی اور شے کے لیے نہیں یعنی دنیا سے میز معدوم ہو جانے کے نتیجے میں نہ تو (الف) زبان سے لفظ میز ختم ہو جائے گا اور (ب) نہ ہی میز کا لفظ کسی اور چیز (مثلاً کرسی) کے لیے استعمال ہونے لگے گا۔ یہی وجہ ہے کہ اشیاء کے لیے مخصوص الفاظ ان کے ساتھ ہی مرحوم نہیں ہو جاتے بلکہ کسی نہ کسی صورت میں زندہ رہتے ہیں کبھی اُن کے نام کی صورت میں (مثال: اٹلانٹس۔ ڈینوسار، پاپئرس ممّی) کبھی محاورات کے پیرائے میں (مثال: پھوٹی کوڑی نہ ہونا) تو کبھی تلمیحات کے روپ میں (مثال: جامِ جم۔ چاہ بابل، بہشتِ شداد)۔

مجرّدات کی ترجمانی کے لیے وضع کیے گئے الفاظ البتہ خاصی ٹیڑھی کھیر ثابت ہوتے ہیں بلکہ سب کچھ کہہ کر اور تمام الفاظ استعمال کر کے بھی بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے:

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

جب ہم نے میز کہا تو ہمارے ذہن میں ایک خاص طرح کی چیز تھی۔ جسے سامع نے بھی بعینہٖ سمجھ لیا۔ اس لیے کہ وہ میز دیکھ چکا ہے۔ یہ تو ہوا میز کا عمومی مفہوم، لیکن جب گول میز، مستطیل میز، کھانے کی میز، مطالعے کی میز، دفتری میز، سنگھار میز یا اسی نوع کے دیگر الفاظ استعمال کیے گئے تو گویا ہم نے میز کی مختلف انواع میں سے کسی خاص نوع کی طرف اشارہ کر دیا اور اس صورت میں بھی ابلاغ مکمل ہوگا کیونکہ جب کھانے کی میز کی بات کی تو اس سے صرف کھانے کی میز مراد تھی۔ سنگھار میز نہیں۔

اس کے برعکس دانت کا درد ذاتی تجربہ ہے جسے میز کی مانند خارجی وجود سے ثابت نہیں کیا جا سکتا۔ لہٰذا اس مجرد کیفیت کے اظہار کے لیے استعمال کئے گئے الفاظ میں اس لحاظ سے قطعیت نہیں ہوتی کہ محض درد کے لفظ سے دانت (یا کسی بھی درد) کی شدت یا اذیت کا اندازہ نہیں کرایا جا سکتا۔ جب میز کہا تو سامع نے میز کا مفہوم پا لیا، مگر درد کی تکلیف کا صحیح اندازہ کرانے کے لیے خواہ کتنے ہی الفاظ کا استعمال کیوں نہ کیا جائے۔ درد کے مفہوم کا قطعی ابلاغ ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مجرد کیفیات ہی کے اظہار کے لیے سب سے زیادہ مترادفات بروئے کار لائے جاتے ہیں لیکن تمام مترادفات کے باوجود جب ابلاغ مکمل نہیں ہو پاتا تو اظہار میں قطعیت اور تکمیلِ ابلاغ کے لیے، مبالغے اور غلو سے کام لیا جاتا ہے۔ جب چلا کر یہ کہتے ہیں:

" ہائے میں درد سے مر رہا ہوں، میری جان نکلی جا رہی ہے۔" تو درحقیقت یہ تکمیلِ ابلاغ کے لیے ہوتا ہے۔ حالانکہ درد سے یوں چیخنے والے اور اس کے سامع دونوں کو معلوم ہے کہ دانت کے درد سے کبھی کوئی نہیں مرتا، لیکن چیخنے والا اس بنا پر مبالغہ کرتا ہے کہ درد کی شدت کو دوسرے محسوس نہیں کر سکتے۔ حتیٰ کہ اپنے دانت کے درد سے موازنہ کے باوجود بھی دوسرے کے درد کی شدت کا درست ادراک ممکن نہیں۔ سامع کو بھی یہ معلوم ہے کہ دانت کے درد سے جان نہیں نکلتی لیکن مبالغہ کا یہ اثر ہوتا ہے کہ دوا دارو کی فکر میں مستعدی دکھائی جاتی ہے۔

جب دانتے کے معمولی سے درد کے درست ابلاغ کے لیے موزوں ترین لفظ نہیں ملتا تو پھر عشق سے لے کر عشقِ حقیقی تک لاتعداد مجرّد کیفیات کی بذریعہ الفاظ ابلاغ کی دشواریوں کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے اور اسی سے شعراء کی اسلوب سے وابستہ مشکلات کا بھی تصوّر کیا جا سکتا ہے اور اس پر مستزاد یہ کہ یہ تصور بذاتِ خود اتنا مُجرّد ہے کہ اس کے اظہار کے لیے بھی مناسب الفاظ نہیں مل سکتے۔

"لفظ کا سفر":

لفظ کس طرح ایک زبان سے چلتا ہے اور وقت کے بہاؤ کے ساتھ تہذیبی عوامل، تمدّنی محرکات اور لسانی تشکیلات کے ذریعے معنی، تلفّظ اور املا کی نئی نئی صورتیں اختیار کرتا جاتا ہے۔ اس کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہے۔ لفظ کی تبدیلی سے وابستہ متنوع لسانی اثرات کی سراغ رسانی، خاصی پرُلطف ہے۔ لفظ عوامی بول چال کا حصہ ہوتے ہیں، مگر بالعموم انہیں استعمال کرنے والے ان کے طویل لسانی سفر کا اندازہ نہیں کر پاتے۔ اس ضمن میں چند مثالیں پیش ہیں جن سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ لفظ کا سفر کہاں سے شروع ہوتا ہے اور کہاں پہ اختتام۔

اباسین کا لفظ صوبہ سرحد میں بہت مقبول ہے، بلکہ پشاور میں اباسین آرٹس کونسل بھی ہے، لیکن بالعموم اس کی اصل صورت کا علم نہیں، جابر علی سید کے بقول اس کی" اصل آب سندھ (ہ) یعنی دریائے سندھ" ہے جبکہ" انجیل کی اصل یونانی "EVANGELIC" یا "EVANGELICAL" ہے۔" انگریزی لفظ" کی اصل حشاشین ہے"
اشارہ اسماعیلی فرقے کے کارکن بھنگ نوشوں کے اس گروہ کی طرف ہے جو سیاسی قاتل تھے... یہ لفظ صلیبی جنگوں کے زمانے میں یورپی زبانوں میں داخل ہوا۔ غالباً سب سے پہلے فرانس میں پھر جرمن اور انگلستان میں۔[۱۱]

اسی طرح ڈاکٹر ریاض الحسن کے بموجب درد کے اس شعر:

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کرّوبیاں

سے معروف ہونے والے لفظ "کرّوبیاں" کی اصل لاطینی ہے اور اصل لفظ CHERUB جس کا تلفظ کیروب ہوا۔ اکثر انگریزی دان لوگ اس کا غلط تلفظ چیریب کرتے ہیں۔ کیروب کے معنی لاطینی میں فرشتہ کے ہیں، لیکن اُردو کے املا میں بجائے زیر کے ک پر زبر اور اوپر تشدید دے دی گئی ہے۔"[11]

"تصویر کا لفظ":

انسانی ذہن تفہیم کے لیے حسیات اور اعصاب پر بہت زیادہ انحصار کرتا ہے اسی لیے اکثریت کے لیے ٹھوس کے مقابلے میں مجرد کا ادراک نسبتاً مشکل ہوتا ہے۔

تمثیلی حکایات "IDEOGRAM" دنیا بھر کی ادبیات میں ملتی ہیں تو ان کا تخلیقی محرک بھی یہی الجھن ہے کہ انسان مجرد کیفیات کی درست تفہیم پر بالعموم قادر نہیں ہوتا۔ چنانچہ تمثیلی حکایات کے ذریعے سے نیکی، بدی، شرافت، حسن، پارسائی، رشک، حسد رقابت اور ایسی ہی دیگر مجرد کیفیات کی اساسی خصوصیات ذہن نشین کرا کے انسانی زندگی میں ان کا مثبت اور منفی کردار اُجاگر کیا جاتا ہے۔ ان حکایات میں نیکی خوبصورت دوشیزہ کے روپ میں دکھائی جائے گی جبکہ بدی کو بدصورت چڑیل بنا دیا جائے گا۔ اُردو میں مُلّا وجہی کی سب رس (۱۶۳۵ء) اس انداز کی خوب صورت مثال ہے اور اب آتے ہیں اپنی اسی میز والی مثال کی طرف یعنی میز دیکھنے کے بعد لفظ میز سن کر با آسانی میز کی شکل ذہن میں لائی جاسکتی یا پھر برعکس صورت میں تصور میں میز کی صورت لا کر لفظ میز سے اس کی پہچان کی جاسکتی ہے۔ لیکن جس شخص نے زندگی میں کبھی میز دیکھی ہی نہیں اُسے میز کا ادراک کرانا آسان کام نہیں ہے۔ اس دقت کو رفع کرنے کے لیے انسانی تہذیب کے

ابتدائی دور میں زبانوں کے لیے ایسے رسم الخط اختیار کیے گئے جو اپنی اساسی صورت میں تصویری تھے یعنی لفظ تصویر میں تبدیل ہوگیا اب میز کو ایسے حروف میں نہ لکھا جائے گا جن کا اپنی اصل صورت میں میز سے کوئی تعلق نہیں (جیسے ہم م ی ز سے لکھتے ہیں) بلکہ لفظ میز میز کی تصویر ہوگا تاکہ ذہن پر کسی طرح کا بھی بوجھ ڈالے بغیر تصویر دیکھ کر سمجھ لیا جائے کہ یہ میز لکھا ہے کچھ اور نہیں۔

اسے اصطلاح میں تصویری خط "PICTORIAL WRITING" کہا جاتا تھا۔ رسم الخط والے باب میں اس ضمن میں طویل بحث ہوگی۔ اس موقع پر صرف زبان کے اسی اہم پہلو کی طرف توجہ مبذول کرانا مقصود تھا کہ جہاں انسان کے لیے اظہار کا بہترین وسیلہ زبان ہے۔۔ وہاں یہ زبان ہی ہے جو بعض اوقات اظہار میں رکاوٹ بھی بنتی ہے اور قدیم دور میں اس وقت کو تصویری خط سے دور کرنے کی کوشش کی گئی۔ اب یہ الگ بات ہے کہ خود اس میں کتنی دقتیں تھیں۔

دنیا کی بعض قدیم ترین زبانوں میں سے مصر کی ہیروغلافی اور قدیم چینی زبان میں تصویری خط سے لفظ کو جو تصویر یا پھر تصویر کو جو لفظ بنا دیا گیا تو اس کا بنیادی سبب بھی یہی تھا کہ انسان کے لیے ٹھوس کے مقابلے میں مجرّد کا تصوّر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ اسی لیے مرد عورت بچہ وغیرہ کے بارے میں مجرّد علامات وضع کرنے کے برعکس ان ہی کی تصویر بنا ڈالی۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ ان پڑھ شخص بھی مرد کی تصویر کی (بطور لفظ) حقیقی مرد سے تطبیق کر سکتا تھا[12]۔ لیکن اس میں دقت یہ تھی کہ مرد کے لیے تو مرد کی تصویر بنا دی گئی لیکن مردانگی کا اظہار کیسے ہو؟ تصویری خط کا یہ پہلو "PICTOGRAPHY" کہلاتا ہے اور رسم الخط والے باب میں اس پر بھی مفصل بحث کی جائے گی۔

جہاں تک تصویری خط کا تعلق ہے تو یہ دنیا کی کئی قدیم تہذیبوں میں مروج رہا ہے تاہم ۳۰۰۰ ق م مصر میں تقریباً سات سو تصاویر پر مشتمل تصویری خط "ہیرو غلافی

("HIROGLAPHY") اپنی دلکشی کی بنا پر آج بھی خوب صورت "MINIATURES"
معلوم ہوتا ہے۔ یہ مندروں، شاہی محلات اور اسی نوع کی دیگر اہم مذہبی یا تاریخی عمارت
پر مصور کیا جاتا تھا۔ آج بھی "ہیروغلافی" کا مطالعہ رسم الخط کے ساتھ ساتھ مصر کی قدیم
مصوری کے طور پر بھی کیا جاتا ہے۔ اسی سے اس خط کے جمالیاتی اوصاف کا اندازہ لگایا
جا سکتا ہے اور اسی لیے آج تک مصری ہیروغلافی کی شہرت ہے۔

ادھر چینی، جاپانی اور مشرق بعید کے بعض اور ممالک کی زبانوں میں بھی یہی بنیادی اصول
کارفرما نظر آتا ہے۔ یعنی دیگر زبانوں کی مانند حروف کے اتصال سے لفظ سازی کے برعکس
تصویر کی مانند ہر لفظ انفرادی وجود کا حامل ہوتا ہے۔

قدیم ترین زبان:

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیا کی قدیم ترین زبان کونسی ہے۔ اس سوال کا آج
قطعی جواب دینا آسان نہ ہوگا اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ قدیم ترین زبانوں کی حامل
تہذیبیں اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکی ہیں جہاں تک لسانیات، آثار قدیمہ اور علم الانسان
کے ماہرین کی تحقیقات کا تعلق ہے تو دنیا کی قدیم ترین زبانوں میں دو نام نمایاں تر نظر
آتے ہیں ان میں سے پہلی "سامی" (یا "آرامی") کہلاتی ہے جبکہ دوسری کا نام "سمیری" یا
"کادی" ہے۔ اول الذکر حضرت نوح کے عہد کی زبان تھی مگر "عہد نامہ عتیق" کے بموجب
بابل میں مینار تعمیر[13] کرنے کی پاداشں میں ان کی زبانوں میں تفرقہ پیدا کر دیا گیا اور وہ
سب جدا ہو کر مختلف علاقوں میں الگ بستیاں بنا کر رہنے لگے تو ان کی زبانیں بھی
ایک دوسرے سے مختلف ہو گئیں اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اُن کے الفاظ اور
تلفظ میں اتنا فرق پیدا ہو گیا کہ اصل سے کوئی تعلق باقی نہ رہا۔

حضرت نوح کے ایک بیٹے کا نام سام تھا جن کے نام پر اُن کی زبان "سامی" کہلوائی۔

سام کے بیٹے آرام، عیلام اور آشور تھے ان سب کے ناموں پر بھی زبانیں بنیں۔ آرام کی نسل حجاز سے لے کر یمن تک کے علاقے میں آباد تھی۔ ان کی زبان "آرامی" کہلاتی تھی۔ یہ ۴ ہزار برس ق۔م کی بات ہے۔ آشور کی اولاد شام (جس کا قدیم نام سوریا تھا) میں آباد تھی۔ ان کی زبان "سُریانی" تھی۔ جبکہ عابر کے نام پر عبری یعنی عبرانی زبان بنی۔ قدیم بابل میں "سمری" اور "عکادی" زبانیں بولی جاتی تھیں یہ زبانیں تاریخی تغیرات کے باوجود ایک دوسرے پر اثر انداز بھی ہوتی رہیں اور تقریباً ۲ ہزار برس ق۔م تک یہ کسی نہ کسی صورت میں بولی جاتی تھیں۔ اب یہ سب ختم ہو چکی ہیں۔ البتہ توریت کی صورت میں سُریانی محفوظ رہ گئی یا پھر ہمارے زمانے میں اسرائیل نے اپنی مردہ زبان عبرانی کو زندہ کر کے دفتر اور تعلیم و تدریس کی زبان بنا دیا۔

حضرت نوح کے بیٹے بیٹوں سے نسل انسانی پھیلی چنانچہ دنیا کے مختلف خطوں میں پھیلی انسانی آبادی کو اب ان ہی کے ناموں سے منسوب کیا جاتا ہے۔ یہ بیٹے سام، حام اور یافث تھے سام کی نسل سے آرین اور بیشتر یورپین اقوام کا تعلق ہے۔ حام کی نسل افریقہ کے سیاہ فام باشندوں پر مشتمل ہے۔ یعنی حبشی اور قدیم ہندوستان کے دراوڑی۔ جبکہ یافث سے منگول اور زرد فام نسلوں کا تعلق ہے۔ یوں دیکھیں تو سفید (سام) سیاہ (حام) اور زرد (یافث) نسلوں سے ہی زبانوں کے بڑے گروہوں نے بھی جنم لیا۔

قدیم ترین یا مردہ زبانوں کا سراغ لگانے میں سب سے بڑی دقت یہ ہے کہ وہ تہذیبیں ہی باقی نہ رہیں جن سے ان زبانوں کا تعلق تھا۔ واضح رہے کہ وہ تہذیبیں اپنے زمانے کے لحاظ سے خاصی ترقی یافتہ ہوں گی۔ اس ضمن میں قدیم عراق کی تہذیب کی مثال دی جا سکتی ہے جہاں خطِ میخی میں لکھی ہوئی جلجامش کی داستان دنیا کی قدیم ترین داستانوں میں ممتاز مقام کی حامل ہے۔ یہ صرف ایک ہی مثال ہے۔ اگر قدیم تہذیبوں اور زبانوں کی شاعری اور نثر کے نمونے آج دستیاب ہو سکتے تو ان کے مطالعے سے ان کی تہذیب و تمدن کے

ساتھ ساتھ ان کی زبان اور اس کے ذخیرۂ الفاظ کے بارے میں بھی کارآمد معلومات حاصل ہو سکتی تھیں۔

ڈاکٹر غلام علی الانہ نے اپنی تالیف " زبان اور ثقافت " میں مختلف ماہرین کی آرار کی روشنی میں انسانی زبان کے آغاز کے بارے میں جو نتائج حاصل کیے ان کے بموجب " ماہرین بشریات نے اپنی تحقیقات کی روشنی میں زبان کی ابتدا کا دور کم از کم اوئل پتھر کے زمانے میں دھکیل دیا ہے ۔ اس دور کے کچھ ثبوت کرومیگنو ("CRO - MAGNO") غار سے برآمد شدہ نقوش سے ملے ہیں ۔ ان نقوش کی مدد سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اس دور کا انسان ضرور کوئی زبان استعمال کرتا تھا ۔ مذکورہ غار کا انسان چالیس ہزار قبل پہلی بار منظرِ عام پر آیا ۔ لیکن علم الانسان کے اکثر ماہرین کو یہ یقین ہے کہ غار والے انسان کے منظرِ عام پر آنے سے پہلے بھی زبان موجود تھی کچھ ماہرین کی رائے ہے کہ سرزمین چین کا انسان "NEAN THERTHAL" زبان سے مانوس تھا ۔ اس انسان کی موجودگی اور آبادی ایک لاکھ سال قبل بتائی جاتی ہے ۔ ماہرین نے یہ بھی ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ سرزمین چین کے انسان "HOMO -ERECTUS" کی آبادی سے پہلے افریقہ کے انسان "PITHECAN THROPUS" کے آباد ہونے کے ثبوت ملے ہیں ۔ اس کے وجود کا زمانہ دس لاکھ قبل بتایا گیا ہے ۔ یہ انسان افریقہ سے جنوب ایشیا کی طرف پھیل گیا اور وہاں سے منطقہ معتدلہ (TEMPERATUE ZONE) میں پہنچا ۔ اس گروہ کا انسان آگ استعمال کرتا تھا ۔ یہ انسان ہاتھی کا شکار کرتا تھا اور گفتگو کر سکتا تھا ۔ افریقہ والے انسان سے پہلے جاوا والے انسان کے ثبوت سامنے آئے ہیں ۔ اس کی آبادی چالیس لاکھ برس قبل بتائی جاتی ہے ۔ جاوا والے انسان سے پہلے قریب العہد حجری زمانہ (PILOCENE) ایک کروڑ بیس لاکھ (بارہ ملین) سال قبل شمال مغربی ہندوستان کے انسان (RAMAPITHECUS) کے وجود کے ثبوت ملے ہیں ۔ جاوا کا انسان بغیر ڈول کے اوزار استعمال کرتا تھا ۔ اس کا سر

بڑا ہوتا تھا۔ اور وہ دو ٹانگوں پر سیدھا چل سکتا تھا۔ علم الانسان کے کچھ ماہرین کی رائے میں جاوا گروہ کا انسان کوئی زبان بولتا تھا اور کچھ ماہرین کے خیال میں اس سے پہلے شمال مغربی ہندوستان والا انسان بھی کوئی زبان بول سکتا تھا۔[۵]

جہاں تک قدیم ترین زبان کا تعلق ہے تو بعض محققین نے چینی زبان کو قدیم ترین بتایا ہے۔ مثلاً محمد حمید اللہ نے اپنے مقالے "زبان اور اللہ کا کلام" میں بلحاظِ قدامت چینی زبان کو فوقیت دیتے ہوئے لکھا "چینی زبان میں کوئی صرف و نحو نہیں ہوتی، بلکہ مفردات کا ایک مجموعہ ہوتا ہے۔ وہاں حروف تہجی بھی نہیں جتنے مفہوم ہیں (اور جو کہتے ہیں کہ چینیوں کے مطابق آٹھ لاکھ ہیں) تو ہر ایک کو لکھنے کے لیے ایک الگ شکل ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جملہ میں۔ پہلی شکل انسان کی، دوسری شکل افق پر طلوع ہونے والے سورج کی، تیسری شکل دوڑنے کی، چوتھی شکل درختوں کے مجموعے یا جنگل کی، پانچویں شکل نظر سے غائب ہونے کی۔ جب آپ یہ پانچوں شکلیں یکجا دیکھیں تو یہ سمجھ لیں گے کہ ایک شخص صبح کے وقت بھاگتا ہوا جا کر جنگل میں چھپ گیا۔"[۶]

"زبان: آسمانی تحفہ"

اورینٹل کالج میگزین کے خاص نمبر میں ہیر گری زون کا ایک مقالہ "چینی زبان کا مآخذ اور اس کے رموز" (ترجمہ: محمد حسین عسکری) بھی شائع ہوا ہے جو چینی زبان اور اس کے رسم الخط کے بارے میں دلچسپ معلومات کا حامل ہے اس مقالہ میں چینی زبان کے آغاز کے بارے میں جو اساطیری روایت بیان کی گئی وہ بہت دلچسپ ہے۔ بقول مقالہ نگار "چینی زبان کے آغاز اور مآخذ کے سلسلے میں مختلف روایتیں ملتی ہیں لیکن سب روایتوں میں یہ بات مشترک ہے کہ زبان کو وحی یا الہام کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں آسمان کا بادشاہ لی این ہوانگ (LI EN - HOUANG) نے چینی زبان سے انسانوں کو متعارف کرایا۔

ہے۔ بیشتر روایتوں کے مطابق اس کا پیغام زمین پر ایک کچھوا لایا تھا۔ اس جانور کو طویل عمر کی وجہ سے دانش مند سمجھا جاتا ہے اور کہتے ہیں کہ اس کے خول پر حروف لکھے ہوتے ہیں کیونکہ خول پر آسمانی زبان منقش ہوتی ہے اس لیے غیب کا حال معلوم کرنے کے لیے اسے کام میں لایا جاتا ہے۔ روایت کے مطابق یہ آسمانی پیغام "فو ہی" (FOU - HI) کے پاس پہنچا تھا مگر یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ واقعہ اس سے بھی پہلے کا ہے اور فو ہی سے تو صرف زبان کی ابتدائی تبدیلیوں کا آغاز ہوا ہے۔ چینی تہذیب کی عہد بہ عہد نشو و نما میں قدیم تحریری شکلوں (KOU - EWN) کا تعین ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ کہتے ہیں یہ کام ہوانگ تی (HOUANG - TI) نے کیا۔ یہ شخص عبادت کی رسوم فائدہ مند فنون اور خصوصاً علم کیمیا کا بھی موجد ہے۔ ان دو قسم کے کاموں میں جو تعلق دکھایا گیا ہے وہ بے معنی نہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ چڑیوں کے پنجوں سے زمین پر جو نشان بن جاتے ہیں ان کے مطابق تحریری شکلوں کا تعین ہوا۔ چڑیاں آسمان کی پیغامبر ہیں اور وہ آسمانی زبان بولتی ہیں چنانچہ کچھوے کی طرح چڑیوں کا بھی تعلق دو چیزوں سے ہے ایک تو روحانی معنویت سے دوسرے علم غیب کے حصول سے۔"

ویسے یہ عجب بات ہے کہ چینی کی مانند دنیا کی بیشتر زبانوں کا آغاز بھی اساطیری دور کے اسرار کے پردوں میں لپٹا نظر آتا ہے یوں کہ لفظ مافوق الفطرت صورت اختیار کر جاتا ہے۔ جس کی متعدد وجوہات میں سے بنیادی یہ ہے کہ اس عہد میں ہر اچھی چیز آسمانی تحفہ ہوتی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ اساطیری عہد میں مختلف فنون کے سرپرست دیوتا اور دیویاں ہوتی تھیں۔ اس ضمن میں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ قدیم دور میں خواندگی عام نہ تھی لہذا خواندہ افراد قلیل تعداد میں ہوتے تھے اور جو ہوتے بھی تھے ان میں سے بھی اکثریت کا تعلق معبدوں اور مندروں سے ہوتا تھا۔ پجاری ہی مذہبی کتابوں کے مطالعے اور ان کی تفہیم اور تشریح پر قادر تھے۔ (اور اسی میں ان کی سیاسی قوت کا راز مضمر

تھا) ان کے ساتھ ساتھ ساحر، منجم اور شاعر بھی تھے جو الفاظ کو عام لوگوں کے برعکس کسی اور ہی انداز میں استعمال کرتے تھے۔ وہ لوگ ساحر کے پراسرار منتروں سے خوفزدہ رہتے۔ منجم ناقابلِ فہم الفاظ میں ماضی اور مستقبل پر سے پردے اٹھاتا تھا جبکہ اشعار کی صورت میں شاعر الفاظ کی ایسی مالا پروتا کہ سامعین وجد میں آجاتے۔ یہ سب الفاظ کا جادو تھا اور اسی لیے زبان کی اساطیری مذہبی اور روحانی توجیہات کی جاتی رہی ہیں، چنانچہ قدیم مصری، بابلی سمیری اور یونانی تہذیبوں کے علاوہ پارسیوں اور ہندوؤں کے ساتھ ساتھ مسلمانوں میں بھی زبان کے آغاز کی مذہبی توجیہات ہوتی رہی ہیں۔

البیرونی نے "کتاب الہند" میں ہندوؤں کی ایک روایت نقل کی ہے جس سے زبان کے اساطیری آغاز پر روشنی پڑتی ہے: "کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کا رسم خط مٹ گیا تھا۔ کوئی اس کی طرف توجہ نہیں کرتا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ ان پڑھ ہو گئے اور اسی سبب سے اُن کی جہالت اور علم سے ان کی دوری بڑھتی گئی آخر پراشر کے بیٹے بیاس نے الہام الٰہی سے اُن کے پچاس حرفوں کو از سرِ نو ایجاد کیا۔ حرف کا نام اکشر ہے"[15] اسی طرح ابوالفضل نے "آئینِ اکبری" میں ساہتی پر بحث کرتے ہوئے یہ لکھا: "یہ ایک علم ہے جس میں معلومات بہت زیادہ حاصل ہوتی ہیں۔ الفاظ کے معانی و مراتب عبارت کی شائستگی اور اس کے ممنوعات اس علم میں بیان کیے جاتے ہیں اس علم کا بانی اللہ کو سمجھتے ہیں"۔[16]

اس کے ساتھ عین الحق فرید کوٹی کا یہ بیان بھی قابلِ غور ہے: "جب ہم دنیا کی قدیم ترین کتاب رگ وید میں واک (بمعنی لفظ) کے عنوان سے دیئے گئے ایک نغمۂ حمد کا مطالعہ کرتے ہیں تو اسے موجودہ لسانیات کے نظریوں سے کافی حد تک منطبق پاکر حیران رہ جاتے ہیں۔ اس نغمے میں مرقوم ہے:

"جب ازمنہ قدیم میں روشن ضمیر مہارشی برہسپتی نے منہ سے پہلے پہل

نکلنے والی آوازوں کو الفاظ کی شکل دی تو وہ پاکیزہ جذبات جنہیں انسان عرصے سے اپنے دل کی گہرائیوں میں چھپائے ہوئے تھے سب یہ ظاہر ہو گئے ۔ دانشوروں نے سوچ سمجھ سے کام لے کر الفاظ کو سنوارا اور جس طرح سے غلّے کو چھلنی میں ڈال کر چھانا جاتا ہے ۔ انہیں چھانٹ کر (فضولیات سے) علیحدہ کیا ۔ انہوں نے الفاظ کی تلاش میں بڑی جانفشانی سے کام لیا اور انہیں دور دراز بسنے والے رشیوں منیوں سے حاصل کر کے اکٹھا کیا پھر انہیں اکناف عالم میں ہر طرف بکھیر دیا اور سات مغنیوں نے مل کر انہیں گیتوں میں گایا ۔

اور اسی کا نتیجہ ہے کہ :

ایک آدمی تو بیٹھا ہوا شعروں کے حسین پھول بکھیر رہا ہے دوسرا ہے کہ میٹھی دھنوں میں ایک نغمہ الاپ رہا ہے ۔ تیسرا بطور ایک برہمن کے اس عالم موجودات کے قانون بیان کر رہا ہے اور چوتھا مقدس قربانی کے حصّوں کے لیے پیمانے مقرر کر رہا ہے ۔[19]

آدم کی زبان :

سوال یہ ہے کہ حضرت آدم حضرت حوّا کے ساتھ کس زبان میں گفتگو کرتے تھے ۔ اس سوال کی انسانی نقطہ نظر کے ساتھ لسانی اہمیت بھی ہے ۔ گہری نیند سے بیداری کے بعد پہلی مرتبہ حوّا کو دیکھ کر جو محسوس کیا ہو گا ۔ اس کا کس زبان ، لہجہ اور اسلوب میں اظہار ہوا ہو گا ؟

عہد نامہ عتیق میں قصّہ آدم یوں بیان ہوا ہے :

" اور خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی کہ وہ سو گیا ۔ اور اس

نے اس کی پسلیوں میں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند خدا اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک عورت بنا کے آدم کے پاس لایا اور آدم نے کہا کہ اب یہ میری ہڈیوں میں سے ہڈی اور میرے گوشت میں سے گوشت ہے اور اس سبب سے وہ ناری کہلائے گی کیونکہ وہ نر سے نکالی گئی اس واسطے مرد اپنے ماں باپ کو چھوڑے گا اور اپنی جورو سے ملا رہے گا اور وہ ایک تن ہوں گے ؛ (باب : ۲)

اسی طرح جب سانپ کے بہکاوے میں آکر حوا نے آدم کو شجرِ ممنوعہ چکھنے کی ترغیب دی تو اس وقت حوا کا لہجہ کیا تھا۔ وہ لہجہ تو بھی رہا ہوگا اس کی لسانی کے برعکس نسوانی نفسیات کے لحاظ سے زیادہ اہمیت ہے اور پھر جب چوری پکڑی گئی تو اس وقت آدم اور حوا نے کس زبان میں ردِ عمل کا اظہار کیا ہوگا۔ جب بہشت سے نکالے گئے تو کس اسلوب میں اظہارِ پشیمانی کیا اور طالبِ عفو ہوئے ہوں گے۔ جب بالآخر زمین پر ملے ہوں گے تو دونوں نے ایک دوسرے کو کن الفاظ سے بلایا ہوگا اور پھر ہابیل کی پیدائش پر دنیا کے ان پہلے والدین نے کن الفاظ میں اظہارِ مسرت کیا ہوگا۔ ان سب کو محض سوالات نہ سمجھنا چاہیئے، کیونکہ ان کے جوابات میں انسان کے جذباتی رویّوں اور زبان کے اٹل رشتوں کی تفہیم کے انداز ملتے ہیں۔ بہرحال آدم نے جو زبان بھی بولی ہوگی ہمیں اس کا علم نہیں لیکن آج عالمی زبان کو آدم سے منسوب کرتے ہوئے "LINGUA - ADAMICA" کہا جاتا ہے۔

آدم اور حوا کے لغوی معنی پر غور کرنے سے بھی کچھ بصیرت حاصل ہوتی ہے۔ فرہنگ آصفیہ میں آدم کا لغوی مطلب گندم گوں اور رہنما ہے۔ سُریانی زبان میں آدم کا لفظی مطلب مایوس شخص ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ مایوسی فردوسِ گم گشتہ کی تھی۔

جہاں تک حوا کا ذکر ہے تو عہد نامہ عتیق کے باب پیدائش سے یہ معلوم ہوتا ہے :
" اور آدم نے اپنی جورو کا نام حوا رکھا۔ حوا کا لغوی مطلب اس لیے کہ وہ سب زندوں کی ماں ہے " حوا کا لغوی مطلب جز ہے ۔ سٹین گاس کی فرہنگ میں حوا کو احویٰ (عربی) کی مؤنث بتایا گیا ہے جس کا مطلب سیاہ، سانولے ہونٹ "سبزی مائل سیاہ ہے۔ اور حوا کا مطلب سیاہ اور سانولے ہونٹ والی (BLACK OR DARK LIPPED) ہے۔ جب آدم کے لغوی مطلب یعنی سانولے رنگ والے کو ملحوظ رکھیں تو پھر سیاہ لب حوا کی معنویت بھی سمجھ میں آجاتی ہے ۔

جان شیکسپیئر کی لغت میں حوا کا ماخذ عبرانی "حَیَ" (TO LIVE) ہے۔ جو کہ باب پیدائش کے عین مطابق ہے جس کے بموجب " وہ تمام زندوں کی ماں تھی "۔

رچرڈسن کی لغت میں حوا (عربی) کا ایک مطلب (THE CONSTELLATION SERPENTANUS") بھی ہے۔ اس میں احویٰ کی مؤنث حوا (عبرانی) کے سلسلے میں یہ نئے معنی بھی ملتے ہیں :
"A BLUE CLOUR - NAME OF A PLANT RESEMBLING THE WOLF IN COLOUR - A CHARMER OF SERPENTS"

ان معانی میں سانپ سے تعلق قابلِ غور ہے ۔

عبرانی زبان میں حوا زندگی کے معنی میں ہے حیَ اور حیات اسی سے بنے ہیں ۔ عبرانی میں آدم کا لغوی معنی مٹی ہے اور اس کی " تخلیق کے لیے جو لفظ استعمال ہوا ہے وہ کمہار کے چاک پر برتن بنانے کے ہم معنی ہے یعنی جس طرح کمہار چاک پر گیلی مٹی کے برتن بناتا ہے۔ اسی طرح یہوا نے آدم کو بنایا۔ قدیم مصریوں کا عقیدہ بھی یہی تھا کہ خنوم ("KANUM") دیوتا نے انسان کو کمہار کے چاک پر بنایا۔ چنانچہ لکسر کے مقام پر ایسے دیواری نقش ہیں جن میں خنوم دیوتا کمہار کے چاک پر انسان کا پتلا بنا رہا ہے۔ کیا عجب ہے کہ مصر سے نکلتے وقت یہودی یہ عقیدہ اپنے ساتھ لائے ہوں "۔[12]

قدیم چینی اساطیر میں بھی کمہار کے چاک پر" انسان سازی" کا تصور ملتا ہے ۔ یہ یہاں کو ہے جو گیلی مٹی سے چاک پر مرد و زن بنا رہا تھا کہ اچانک گھٹا اٹھی تو وہ دھوپ میں سوکھنے کو رکھے ہوئے مرد و زن کے پتلوں کو اٹھا کر گھر کے اندر لے گیا۔ اس عمل میں کچھ پتلے ٹوٹ پھوٹ گئے ۔ بدصورت، اور اپاہج افراد اسی باعث ہیں انسان کی ساخت کے ضمن میں چینیوں کے ہاں ایک اور اسطور ملتی ہے جو اس بنا پر قابلِ توجہ ہے کہ اس میں تخلیق کا فریضہ انسان کے چہرہ اور سانپ کے جسم والی نوکوا نام کی دیوی ادا کرتی ہے ۔ اپنی تنہائی سے تنگ آکر وہ کیچڑ سے اپنے لیے ایک جیون ساتھی بناتی ہے اس کے بعد اسے انسان سازی کا ایسا چسکا پڑ جاتا ہے کہ کیچڑ سے دنیا بھر میں پھیلی خلقت تخلیق کر لیتی ہے ۔ بعد ازاں کام کو جلدی نپٹنے کی خاطر وہ کیچڑ میں انگور کی بیل ڈبو کر جھٹکتی ہے یوں محدود مدت میں لاتعداد انسان بنا ڈالے ۔ ہاتھ سے بنائے گئے انسان تو اعلیٰ اور ارفع شخصیات بنے، جبکہ یوں بیل کے جھٹکے سے چشم زدن میں بنائے گئے کثیر تعداد والے عوام تھے "(بحوالہ: چینی کلچر کے روحانی عناصر" از ڈاکٹر داؤد رہبر "نیا دور" ،شمارہ ۸۴ - ۸۸)

سبط حسن کے خیال میں" انجیل کی داستان میں بہشت کا جو نقشہ ہے ۔ اس کے ماخذ کے بارے میں تو شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے کیونکہ اس میں عراق کے دریاؤں کا ذکر ہے ۔ خود لفظ عدن عکادی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی چراگاہ کے ہوتے ہیں اسی طرح شجرِ حیات، شجر ممنوعہ بھی بابل ہی کے قدیم داستانوں کے پودے ہیں [۲۱]

جہاں تک حوا کی اساطیری اہمیت کا تعلق ہے تو سبطِ حسن کی تحقیقات کے مطابق " ننہورسگ کی سمیری داستان سے حوا کے پسلی سے پیدا ہونے کا سراغ ملتا ہے ۔ ایک دیوی " ننتی ("NIN - TI") جس کا لغوی مطلب" پسلی کی خاتون" ہے لیکن سمیری زبان میں" تی" حیات کو بھی کہتے ہیں۔ لہذا " ننتی" کا مفہوم حیات کی خاتون بھی ہو سکتا

ہے۔ یہی نن تی یہودی عقیدے میں داخل ہو کر حوا بن گئی اور اس کو آدم کی پسلی سے خلق کیا گیا۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہودیوں نے حوا کا تصور سمیری اور عکادی روایتوں سے لیا ہے۔[11]

قصۂ آدم کے مذہبی اور اساطیری پہلوؤں سے قطع نظر قرآن مجید اور عہد نامہ عتیق میں حضرت آدم کی پیدائش کی ضمن میں جو کچھ بیان کیا گیا اُسے زبان کے آغاز کی آسمانی توجیح بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

خدا نے حضرت آدم کو تمام اشیاء کے نام سکھائے۔ اس کے بعد فرشتوں پر اس ارادے کا اظہار کیا کہ میں آدم کو دنیا میں اپنا خلیفہ بنانا چاہتا ہوں۔ تمام فرشتے معترض ہوئے کہ یہ دنیا میں فساد پیدا کرے گا۔ اس پر خدا نے فرشتوں سے کہا کہ تم مجھے ان اشیاء کے نام بتا دو۔ مگر فرشتے لاعلم تھے لہذا نام بتانے سے قاصر رہے۔ جب خدا نے آدم سے پوچھا تو اس نے تمام اشیائ کے اسماء بتا دیئے۔ اس پر تمام فرشتے سجدہ ریز ہو گئے۔ جب اس کے ساتھ سورۃ روم کی یہ آیات بھی ملا کر پڑھیں تو بات کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے:

"زبانوں اور رنگوں کے فرق میں بھی بے شک اہل دانش کے لیے نشانیاں ہیں۔"

عہد نامہ عتیق (کتاب پیدائش۔ باب ۲) کے بموجب "خداوند خدا نے میدان کے ہر ایک جانور اور آسمان کے پرندوں کو زمین سے بنا کر آدم کے پاس پہنچایا تاکہ دیکھے کہ وہ ان کے کیا نام رکھے۔ جو آدم نے ہر ایک جانور کو کہا وہی اس کا نام ٹھہرا اور آدم نے سب مویشیوں اور آسمان کے پرندوں اور ہر ایک جنگلی جانور کا نام رکھا۔"

یوں دیکھیں تو حضرت آدم ابوالبشر ہونے کے ساتھ ساتھ ابوالاسان بھی قرار پاتے ہیں۔

اب پھر ہم اسی مسئلے کی طرف آتے ہیں جس کا سطور بالا میں ذکر کیا گیا یعنی زبانِ آدم کیا ہو سکتی ہے۔ اس ضمن میں صاحب فرہنگ آصفیہ نے مختلف حوالوں سے لغت کے مقدمہ میں (ص: ۵۵) جو بحث کی ہے وہ خاصی دلچسپ ہے۔ انہوں نے سیفی کی "کتابِ عروض" کے حوالے سے حضرت آدم کی زبان سریانی بتائی ہے (سریانی میں آدم کا لغوی معنی ہے: مایوس) جبکہ حضرت مولانا شاہ عبدالعزیز کے بموجب وہ بہشت میں عربی زبان بولتے تھے وہاں سے نکالے گئے تو بطور سزا "حضرت جبرائیل و میکائیل نے ان کے سر سے تاج اتار کر کمر سے پیٹی کھول لی۔ اور عربی زبان سلب کر کے اس کی جگہ سریانی بولی۔ ان کی زبان پر چڑھا دی لیکن جب توبہ قبول ہو گئی تو پھر عربی زبان میں کلام کرنے کی اجازت مل گئی" جبکہ "مصنف تاریخ خمیس نے معالم التنزیل سے نقل کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو تمام زبانوں کے لغت سکھائے اور انہوں نے اپنی اولاد میں سے ہر ایک شخص سے ایک ایک زبان میں گفتگو کی۔"

نیاز فتح پوری کے مقالہ "ذہن انسانی کی اسیری" (مطبوعہ: روشن خیال، کراچی بابت جنوری ۱۹۹۳ء) میں اس ضمن میں مزید شواہد ملتے ہیں۔ ان کے بقول "اول اول عام طور پر یہ یقین کیا جاتا تھا کہ عبرانی زبان ہی اصل زبان ہے اور تمام زبانیں اسی سے نکلتی ہیں۔ (عربی کو ام السنہ اسی لیے کہتے ہیں) بعد کو یہی دعویٰ اور زبانوں نے بھی کیا۔ اینڈریے کمیپ نے ۱۵۶۲ء میں ایک کتاب شائع کی جس کا مقصود یہ بتانا تھا کہ بہشت کی زبان کیا ہے، چنانچہ اس نے لکھا ہے کہ خدا نے آدم سے سویڈن کی زبان میں باتیں کیں، آدم نے ڈنمارک کی زبان میں باتیں کیں اور سانپ نے حوا سے فرانسیسی میں باتیں کیں۔ ایرو نے اپنی کتاب میں جو میڈرڈ میں شائع ہوئی تھی ظاہر کیا ہے کہ جنت عدن میں بسکانی زبان (شمالی ہسپانیہ کی) بولی جاتی تھی، ۱۵۷۰ء میں گرو بیس نے ایک کتاب لکھی کہ یہ سب غلط ہے، بہشت میں تو ڈچ زبان بولی جاتی تھی۔" ان دعوؤں سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہر قوم اپنی ہی زبان کے سر پر فضیلت کا تاج رکھ رہی ہے!

حضرت نوح کی اولاد کے آتے آتے زبانوں کی تعداد میں بہت اضافہ ہو گیا تھا چنانچہ روضۃ الصفا میں سام بن نوح علیہ السلام کے حال میں مرقوم ہے کہ "ان کی اولاد میں اٹھارہ زبانیں پیدا ہو گئی تھیں ..... سام کی اولادوں میں اس قدر زبانوں کا اختلاف واقع ہوا کہ اکٹھی انیس زبانوں میں بول چال ہونے لگی۔ ایک دوسرے کی زبان سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا تھا۔ جب یہ حال ہوا تو ہر ایک فرقہ علیحدہ علیحدہ نواح میں جا بسا " ادھر نمرود کے عہد میں " لوگوں کی بہتّر زبانیں بن گئی تھیں چونکہ اس سرزمین میں زبانوں کا اختلاف بہم پہنچا تھا اس لیے اس اقلیم کو بابل کہنے لگے " بعض کتابوں سے معلوم ہوتا کہ نمرود کے عہد میں عربی بولی جاتی تھی۔ ویسے جس شخص نے سب سے پہلے عربی بولی اس کا نام یعرب ابن قحطان تھا۔ (مقدمہ: ص: ۵۵)

جہاں تک حضرت نوح کے عہد میں زیادہ زبانوں کے پیدا ہو جانے کا تعلق ہے تو عہد نامہ عتیق میں بھی اس پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ کتاب پیدائش باب دس میں پسران نوح کے بیان میں ان کی زبانوں کا بطور خاص تذکرہ ہے۔ جیسے" ان سے قوموں کے جزیرے ان کے ملکوں میں ہر ایک کی زبان اور ان کے گروہوں میں ہر ایک کے خاندان کے موافق منقسم ہو گئے .... پس حام کے بیٹے اپنے خاندانوں اور اپنی زبانوں کے موافق اپنے ملکوں اور اپنے گروہوں میں ہیں.... پس سم کے بیٹے اپنے خاندانوں اور اپنی زبانوں کے موافق اپنے ملکوں اور اپنے گروہوں میں ہیں۔"

کتاب پیدائش باب گیارہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس سے ہمیں لسانی اختلاف کے آغاز کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ باب گیارہ کا آغاز یوں ہوتا ہے:

" اور تمام زمین پر ایک ہی زبان اور ایک ہی بولی تھی اور جب وہ پورب سے روانہ ہوئے تو ایسا ہوا کہ انہوں نے سنعار کے ملک میں ایک میدان پایا اور وہاں رہنے لگے اور آپس میں کہا۔ آؤ ہم اینٹ بنائیں

اور آگ میں پکائیں۔ سو ان کو پتھر کی جگہ اینٹ اور گچ کی جگہ گارا تھا۔ انہوں نے کہا کہ آؤ ہم اپنے واسطے ایک شہر بنائیں اور ایک بُرج جس کی چوٹی آسمان تک پہنچے اور یہاں اپنا نام کریں ایسا نہ ہو کہ تمام روئے زمین پر پریشان ہو جاویں اور خداوند اسی شہر اور برج کو جسے بنی آدم بناتے تھے دیکھنے اترا اور خداوند نے کہا دیکھو لوگ ایک ہیں اور ان سب کی ایک ہی بولی ہے۔ اب وہ یہ کرنے لگے۔ سو وہ جس کا ارادہ رکھیں گے اس سے نہ رُک سکیں گے۔ آؤ ہم اتریں اور ان کی بولی میں اختلاف ڈالیں تاکہ وہ ایک دوسرے کی بات نہ سمجھیں۔ تب خدا نے ان کو وہاں سے روئے زمین پر پراگندہ کیا۔ سو وہ اس شہر کے بنانے سے باز رہے۔ اس لیے اس کا نام بابل ہوا کیونکہ خداوند نے وہاں ساری زبانوں میں اختلاف ڈالا اور وہاں سے خداوند نے اُن کو تمام روئے زمین پر پراگندہ کیا۔"

پسرانِ نوح میں زبانوں کا اختلاف غالباً اس امر کی طرف اشارہ کرتا ہے کہ قدیم عہد میں بابل کی تہذیب بڑی اہم اور شاندار تھی اور اسے ایک تمدنی مرکز کی حیثیت حاصل تھی۔ لہذا مختلف قوموں کی آبادکاری ممالک غیر سے آنے والے افراد اور طرح طرح کی زبانیں بولنے والے تاجروں اور سپاہیوں کی بدولت وہاں ایک سے زائد زبانوں کے بولے جانے اور مختلف زبانوں کی باہمی اثر پذیری کا امکان ہو سکتا ہے اور اسی کی طرف عہد نامہ عتیق نے تمثیلی انداز میں اشارہ کیا ہے۔

"عالمی زبان"

ارنسٹ کیسرر نے زبانوں پر بحث کرتے ہوئے "AN ESSAY ON MAN" میں اس خیال کا اظہار کیا کہ ولیھلم واں ہمبلٹ (WILHELM VON HUMBOLBT) نے

سب سے پہلے عالمی سطح پر زبانوں کے اساسی خصائص کا تعین کرتے ہوئے ان کی درجہ بندی کی۔ اس نے صرف ہند یورپی زبانوں ہی کا مطالعہ نہ کیا بلکہ امریکہ کے مختلف قبائل کی زبانوں کے ساتھ ساتھ انڈونیشیا اور ملایا کی زبانوں تک کا تجزیاتی مطالعہ کیا۔ آسٹریلوی زبانوں کی پہلی جامع قواعد بھی اسی نے مدون کی تھی۔ ارنسٹ کیسرا اس کے تصورِ زبان کی تشریح میں لکھتا ہے:

"ہم جب تک زبان کو محض الفاظ کا مجموعہ سمجھتے رہیں گے اس وقت تک انسانی زبان کے وظائف اور اعمال کے بارے میں حقیقی بصیرت حاصل نہیں کر سکتے۔ مختلف زبانوں میں اساسی امتیاز اصوات یا اشارات کا نہیں بلکہ عالمی تناظرات کا ہے۔ زبان محض الفاظ کی جمع بندی نہیں لہذا زبان کو الفاظ اصطلاحات کی صورت میں جدا گانہ کر دینا درحقیقت اس کی عدم تنظیم اور انتشار کے مترادف ہے۔ اگر ایسا طرزِ فکر کسی بھی زبان کے وقوعہ کے مطالعے کو تباہ نہیں کرتا تو کم از کم باعث رکاوٹ تو ضرور ہی بنتا ہے۔ ہمارے عمومی تصورات کے مطابق جو الفاظ اور قواعد زبان کی تشکیل کرتے ہیں۔ وہ صرف مربوط تکلم کی حد تک ہوتے ہیں۔"[۲۴]

موجودہ دور کے ماہرین نے بعض اساسی خصوصیات کی بنا پر عالمی سطح پہ زبانوں کی جو درجہ بندی کی ہے۔ اس کے بنیادی اصول دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ زبان کی بنیاد بننے والے اصولوں اور الفاظ کی تشکیل کرنے والے قواعد کو بنیاد بنا کر پہلے ایک زبان کی خصوصیات متعین کر دی گئیں اور پھر ان خصوصیات کی روشنی میں دوسری زبان کی ایسی ہی خصوصیات سے تقابل کے بعد مشترک اور امتیازی خصوصیات کا تعین کر لیا گیا۔ جب کہ درجہ بندی کی دوسری قسم میں تاریخی تہذیبی اور نسلی محرکات کو مدِنظر رکھا جاتا ہے۔ اس ضمن میں تہذیبوں کی باہمی اثر اندازی اور کسی بڑے لسانی گروہ سے متعلق افراد کی وسیع پیمانے پر کسی دوسرے خطے

میں ہجرت جیسے عوامل بھی ملحوظ رکھے جاتے ہیں۔

زبانوں کے عالمی مطالعے کے ضمن میں یہ دونوں اندازِ نظر اگرچہ درست ہیں، لیکن عالمی لسانی درجہ بندی میں انہیں ہوا بند ڈبوں کی طرح استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے بعض اوقات ماہرین کسی زبان کے تجزیاتی مطالعے میں ان تمام خصوصیات کو مدِ نظر رکھتے ہیں۔

زبانوں کا مطالعہ کسی خاص خطے میں آباد کسی قوم یا نسل کے حوالے سے کیا جاتا ہے اور یہ غلط بھی نہیں۔ پنجابی سندھی عربی، فرانسیسی جرمن وغیرہ زبانوں کے نام لیتے ہی ان زبانوں سے وابستہ جغرافیائی وحدت اور قومیت کا تصور نمایاں ہو جاتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ بھی باور کیا جاتا ہے کہ ہر خطے کی زبان ________ لازماً دوسرے خطے کی زبان سے اگر متضاد نہیں تو کم از مختلف ضرور ہو گی۔ اس اندازِ نظر کو بدلے ہوئے رسم الخط کی وجہ سے مزید تقویت ملتی ہے جیسے چینی عربی انگریزی اور ہندی رسم الخط کی جداگانہ صورتیں لیکن ان سب کو قطعی طور پر مطلق قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بعض اوقات بدلے جغرافیائی حالات اور نامانوس رسم الخط کی بنا پر منفرد نظر آنے والی زبانیں داخلی اصولوں اور قواعد میں مماثل پائی گئیں اسی لیے ماہرین لسانیات فروعی اور سطحی اختلافات کے مقابلے میں زبانوں کی داخلی تنظیم اور تشکیل قواعد کی روشنی میں زبانوں میں امتیاز کرتے ہیں۔

محی الدین قادری اس مسئلے پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ زبانوں کی جو صورتیں ملتی ہیں "ان میں پہلی جماعت ان زبانوں کی ہے جو یک لفظی ہوتی ہیں اور جن کے اساسی الفاظ شکلی تبدیلیوں کے ذریعے سے اپنے مفہوم میں تغیر و تبدل یا اضافہ نہیں کرتے۔ اس قسم کی زبانیں سرزمین چین ہندوستان کے مشرقی ممالک اور انہیں اطراف و اکناف کی آبادیوں میں رائج ہیں ان زبانوں میں الفاظ بالعموم آواز ہوتے ہیں ان میں سابقوں اور لاحقوں کا استعمال نہیں کیا جاتا ہے اس تقسیم کی دوسری جماعتوں میں دنیا کی جملہ باقی زبانیں شامل ہیں ان میں الفاظ اپنی شکلیں اور ان کے ساتھ مفہوم بدلتے رہتے ہیں اور ساتھ ہی

سابقوں اور لاحقوں کے ذریعے سے بھی اُن کے معنی میں قسم قسم کے پہلو پیدا کئے جا سکتے ہیں۔ ایک ہی لفظ اصل یا مصدر ہوتا ہے اور اسی سے سینکڑوں الفاظ مشتق ہوتے ہیں۔[۲۴]

ان میں اول الذکر یعنی ایک ہی لفظ پر مشتمل زبان کو اصطلاح میں "ISOLATING LANGUAGE" کہا جاتا ہے جبکہ دوسری کو "AGGLUTINATING LANGUAGE" کہا جاتا ہے ایک تیسری قسم کی ہے۔ یہ اشتقاقی ہوتی ہے اور یہی زیادہ ترقی یافتہ صورت میں "ANALYTICAL LANGUAGE" بن جاتی ہے[۲۵]

اصطلاحاً انہیں یک لفظی، جڑواں، اشتقاقی اور تحلیلی زبانیں کہا جاتا ہے۔

ماہرین لسانیات نے بحیثیت مجموعی زبانوں کے آٹھ عظیم خاندان بنائے ہیں۔ یہ خاندان بالکل شاہی خاندانوں جیسے نظر آتے ہیں کہ انفرادی صورت میں بڑے بڑے بادشاہ ملتے ہیں لیکن اپنی قوت اور دائرہ اختیار کے باوجود ان کا تعلق اپنے جد سے برقرار رہتا ہے۔ بہرحال یہ آٹھ لسانی خاندان کچھ یوں ہیں۔ (۱) سامی (۲) ہند چینی (۳) دراوڑی (۴) منڈا (۵) افریقہ کی بانتو (٦) امریکی (۷) ملایا (۸) ہند یورپی۔

ان کی تفصیل کچھ یوں بنتی ہے:

۱۔ **سامی**: اس میں عبرانی، فنیقی، عاشوری اور قدیم شام اور بابل کی وہ زبانیں شامل ہیں جو اب ناپید ہو چکی ہیں۔ موجودہ دور میں عربی اور افریقہ اور چند حبشی زبانیں اس کی نمائندگی کرتی ہیں۔

۲۔ **ہند چینی**: اس میں چینی، سیامی (اس سلسلے کی سات زبانیں) تبتی (ہمالوی اور اسی سلسلے کی تیئس زبانیں) اور برمی معہ چھبیس شاخوں کے شامل ہیں۔

۳۔ **دراوڑی**: تامل، تلگو، ملیالم، کنڑی ہندوستان میں، پاکستان میں براہوی۔

۴۔ مونٹرا: اس میں ہندوستان کی گونڈ، سنتھال، منڈلی، راج محل اور سنبھل پوری۔

۵۔ بانتو: افریقہ کی ایک سو پچاس زبانیں

۶۔ امریکی ریڈ انڈین قبائل: متعدد ریڈ انڈین قبائل کی زبانیں ان میں بعض اب ان قبائل کے ساتھ ہی ناپید ہو چکی ہیں۔

۷۔ ملایا: اس علاقے کی متعدد زبانیں

۸۔ ہند یورپی: زبانوں کے اس عظیم سلسلے کو آریائی اور ہند جرمانی بھی کہتے ہیں۔ ہندوستان کی بیشتر بڑی زبانوں کے ملاپ یورپ کی تمام اہم زبانیں جیسے انگریزی، جرمن فرانسیسی اطالوی اور کیلٹک زبانیں۔

زبان: عمرانی تناظر[۲۶]

اساطیری اور مذہبی تناظر کے پہلو بہ پہلو بعض ماہرین نے سماجی اور عمرانی نقطہ نظر سے زبانوں کے آغاز کے بارے میں جو تصورات پیش کئے ان میں نسبتاً زیادہ معروف۔ مختصر ترین الفاظ میں یوں ہیں ۔(۱) "POW - VOW - THEORY" کتے کی بولی یا آوازوں کی نقل اتارنے کا نظریہ کہ انسان نے خاص کر محض کتے کی بولی کی نقل کر کے بولنا سیکھا۔

(۲) "POOH - POOH - THEORY" محنت و مشقت کی حالت میں جو آوازیں نکلیں ان کی بنیاد پر زبان کا تصور کیا گیا۔

۳۔ "DING - DONG - THEORY" لفظ و معنی کا ایک قسم کا باطنی تعلق ۔

۴۔ "YA - HE - HO - THEORY" شدتِ جذبات کے باعث کچھ آوازیں منہ سے نکلتی ہیں ۔ انہی کی بنیاد پر زبان کا تصور پیش کیا گیا ۔

۵۔ "TA - TA - THEORY" مل جل کر گانے بجانے ۔ جذبات کو بڑے پیمانے

بریش کرنے سے جو لفظ بن گئے۔ ان کے اوپر آواز کا تصوّر کیا گیا۔[۲۷]

ظاہر ہے یہ سب قیاس آرائیاں ہیں بالخصوص ببرالیعنی کتے یا کسی بھی جانور کی آواز کی نقل سے انسانی زبان کا تعلق دور کی کوڑی لانے کے مترادف ہے۔ اس تصور پر دو بنیادی اعتراضات ہو سکتے ہیں۔ پہلا تو یہ کہ کتے یا دیگر جانوروں کی آوازیں معروف مفہوم میں بولی یا زبان قرار نہیں پا سکتیں کہ سرے سے اُن کا انسانی سماج اور صوتی ابلاغ سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ جانوروں کی مخصوص آوازیں ان کی محدود ضروریات اور جبلی تقاضوں سے مشروط ہوتی ہیں اور اُن کے ابلاغ میں آواز کے ساتھ ساتھ بعض اوقات جسم کی مخصوص عضلات کی متغیّر حالت یا رنگ کی تبدیلی وغیرہ بھی مؤثر کردار ادا کرتی ہے۔ مزید براں انسان اور جانور کے آلاتِ صوت میں جو اساسی فرق ہے اس کی بنا پر انسانی آوازیں جانوروں کے مقابلے میں نسبتاً کم سمع خراش ثابت ہوتی ہیں۔ گدھا رومانٹک ہو کر کتنا ہی ڈھینچوں ڈھینچوں کیوں نہ کرے انسان کے لیے اس کے تتبع میں اپنی محبوبہ کو دیکھ کر خوشی سے ڈھینچوں ڈھینچوں کرنا۔ کیا آپ اس کا تصوّر کر سکتے ہیں۔

اسی انداز پر دیگر وجوہات کی بھی خامیاں یا اُن کا ایک طرفہ ہونا واضح کیا جا سکتا ہے دراصل اس نوع کے بیشتر تصورات میں جو ایک طرح کی OVER - SIMPLIFICATION ملتی ہے۔ وہ منطقی تجزیہ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ سیدھی سی بات تو یہ ہے کہ زمانی بُعد کی بنا پر زبانوں کے آغاز اور اُن کے تشکیلی مراحل کا سراغ لگانا ناممکن ہے۔ ہم گذشتہ صفحات میں بیان کر آئے ہیں کہ قریب ترین انسانی آبادی کوئی ایک لاکھ برس پہلے کی تھی۔ تو آج ہم ان کی زندگی میں زبان کے آغاز کا سراغ کیسے لگا سکتے ہیں؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ زبان انسانی سماج کی بنیادی ضرورت ہے اور یہ زبان ہی ہے جو متنوع مزاج، عادات اور خصائل کے حامل افراد کی شیرازہ بندی کر کے انہیں قوم و ملّت کا روپ دیتی ہے۔

عتیق احمد صدیقی نے اپنے مقالے "زبان کیا ہے"[۲۸] میں ایک دلچسپ نکتہ پر بحث

کی ہے یعنی" زبانِ مطلق بھی کوئی چیز ہے یا مختلف زبانوں کا وجود ہی ہمیں زبان کا احساس دلاتا ہے۔اس صورت میں زبانِ مطلق ایک کل ہوگی جس کے اجزا مختلف زبانیں ہیں یا یوں کہیے کہ زبانِ مطلق ایک تصور ہے جس کا معروضی اظہار مختلف زبانوں کی صورت میں ہوتا ہے، پھر یہ سوال کہ آیا زبان کی تعریف کے سلسلے میں زبان کے مجرد تصور پر غور کیا جائے یا اس کی عملی تطبیق پر۔ عملی تطبیق مفرد زبانوں (اردو۔ انگریزی۔ تامل۔ چینی وغیرہ) پر ہی ہوسکتی ہے۔اس لیے کہ جب زبان کا تصور کیجیے استعمال ہونے والی کسی نہ کسی زبان کا تصور ابھرتا ہے۔ زبان کا ذریعۂ اظہار قوت گویائی ہے اور گویائی کی مظہر کوئی نہ کوئی زبان ہی ہوتی ہے کیا ان میں سے کسی ایک زبان کو مدِ نظر رکھ کر زبان کی تعریف متعین کی جاسکتی ہے۔ یہ ممکن تو ہے لیکن اس میں ایک قباحت یہ ہوگی کہ ہر زبان بعض ایسی منفرد خصوصیات رکھتی ہے جو دوسری زبانوں میں نہیں پائی جاتیں۔ اسی طرح متعین کی ہوئی زبان کی تعریف جملہ زبانوں کا احاطہ نہیں کرسکتی۔ اس لیے زبان کے مجرّد تصور کو سامنے رکھ کر ہی اس کی تعریف کا تعین ضروری ہوگا۔"

اس مجرد تصور میں خرابی یہ ہے کہ ہمارے پاس سرے سے زبان کا کوئی مجرد تصور ہی نہیں۔ آج ہماری دقت یہ ہے کہ اگر ہم اپنی یا اور کسی زبان کی شروعات کا اندازہ لگانے بیٹھیں تو لامحالہ ہمیں ماضی کے بعید ترین گوشوں اور وقت کی تاریک گپھامیں پہنچنا ہوگا اور یہ لسانی مطالعے کی بنیادی دشواریوں میں سے ایک ہے۔

خلیل صدیقی نے عمرانی نقطۂ نظر سے زبان کے دو رخ قرار دیئے ہیں۔" زبان کے دو رُخ ہوتے ہیں گویائی اور سماعت۔ دونوں سماجی تقاضوں کا نتیجہ ہیں۔ زبان کی اولین صورت کا تعلق بولنے سے بھی ہے اور سننے سے بھی۔ گویائی اور سماعت بہت معمولی اعمال نظر آتے ہیں، لیکن اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ بڑے پیچیدہ اعمال ہیں صرف یہ سمجھ لینا کافی نہیں کہ بات چیت کا تعلق (آلۂ گفتگو) اور قائل سے ہے۔ قائل

اپنے باطن کا اظہار چاہتا ہے۔ سیدھے سادے خیالات و مدرکات ایک طرح کی ذہنی کیمیا کے ذریعے باہمی طور پر ترکیب پاتے ہیں اور فکر کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں خیالات، مدرکات اور افکار نفسیاتی اعمال ہیں ان کا زبانی ابلاغ بظاہر سیدھا سادا عمل سہی، حقیقتاً پیچیدہ اور مرکب ہے۔ یہی حال جذبات و احساسات کے زبانی ابلاغ کا ہے۔ اظہار باطن میں قائل کے شعور کا دخل ہوتا ہے۔ اس میں ذہن، اعصاب، عضلات اور عضویات سب کا کچھ نہ کچھ حصہ ضرور ہوتا ہے۔ صوتی تحریروں یا لفظوں کو معانی دینے کی وجہ سے نفسیات کا موضوع بھی نکل آتا ہے۔ اسی طرح سماعت بھی ایک مرکب عمل ہے جو مجموعہ ہے طبیعاتی، عضویاتی، عضلاتی اور اعصابی کیفیات کا۔" ۲۹

فرد اور گروہ کے تعلقات کی استواری اور رنگ آمیزی میں زبان اہم ترین کردار ادا کرتی ہے۔ اس کی کارفرمائی کے ایک انداز کی بڑی واضح مثال جلسہ میں مقرر کی شعلہ نوائی کی صورت میں ملتی ہے۔ جہاں برمحل الفاظ کا چناؤ جب لہجہ کی گرمی سے ملتا ہے تو صحیح معنوں میں مجمع میں آگ لگا دیتا ہے یوں ہی تو نہیں کہ ہر انقلابی شعلہ بیان مقرر بھی ہوتا ہے۔ انفرادی سطح پر اس کے ایک اور پہلو کا غالب کے اس شعر کی صورت میں مطالعہ کیا جا سکتا ہے،

بہرا ہوں میں تو چاہیئے دُونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات مکرّر کہے بغیر

فرد اور گروہ کا یہی لسانی رابطہ بالآخر زبان کے عمرانی مزاج کا پہلے تعین کرتا ہے اور پھر اس کی یوں تقویت کرتا ہے کہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب یہ ایک دوسرے کے یوں مظہر بنتے ہیں کہ استعارہ اور علامت کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ قوم کی ذہنی ترقی افکار و الفاظ کی صورت میں زبان کی ترقی کا باعث بنتی ہے اور قوم کا ذہنی افلاس اور فکری پس ماندگی زبان کو بھی مفلس بنا دیتی ہے۔ اس ضمن میں لکھنؤ کی مثال دی جا سکتی ہے جہاں زبان و بیان کی بظاہر ترقی اور الفاظ کی اختراعات اور لفظی موشگافیوں کے باوجود

بھی تہذیبی زوال اور تمدنی انحطاط کے باعث زبان اس چمک اور شکوہ سے عاری نظر آتی ہے جس کی اس عہد سے توقع کی جا سکتی ہے۔

قوم اور زبان کا جام و مینا جیسا ساتھ ہے۔ ناممکن ہے کہ ایک انحطاط پذیر ہو تو دوسری منفی اثرات سے محفوظ رہے۔ عابد علی عابدؔ نے اپنے مقالہ "ملی اور لسانی زوال پذیری" میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے:

"کسی قوم کی زبان بھی دوسرے کوائف و مظاہر کی طرح اس کے اخلاقی، معاشرتی، ثقافتی اور عرفانی انحطاط کی ترجمان ہوتی ہے بلکہ سچ پوچھیے تو لسانی شہادت ہی دنیا کی تمام شہادتوں میں وقیع تر ہے کہ جس طرح سے بے باکانہ انسان جھوٹ بول لیتا ہے۔ انسان کے وضع کردہ الفاظ کو یہ قدرت حاصل نہیں، کوئی قوم اپنی زوال پذیری کو کتنا ہی دبیز پردوں میں چھپا کر کیوں نہ رکھے اس کے الفاظ اصل حقیقت کو اس طرح اجاگر کرتے ہیں کہ شک کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی..... لسانی شہادت مورخوں کے بیانات پر اور کیا خارجی اور کیا اندرونی تمام استنادات پر تفوق رکھتی ہے کہ الفاظ جھوٹ بولنے سے گریز کرتے ہیں۔" [۲۰]

عابد علی عابد نے بہت معنی خیز بات کی ہے کہ "الفاظ جھوٹ بولنے سے گریز کرتے ہیں۔" لیکن لطیفہ یہ ہے کہ الفاظ ہی ہر طرح کے جھوٹ کو موثر بنا کر سچ میں تبدیل کر دیتے ہیں تو یہ زبان کی سماج کا ایک اور پہلو ہے ایسا پہلو جس کا معاشرہ میں متنوع جہات پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے، فرد کے معمولی جھوٹ سے لے کر حکمرانوں کے منافقانہ کذب تک اور پھر ادیبوں کے تخلیقی جھوٹ سے لے کر عشاق کے خوشامدانہ جھوٹ تک ۔ یہ سب کھیل الفاظ سے رچائے جاتے ہیں لفظ واقعی جھوٹ نہیں بولتا، لیکن جھوٹ کا سب سے بڑا آلہ کار بھی لفظ ہی ہوتا ہے اور یوں سچا اس المیہ سے دوچار ہوتا ہے:

مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زباں میں !

لسانی اشتراک :

حضرت آدم کے سلسلے میں زبانِ آدم یعنی "LINGUA ADAMICA" کا ذکر کیا گیا تھا۔ بعض ماہرین لسانیات اس بات کے قائل ہیں کہ یقیناً ابتدا میں کوئی ایک زبان ہوگی (جیسا کہ عہد نامہ عتیق سے بھی واضح ہوتا ہے) اس ضمن میں یہ بنیادی دلیل دی جاتی ہے کہ پہلے پہل انسان نے کسی ایک خطہ ارض میں مل جل کر رہنا شروع کیا۔ بعض ماہرین کے نزدیک یہ آرین تھے جنہوں نے پہلی مرتبہ ایک سماج کی صورت میں رہنا شروع کیا اور انہیں کو موجودہ یورپ کی مختلف اقوام کا جد سمجھا جاتا ہے[۲۱]۔

بہرحال آریوں کی جو بھی حیثیت ہو وہ دریائے ڈنیوب (موجودہ جرمنی) کی وادی سے جب آج سے ہزاروں برس قبل نکلے تو گروہ درگروہ مختلف ممالک کا رُخ کیا کچھ ہندوستان پہنچے تو کچھ یورپ۔ مختلف ممالک میں آباد ہو جانے کے بعد وہاں کے مخصوص جغرافیائی ماحول اور سماجی تغیرات کے نتیجے میں وہ خود اور ان کی زبان یوں بدلی کہ ماضی بعید کے "بھائیوں" سے کوئی رابطہ نہ رہا۔ جدید لسانی محققین اب یہ تسلیم کرتے ہیں کہ جرمنی، لاطینی، یونانی، سنسکرت اور اوستا کی اصل ایک ہی ہے۔ اور ان زبانوں کے خاندان کو "INDO - GERMANIC" یا "INDO - EUROPEAN" کہتے ہیں۔ زمانی بُعد کے باوجود آج بھی ان زبانوں میں لسانی اشتراک کی کچھ صورتیں نظر آجاتی ہیں جیسے اردو، سنسکرت، فارسی یونانی اور لاطینی کے یہ مشترک الاصل الفاظ :

اُردو	سنسکرت	فارسی	یونانی	لاطینی
ماں	ماتر/ماتا	مادر	میتر	ماتر
باپ	پیتر/پتا	پدر	پاتر	پیتر

اُردو	سنسکرت	فارسی	یونانی	لاطینی
بھائی	بھراتر	برادر	بھراتر	فراتر
بیٹی	دوہتر	دختر	تھغتھر	-
دانت	دانت	دندان	دنتوس	دینت
پاؤں	پد	پاد	پاؤس	پیس
چھ	شَش	شَش	ہیکس	سیکس
سات	سپت	ہفت	ہبت	ہیپتم
آٹھ	اشٹ	ہشت	اکتو	اوکتو[۳۲]

لسانی اشتراک کا یہ تصور دراصل اساطیر کے "واحد اسطور" (MONO MYTH) کے متوازی نظریہ ہے یعنی دنیا میں ابتدا میں صرف ایک ہی اساطیر تھی اور بقیہ اسی سرچشمے سے پھوٹی ہیں لیکن علم الانسان سے اس لسانی اشتراک کی قطعی توثیق نہیں ہوتی مثلاً اب یہ قطعی طور پر ثابت کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان میں آریوں کی آمد سے پہلے داوڑی اور ان سے بھی پہلے منڈا آباد تھے اور اپنے زمانے کے لحاظ سے اچھے خاصے متمدن تھے۔ وہ بستیوں میں آباد تھے عمارت سازی اور زراعت سے واقف تھے اب یہ الگ بات ہے کہ فاتح آریوں نے انہیں جنوب کی طرف دھکیل دیا خود کو اعلیٰ نسل قرار دے کر انہیں شودر ملیچھ اور راکھشش بنا کر سماجی لحاظ سے انہیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پس ماندہ بلکہ راندۂ درگاہ بنا دیا آریوں کی آمد سے قبل اس خطہ میں منڈا اور دراوڑی زبانوں کا چلن تھا یہی نہیں اب تو ماہرین کا ایک ایسا گروہ بھی ملتا ہے جن کی دانست میں خود اُردو نے بھی دراوڑی ہی سے جنم لیا ہے۔ ان حالات میں لسانی اشتراک کا نظریہ زیادہ سے زیادہ جزوی طور پر صحیح ہو سکتا ہے۔

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے میکس مولر کی سائنس آف لینگوج (جلد ا، ص ۳۰۲) کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ "دنیا کی زبانوں کو تقسیم کرنے کی صرف دو صورتیں تھیں۔ ایک صوری

(MORPHOLOGICAL) دوسری نسلی (GENEOLOGICAL) پہلی صورت میں زبانوں کی عام ترکیبی یا تشکیلی صفات کے پیش نظر زبانوں کے جدا جدا زمرے یا گروہ بنائے گئے دوسری صورت میں پہلے زبان کی بناوٹ لفظوں کے اخذ و اشتقاق صرفی و نحوی اشتراک کو دیکھا گیا اس کے بعد ان زبانوں کو ایک خاندان میں رکھ دیا گیا جن میں اشتقاق کے قاعدے، صرفی تغیرات، صوتی تبدیلیاں ایک جیسی تھیں اور جن کے لفظوں اور مصادر میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی تھی۔ تقسیم کی یہ صورت بڑی جامع ہے اور ساتھ ہی دشوار بھی ہے اس سے ہم رشتہ زبانوں کا ایک خاندان تو بن جاتا ہے مگر ان میں صحیح رشتے کا کھوج نہیں لگتا اس کے لیے مزید جستجو کرنی پڑتی ہے۔ لفظوں کی بناوٹ اور اشتقاق کے اصولوں کو نئے سرے سے جانچنا اور زبان کے سرمایہ کو کھنگالنا پڑتا ہے۔ ہر تغیر کی پوری تاریخ سامنے رکھنی پڑتی ہے تب کہیں جا کر دو زبانوں کے تعلق کا ٹھیک ٹھیک سراغ ملتا ہے۔" [۳۳]

مندرجہ بالا اقتباس سے بخوبی یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اپنی ہمہ گیر صورت میں لسانی اشتراک کا تصوّر کتنی پیچیدگیوں کا حامل ہو سکتا ہے۔

تاہم اس مشترک لسانی آغاز کے سلسلے میں یورپ کے خانہ بدوشوں کی زبان کا مطالعہ دلچسپ نتائج سامنے لاتا ہے ان کی زبان میں تو اُردو بلکہ پنجابی تک کے الفاظ بھی مل جاتے ہیں اس کی وجہ سمجھنی اتنی دشوار نہیں۔ یہ خانہ بدوش کبھی ہمارے ہی علاقوں کے باسی تھے۔ خانہ بدوش شہری تہذیب و تمدن سے دور رہتے ہیں اور صرف اپنے ہی گروہ میں ملنا جلنا اور شادی بیاہ کرنا پسند کرتے ہیں اس لیے ان کی زبان میں ہماری زبانوں کے الفاظ کی آمیزش باعثِ تعجب نہ ہونی چاہیے۔ اگرچہ یورپ کے خانہ بدوش جس ملک میں رہتے ہیں وہ وہاں کی زبانیں بھی سیکھ لیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود اصل زبان ان کے لیے ایک طرح کی خفیہ زبان کی صورت بھی اختیار کر جاتی ہے۔ دوسروں کی موجودگی میں کوئی خاص بات کرنی مقصود ہو تو وہ صرف اپنی ہی زبان کا

سہارا لیتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر محی الدین قادری زور لکھتے ہیں:

"جپسیوں کی یورپ اور مغربی ایشیا کی بولیوں کو دو شاخوں پر منقسم کیا جا سکتا ہے۔ نمبر۱ ارمنی۔ نمبر۲۔ یورپی یہ بولیاں ان پراکرتی زبانوں سے ہیں جو شمال مغربی ہندوستان میں بولی جاتی تھیں ان کا کچھ تعلق پشاچہ زبان سے بھی ہے۔ جپسیوں کے آباؤ اجداد پہلی مرتبہ غالباً پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان سے نکلے اور یہ پہلا قافلہ ایران آرمینیا اور بازنطینی سلطنت سے گزرتا ہوا یورپ پہنچا۔ مشرقی یورپ میں یہ لوگ بارہویں صدی عیسوی میں داخل ہوئے اور وہاں سے مغربی اور جنوب مغربی کا رُخ کیا۔ جپسیوں کا دوسرا گروہ آرمینیا میں ٹھہر گیا۔ ان کی زبان درمیانی عہد کی آریائی زبان کے بالکل مشابہہ رہی مگر ساتھ ہی آرمینی زبان سے بھی متاثر ہوتی رہی۔ ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانوں اور جپسیوں کی بولیوں میں ماخذ و اشتقاق کے لحاظ سے نہایت قریبی تعلق ہے"[۳۴]

"پاولوف کا کُتّا":

مشہور روسی ماہر نفسیات پاولوف نے ایک تجربہ کیا تھا۔ اس کا مختصر احوال سن لیجیے اس کے پاس ایک کتا تھا وہ جب بھی اُسے کھانا دیتا ساتھ ہی ایک گھنٹی بھی بجا دیتا۔ یہ عمل اس تواتر سے ہوا کہ کتے کے لیے کھانا اور گھنٹی مشروط ہو گئے اس حد تک کہ جب کھانے کے بغیر بھی گھنٹی بجائی گئی تو کتے کے منہ میں پانی بھر آیا۔ پاولوف نے اسے مشروط رجعتی حرکت (CONDITIONED REFLEX) کا نام دیا آج اس تجربے کو پون صدی سے زیادہ بیت چکی ہے مگر اب بھی انفرادی طرزِ عمل سے لے کر اجتماعی رویوں کی

تفہیم میں یہ تصور کسی نہ کسی حد تک کارفرما ہے جدید دور کے سیاسی پروپیگنڈا کی نفسیاتی اساس "BIG BROTHER" کی صورت میں پرسنیلٹی کلٹ کی تشکیل اور کمرشل اشتہارات کے لیے خوبصورت ماڈلز کی تلاش ۔ یہ سب اپنی اساسی صورت میں "CONDITIONING" کی ہی مختلف صورتیں ہیں ۔

سوال یہ ہے کہ پاولوف کے کتے کا انسانی زبان سے کیا تعلق ہے ؟

پیدائش کے بعد بچے کی "کنڈیشننگ" دو چیزوں یعنی دودھ اور لفظ سے ہوتی ہے اور اتفاق بلکہ حسن اتفاق سے ان دونوں کا مرکز ایک ہی ہستی یعنی ماں ہوتی ہے ۔ وہ بچے کو دودھ پلاتی پیار محبت کی باتیں کرتی اور لوریاں سناتی ہے ۔ انسانی آواز سے بچے کا اولین تعارف ماں ہی کے ذریعے سے ہوتا ہے وہ نرم الفاظ اور شیریں لہجہ میں "میرا چاند" کہہ کر اس سے باتیں کرے یا لوریاں سنائے ہر دو صورت میں بچے کے آلات سماعت اور اعصاب ماں کے وجود کی شناخت اس کی آواز سے ہی کرتے ہیں وہ آواز جو خوش آہنگی سے بچے کے کومل اعصاب کے لیے نرم ہموار ثابت ہوتی ہے اسی لیے کچھ نہ سمجھنے پر بھی تیز آواز اور کرخت لہجہ بچے کو خوف زدہ کر کے رُلا دیتا ہے لیکن جیسے ہی پیار بھرے لہجہ میں پچکارا جائے وہ خاموش ہو جاتا ہے ۔

الغرض انسانی آواز اور زبان سے بچہ کا پہلا تعارف ماں کے ذریعہ سے ہوتا ہے ۔ یہی نہیں بلکہ اگر حالات سازگار رہیں (یعنی ماں زندہ رہے ، زیادہ مصروف نہ رہتی ہو ۔ ملازمت نہ کرتی ہو اور شہرت کی بھوکی سوشل ورکر بھی نہ ہو) تو بچہ ابتدائی لسانی تربیت بھی ماں (یا ارد گرد کے افراد) سے حاصل کرتا ہے ۔ وہ جب ابا ۔ دادا ۔ ماما ۔ بابا ۔ دودو یا مم جیسے الفاظ کہنا سیکھتا ہے تو اس میں بڑی حد تک ماں کی کوچنگ کا بھی دخل ہوتا ہے ۔

جب بچہ قدرے بڑا ہو کر خود کھانے پینے کے قابل ہو جاتا ہے تو وہ ماں کے

دودھ سے تو بے نیاز ہو جاتا ہے مگر اس کی زبان سے نہیں ــــ یہ زبان لوریوں کی صورت میں ہو یا کہانیوں کی صورت میں ـــ بہرحال بچے کا زبان سے پہلے تعارف ماں کی وساطت سے ہوتا ہے چنانچہ مادری زبان، ماں بولی[25] اور "MOTHER TONGUE" جیسے الفاظ اسی امر کے مظہر ہیں کہ زبان کو نسوانی روپ دے کر اس کی ماں کے ساتھ تطبیق کر دی گئی۔ اسی لیے اصول و قواعد کے احترام کی صورت میں زبان کو جو بعض اوقات "محرمات" کا درجہ دے دیا جاتا ہے تو اس کا نفسیاتی سبب مادرانہ وابستگی میں بھی "تلاش" کیا جا سکتا ہے اس رویہ نے جب تخلیقی سطح پر اظہار پایا تو زبان اظہارِ مطالب کے ایک آلہ سے بڑھ کر مقصود بالذات قرار پائی جب کہ تنقیدی سطح پر اہلِ زبان کا وہ طہارت پسندانہ رویہ معرضِ وجود میں آ گیا جس کے باعث زبان کو دیوی سمجھتے ہوئے گویا اس کا معبد بنا دیا جاتا ہے اور وہ خود اس معبد کے پجاری بلکہ مہا پجاری بن بیٹھتے ہیں اس صورت میں دوسرا یعنی زبان دان" غیر" کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

چنانچہ اظہار و اسلوب میں اس کا تجربہ، جدت اور اختراع گویا ماں کی طرف اٹھتی نگاہِ غیر میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ جس کے نتیجے میں لسانی عصبیت جنم لیتی ہے جیسے دہلی اور لکھنو کی لسانی آویزش ــ جس کے نتیجے میں اگر ایک طرف تذکیر و تانیث کی بحثیں تھیں تو دوسری طرف باغ و بہار کے جواب میں" فسانۂ عجائب" قلم بند کی گئی یہ لسانی تشدد پسندی صحیح ہے یا غلط یہ الگ "بحث" ہے لیکن خالص لسانی نقطہ نظر سے قطع نظر اس کا نفسیاتی سبب بھی دلچسپ ہے۔

"آوازوں کی آبشار":

دیکھا جائے تو بچہ آوازوں کی آبشار میں ہوتا ہے اس کے لیے تمام آوازیں بامعنی نہیں ہوتیں، اس لیے کہ وہ ابھی اصوات کے حروف بننے، حروف کے الفاظ کے سانچے

میں ڈھلنے اور پھر ان الفاظ کے فقرات کی مالائیں پروئے جانے کے عمل سے آگاہ نہیں، لیکن اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا ایک تو اس لیے کہ بچے کی محدود ضروریات بڑوں نے پوری کرنا ہوتی ہیں اور دوسرے اس لیے بھی کہ دودو اور مم جیسے الفاظ (بڑوں کو ہنسانے کے باوجود) بچے کے لیے کافی ثابت ہوتے ہیں۔

البتہ بار بار ایک ہی انداز و لہجہ کے الفاظ سننے کے نتیجے میں بچے کے آلاتِ صوت اور اعصاب مختلف آوازوں کو ان کے مخصوص لہجہ اور آواز کے زیر و بم سے بالآخر انفرادی لفظ کے روپ میں پہچاننے کے قابل ہو جاتے ہیں۔ ابتدا میں یہ عمل غیر شعوری ہوتا ہے لیکن جب بچہ شے اور لفظ کے رشتے کو سمجھ لیتا ہے تو پھر زبان سیکھنے کے عمل میں تیزی آجاتی ہے اس ضمن میں قطعی طور پر عمر کا تعین کرنا ضروری نہیں یعنی بچہ کب دودو کو دودھ اور مم کو پانی کہنا شروع کرتا ہے اس کا بچہ کی ذہانت، آلاتِ صوت کی حساسیت اور قوتِ نطق کا قوتِ گویائی کے ساتھ گہرے رابطے سے تعلق ہے لیکن اتنا ہے کہ ایک مرتبہ جب بچہ لفظ شناسی کے راستے پر گامزن ہو گیا تو پھر اس سفر کا انت نہیں۔ اگر بچہ کا مشاہدہ کیا جائے تو وہ بالعموم ایک ایک لفظ کو بار بار دہراتا جاتا ہے۔ چنانچہ "وہ" "اباکوا" کی رٹ لگائے جاتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات بڑے تنگ آکر اُسے جھڑک بھی دیتے ہیں بچے کے یوں بار بار لفظ دہرانے کے دو مقاصد ہو سکتے ہیں ایک تو یہ کہ یوں بار بار دہرانے سے وہ اپنے ذہن میں لفظ اور شے کا رشتہ مستحکم کرتا ہے اور دوسرے وہ لفظ کے صوتی مزے سے آشنائی حاصل کرتا ہے۔ جب وہ مدرسے جاتا ہے تو وہاں الفاظ کو بار بار دہرانے کا عمل شعوری طور پر کیا جاتا ہے آ۔ آم۔ ب۔ بکری پ پنکھا سے حروف یاد کرانا صوت شناسی کے علاوہ اور کچھ نہیں البتہ اب یہ ہوتا ہے کہ اسے صوت کے ساتھ ساتھ حرف کی ساخت بھی یاد ہو جاتی ہے۔

زبان کا انسان کی زبان (عضو) سے کتنا گہرا تعلق ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا

جا سکتا ہے کہ جس طرح اُردو میں زبان (عضو) اور "زبان" ایک ہی ہیں اسی طرح انگریزی میں بھی "TONGUE" عضو کے ساتھ ساتھ زبان کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے جس کی وجہ یہ ہے کہ زبان کی مختلف حرکات ہی مختلف النوع الفاظ ادا کرتی ہیں اس لیے زبان سے "زبان" یوں مشروط ہوئی کہ دونوں یک نام ہوگئیں آج اس کا تعین مشکل ہے کہ عضو کو پہلے زبان کہا گیا یا زبان کی مناسبت سے بعد میں عضو کو زبان قرار دیا گیا۔ صورت جو بھی رہی ہو اب عضو اور صوت ایک ہو چکے ہیں۔

حرف اور پھر لفظ کی تشکیل کے سلسلے میں یہ واضح رہے کہ صوت پہلے تھی البتہ اس نے لفظ کا جامہ نہ پہنا تھا یعنی حروف اور الفاظ تو موجود تھے، لیکن گویائی کی حد تک ابھی تحریری زبان ایجاد نہ ہوئی تھی۔

جہاں تک انفرادی حیثیت میں حرف کا تعلق ہے تو ہر حرف زبان کی تشکیل میں اساسی کردار ادا کرنے والی صوت کی نمائندگی کرتا ہے اسے الف سے ظاہر کیا جائے، یا ب سے، ج سے یا ک سے یا م سے یا ن سے ــــ اس سے فرق نہیں پڑتا کہ ا۔ب۔ج۔ک۔م اور ن کی اصوات کو کسی نہ کسی طرح سے ظاہر کیا جانا تھا۔ ہر چند کہ ا۔ب۔ج۔ک۔م۔ کی مخصوص صورتیں بھی یونہی الل ٹپ نہ بن گئی تھیں بلکہ ہر حرف کی مخصوص شکل متعدد ارتقائی مراحل کے بعد موجودہ صورت میں سامنے آئی ہے (رسم الخط والے باب میں اس پر مفصل بحث ہوگی) ہر حرف انسانی حلق سے نکلی ہوئی کسی خاص آواز کی نشانی ہے۔ لہٰذا کسی بھی زبان کے حروف تہجی کی تعداد سے اس کا بآسانی اندازہ ہو سکتا ہے کہ زبان بولنے والے افراد کون کون سی آوازیں ادا کرنے کے اہل ہیں اور کن آوازوں کو ادا کرنے سے قاصر ہیں۔

یہ جو کہا جاتا ہے کہ فلاں زبان میں مٹھاس ہے اور وہ خوش آہنگ ہے جب کہ اس کے مقابلے میں دوسری کرخت ہے اور اس سے ثقلِ سماعت ہوتا ہے تو اس

کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس زبان کے بولنے والے ملائم یا ثقیل اصوات کے اخراج پر قادر ہیں، چنانچہ اُردو کے مقابلے میں فارسی اور انگریزی کے مقابلے میں فرانسیسی زبانیں جو زیادہ خوش آہنگ سمجھی جاتی ہیں تو اس سے مراد یہی ہے کہ فارسی اور فرانسیسی بولنے والے کرخت اور ثقیل الفاظ کی ادائیگی پر قادر نہیں جیسے ٹ اور T جب، بائرن نے T "THE ISLES OF GREECE" میں اطالوی زبان کی خوش آہنگی کو یوں خراجِ تحسین پیش کیا:

"IT FLOWES LIKE KISSES FROM A FEMALE MOUTH" 1960

تو وہ بھی درحقیقت اسی لسانی حقیقت کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

حرف کا سانچہ:

حروفِ تہجی اس امر کے مظہر ہوتے ہیں کہ اس زبان کے بولنے والے کون کون سی آوازیں حلق سے ادا کرنے پر قادر ہیں۔ برصغیر پاک وہند کے لوگ اس بنا پر خوش قسمت ہیں کہ ہر طرح کی آوازیں ادا کرنے کے اہل ہیں چنانچہ اگر ایک طرف سنسکرت اور دراوڑی الفاظ سے مخصوص کرخت اصوات ادا کر سکتے ہیں تو دوسری طرف عربی، ترکی، فارسی اور مغربی زبانوں سے مخصوص اصوات بھی حلق سے نکال سکتے ہیں۔ اُردو کے حروف تہجی اس امر کے مظہر ہیں کہ یہاں کے باشندے کتنی اصوات کی ادائیگی پر قادر ہیں۔ اُردو زبان میں دنیا کی ہر زبان کا لفظ اپنا اصل لہجہ برقرار رکھتے ہوئے ادا ہو جاتا ہے۔ اس کا یہی سبب ہے کہ اہل اُردو متنوع اصوات کی درست ادائیگی پر قادر ہیں۔ فارسی برصغیر کی تہذیبی اور تخلیقی زبان تھی اس لیے زبان میں اس کے تمام حروف تو برقرار رہنے ہی تھے جبکہ اسلام، قرآن مجید، عبادات

اور دینی رسوم کی بنا پر عربی زبان کا بول بالا رہا ، چنانچہ عربی کے ذ ۔ ذ ۔ ص ۔ ط ۔ ظ ۔ غ ۔ ع
بھی اُردو حروف میں شامل ہو گئے ۔ مسلمانوں کے پہلو بہ پہلو ہندو دھرم اور سنسکرت کا
بھی رہا ، چنانچہ ڑ ۔ ڈ ۔ ٹ اور دو چشمی والے تمام حروف جیسے بھ ۔ ٹھ ۔ تھ ۔ دھ ۔
وغیرہ بھی حروف تہجی کا حصہ بن گئے ۔ یہ اثرات باہمی تھے ۔ چنانچہ اُردو کی مانند ہندی
میں بھی ان حروف کا اضافہ کیا گیا مگر یوں کہ جو صوت جس طرح ادا ہو سکے اسے اسی
طرح ادا کیا ، اس کا اصل لہجہ متروک کر دیا ۔ بھارتی دور درشن کے رسیا اس کی گواہی
دے سکتے ہیں جہاں اناؤنسر غزل کو گجل اور غالب کو گالب بنا دیتی ہے ۔

ذیل میں اُردو اصوات کی جدول درج کی جاتی ہے :-

خالص ہندی کی آوازیں : پھ بھ تھ دھ ٹھ ڈھ چھ جھ کھ گھ
ٹ ڈ ڑ ڑھ

ہندی اور عربی فارسی کی مشترک آوازیں ۔ ب ۔ پ ۔ ت ۔ ج ۔ چ ۔ د ۔ ر
س ۔ ش ۔ ک ۔ گ ۔ ل ۔ م ۔ ن ۔ و ۔ ہ ۔ ی ۔

عربی فارسی کی مشترک آوازیں ق ۔ خ ۔ ع ۔ ز ۔ ف [۳۶]
جو ہندی میں بھی ہیں ۔

اُردو حروف تہجی جہاں پر تنوع اصوات کے مظہر ہیں ۔ وہاں س ص ۔ ت ط ۔ ز ذ ۔
ض ظ ۔ جیسی اصوات کی تکرار بھی ملتی ہے ۔ اسی طرح ژ کی صورت میں ایک حرف ایسا
بھی ملتا ہے کہ شاید ژالہ کے علاوہ اور کہیں استعمال نہیں ہوا ہے ۔ اسی تکرارِ صوت
کے نتیجے میں جب کبھی بھی اصلاحِ زبان یا رسم الخط کی اصلاح کا مسئلہ چھڑا تو یہ ہمیشہ
وجہ اعتراض بنے ۔ ڈاکٹر مسعود حسین خان کے بقول :

" ذ ض ظ ث ص وغیرہ یہ تمام حروف ہیں ۔ صوتیں نہیں اور
رسم الخط کے لیے ایک طرح سے وبالِ جان بنتے ہیں .... صوتی نقطۂ نظر

سے یہ مردہ لاشیں ہیں جنہیں اُردو رسم الخط اٹھائے ہوئے ہے اس لیے
کہ ہمارا رشتہ عربی سے ثابت رہے[۵۲]۔

ڈاکٹر مسعود صاحب کا اعتراض ہی دراصل بنیادی سبب بھی ہے اور یہ ختم نہیں ہو سکتا۔

صوتی تفاوت:

جہاں تک اصوات کی درست ادائیگی کا تعلق ہے تو برصغیر کے مختلف علاقوں میں صوتی تفاوت ملتا ہے۔ایک علاقے کے لوگ کسی مخصوص آواز کی ادائیگی پر قادر نہیں ہوتے۔ جیسے حیدرآباد دکن کے اصل باشندے ق کو خ سے بدل لیتے ہیں۔ پنجابی ق کو ک سے اور اصلی لاہوری ر کو ڑ کہتے ہیں۔ برصغیر کی جغرافیائی اور لسانی وسعت کی بنا پر صوتی ہم آہنگی پر مبنی یکساں لہجہ کی برقراری ممکن نہیں ۔تاہم عربی فارسی کے مقابلہ میں اردو اس لحاظ سے بہتر ہے کہ غیر ملکی الفاظ کو اپنے مخصوص لسانی سانچہ میں ڈھالنے کی ضرورت پیش نہیں آتی یعنی پ کو ب سے بدل کر معرب بنانے اور ٹ کو ت سے بدل کر مفرس بنانے کی ضرورت نہیں ۔اہل عرب پ کے علاوہ چ ژ گ بھی ادا کرنے پر قادر نہیں جب کہ ان کا ق اور غ درست ادا کرنے کے لیے مولویوں کو ایڑی چوٹی کا زور لگانا پڑتا ہے۔

غالباً یورپ میں انگریز واحد قوم ہے جو ٹ نہیں کہہ سکتی جبکہ دیگر یورپین زبانوں میں ٹ کی آواز نہیں ہوتی۔ جرمن میں ٹ کی آواز ڈ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔الغرض اصوات کا یہ تنوع جغرافیائی تہذیبی اور لسانی حالات کے تحت معرضِ وجود میں آتا ہے جس سے لسانی بوقلمونی ملتی ہے اسی لیے بعض اصوات کی ادائیگی اور عدم ادائیگی کی بنا پر ایک زبان کو کسی دوسری زبان پر فوقیت نہیں دی جاتی۔ ہر گل را رنگ و بوئے

دیگراست۔

الفاظ کی بستی :

مفرد آوازیں اپنی اساسی حیثیت میں وہی کردار ادا کرتی ہیں جو انسانی جسم میں خلیات کا ہوتا ہے۔آوازیں حروف بنتی ہیں اور پھر مل کر لفظ اور الفاظ وہ اینٹیں ہیں جن سے زبان کے قصرِ عالیشان کی تعمیر ہوتی ہے۔

ہر صوت اپنی انفرادی صورت میں محض مجرد آواز ہے۔اگرچہ تنہا لفظ بھی بامعنی ہو سکتا ہے لیکن لفظ کا اصل حُسن فقرے میں ملتا ہے۔جب وہ دوسرے الفاظ کے پڑوس میں انفرادی تشخص کا اظہار کرتا ہے۔صرف فقـــرہ ہی سے زبان کے معاشرتی کردار کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔جس طرح ایک گلی کے متعدد مکانات میں مختلف المزاج افـراد بستے ہیں اسی طرح فقرہ کو بھی گلی ہی سمجھنا چاہیئے۔ایسی گلی جس میں الفاظ کے مکانات میں مختلف المزاج اصوات مقیم ہیں۔جس طرح گلیاں کوچے بازار اور محلے مل کر بستی کی تشکیل کرتے ہیں اسی طرح مختلف المزاج الفاظ پر مشتمل طرح طرح کے لاتعداد فقرات زبان کی بستی کی تعمیر کرتے ہیں۔انسانی بستی اور الفاظ کی بستی اب ایک دوسرے کے لیے یوں لازم ملزوم ہو چکی ہیں کہ خاموش بستی پر ہول ثابت ہوتی ہے ـــ شہرِ خموشاں قبرستان کو کہا جاتا ہے!

حواشی

۱۔ قدیم صوفی کا مقولہ ہے: "سب کچھ دے ڈالو تاکہ تم کچھ حاصل کر سکو۔"
بحوالہ: نفسی طریق علاج میں مسلمانوں کا حصّہ، ص: ۲۱) از ڈاکٹر محمد اجمل (ترجمہ: شہزاد احمد)

۲۔ فرہنگ آصفیہ "مقدمہ: ص: ۲۵

۳۔ لیکچر بعنوان: "زبان اُردو" جلسہ انجمن پنجاب لاہور، ۱۸۶۵ء، مشمولہ "مقالات مولانا محمد حسین آزاد" مرتبہ: آغا محمد باقر، ص: ۳۶

4 AN ESSAY ON MAN" P 149

5 SHUMAKER, WYNE "LITERATURE AND THE IRRATIONAL" P. 45

۶۔ ابوالفضل: علامہ۔ آئین اکبری"۔ (مترجم: مولوی محمد فدا علی طالب (جلد اوّل) ص: ۱۸۵، ۱۸۶

۷۔ ایضاً " " " ص: ۱۸۶

۸۔ ابوریحان البیرونی۔ ص: ۱۸۲

۹۔ ایضاً ۔ ص ۱۸۲

۱۰۔ مقالہ بعنوان "تحقیق لفظ" مطبوعہ" اخبار اردو" کراچی جون ۱۹۸۲ء۔ مزید دیکھئے" لفظ کمی دان کی تحقیق"۔ ایضاً فروری ۱۹۸۳ء

۱۱۔ مقالہ بعنوان: "اُردو میں ایک لاطینی لفظ" مطبوعہ" قومی زبان" کراچی دسمبر ۱۹۸۱ء

۱۲۔ آج بھی ٹریفک کے اشارات میں یہی اصول کارفرما نظر آتا ہے۔

۱۳۔ امریکی جریدہ لائف بائیبل نمبر (۱۹ اپریل ۱۹۶۵ء) میں اس موضوع پر پندرھویں صدی کے ایک مصور کی دل کش تصویر شائع کی گئی ہے۔

۱۴۔ مزید معلومات کے لیے یہ کتب ملاحظہ ہوں: جلجامش کی داستان" از ابن حنیف (لاہور: ۱۹۶۱ء)

"THE EPIC OF GILGAMESH" BY: N.K SANDARS, 1960

۱۵۔ ڈاکٹر غلام علی الانہ "زبان اور ثقافت" ص: ۲۶ - ۲۷

۱۶۔ اورینٹل کالج میگزین "جشن صد سالہ نمبر" لاہور - مارچ جون ۱۹۷۲ء

۱۷۔ ابوریحان البیرونی، ص ۱۸۲

۱۸۔ "آئین اکبری" جلد اول ص ۲۰۹

۱۹۔ عین الحق فرید کوٹی "اردو زبان کی قدیم تاریخ" (طبع دوم) ص: ۱۸

۲۰۔ سبطِ حسن "ماضی کے مزار" ص: ۱۹۹

۲۱۔ ایضاً - ص: ۱۹۸

۲۲۔ ایضاً - ص: ۱۹۹ - ۲۰۰

"AN ESSAY ON MAN" P 155 - 156

۲۴۔ "ہندوستانی لسانیات" ص ۶۳

۲۵۔ "اُردو لسانیات کا مختصر خاکہ" ص: ۴۰

۲۶۔ اس موضوع پر ایک دلچسپ مذاکرہ "زبان پر سماجی تبدیلی کا اثر" مطبوعہ ماہ نو لاہور - دسمبر ۸۰ء ملاحظہ ہو، شرکاء محمد علی صدیقی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، انجم اعظمی، حسن عابد - فردوس حیدر - شاہد نقوی، اور عزیز شیخ - مذاکرے کی میزبان: کشور ناہید -

۲۷۔ "اُردو لسانیات کا مختصر خاکہ" ص ۲۲ - ۲۳

۲۸۔ مطبوعہ "اردوئے معلی" "قدیم اُردو نمبر" شعبہ اُردو - دہلی یونیورسٹی - دہلی -

۲۹۔ خلیل صدیقی "زبان کا مطالعہ" - ص ۲۰

۳۰۔ "اقبال ریویو" لاہور - جولائی ۱۹۶۵ء

۳۱۔ آرین کو بالعموم ایک مخصوص نسل سمجھا جاتا ہے مگر محمد مجیب کی دانست میں ایسا نہیں ہے وہ "تاریخ تمدن ہند" (ص: ۴۶) میں لکھتے ہیں "آریا نسل کی کوئی ایسی علامات نہیں جس سے

وہ پہچانی جا سکے۔ آریا کے لغوی معنی ہیں۔ نیک۔ شریف برادری والے یہ دراصل کسی نئی نسل کا نام نہیں، بہتر تو یہ ہوتا کہ ہم اس لفظ کو بالکل چھوڑ دیتے اور ان لوگوں کے لیے جو اپنے آپ کو ہندوستان میں آکر آریا کہنے لگے تھے کوئی اور نام تجویز کر لیتے، لیکن یہ اصطلاح اس قدر رائج ہو گئی ہے کہ اس کو ترک نہیں کیا جا سکتا ہے اس لیے اس سے کام نکالنا پڑتا ہے غلط فہمی سے بچنے کی یہ صورت ہے کہ ہم یاد رکھیں کہ آریا سب گورے اور قدآور نہیں تھے سب کی ناک اونچی بال سنہرے اور آنکھیں نیلی نہیں تھیں انہیں آریا صرف اس بنا پر کہتے ہیں کہ وہ اپنے آپ کو آریا کہتے تھے "۔

۴۲۔ عین الحق فرید کوٹی " اردو زبان کی قدیم تاریخ " ص ۲۱۰

۴۳۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری، " اردو زبان کا ارتقا "، ڈھاکہ، ص ۲

۴۴۔ " ہندوستانی لسانیات " ص ۸۰۔ ۸۱

۴۵۔ دہلی اور لکھنو میں مردوں کے مقابلے میں گھریلو خواتین کی زبان زیادہ فصیح سمجھی جاتی تھی جب میر انیس کے بعض الفاظ پر اعتراض ہوا تو انہوں نے جواباً کہا۔ ہمارے گھر میں اسی طرح بولتے ہیں۔

۴۶۔ ڈاکٹر رام آسرا راز " اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ " ص ۸۸

۴۷ ایضاً " ۔ص ۹۲

۲۔ اُردو زبان کے نام

نام شناخت کا بنیادی ذریعہ ہے۔ اس لیے ہر معاملے میں نام کی اہمیت ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو دنیا میں ناموں اور ان کے حوالے سے وضع کی گئی تعریفوں کے تنازعات برپا نہ ہوتے۔ اُردو زبان کے مختلف ناموں کا مطالعہ کرنے پر خاصی دلچسپ بحث چھڑ جاتی ہے۔ مختلف اوقات میں اسے جن ناموں سے پکارا گیا وہ یوں ہی وضع نہ ہو گئے بلکہ تاریخی حالات اور تمدنی اثرات کے مرہونِ منت تھے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے کہ جب "ہندی" کی بجائے "اُردوئے معلّٰی" کہا گیا تو کسی طرح کے تاریخی استدلال کے بغیر بھی اُردو زبان پر اسلامی اثرات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد جب "ہندوستانی" یا "MOORS" کہا گیا تو یہ انگریزی اثرات کے باعث تھا۔ اس لیے اُردو زبان کی تشکیل و ارتقا کی مانند محققین نے اس کے ناموں کے سلسلے میں بھی خصوصی تحقیقات سے کام لیا ہے۔

دنیا کے بیشتر ممالک اس لحاظ سے یک زبان (MONO - LANGUAGE) ہیں کہ صرف ایک زبان بولی جاتی ہے۔ ایسی زبان جس کی تشکیل و ارتقا کے بارے میں ٹھوس معلومات ملتی ہیں اور جس کی لسانی تاریخ میں اشکال نہیں لیکن برصغیر میں ایسا نہیں۔ یہاں زبانوں اور بولیوں کا جو تنوع ملتا ہے۔ اس کا اظہار محض لسانی تنوع (MULTI - LANGUAGE) جیسے الفاظ سے بھی نہیں ہو سکتا کیونکہ یہاں تو زبانوں کے دریا اور بولیوں کے ندی نالے ملتے ہیں۔[1]

بلکہ اس کا امکان ہے کہ ۲۲۵ کی تعداد میں تو بڑے دریا بھی نہ ہوں۔ اس لیے برصغیر
کی کسی خاص زبان کا مطالعہ اس بنا پر دشواریوں کا حامل ثابت ہوتا ہے کہ وہ زبان تاریخی۔
تہذیبی۔ تمدنی اور سماجی عوامل کے ساتھ ساتھ متنوع لسانی محرکات کے بھی زیر اثر ہوتی
ہے، چنانچہ اُردو زبان سے وابستہ دیگر اہم لسانی مسائل اور امور کی صراحت تو خیر دور کی بات
ہے۔ صرف مختلف ادوار میں بدلتے ناموں کا مطالعہ ہی خاصہ پیچیدہ ثابت ہوتا ہے۔

ہندی/ہندوی:

بقول حافظ محمود شیرانی "اُردو کا قدیم ترین نام ہندی یا ہندوی ہے"۔[1]
ہندوستان کی مناسبت سے سب سے پہلے اِسے "ہندی" یا "ہندوی" کہا گیا۔

سدھیشور ورما کے بموجب:

"ہندوی وہ زبان ہے جو شورسینی پراکرت (جو کہ وسطی ہندوستان میں
مروج تھی) کی نسل سے ہے۔ جب مسلم حملہ آور ہندوستان میں آئے تو اس
وقت شورسینی پراکرت سے ماخوذ شورسینی اَپ بھرنش مغربی دہلی اور اس کے
گرد و نواح میں بولی جاتی تھی۔ ہندی کا ارتقا سات سو سالوں میں ہوا (یعنی
۱۱۰۰ عیسوی سے ۱۸۰۰ عیسوی تک) گیارھویں اور بارھویں صدی کے ہند
مسلم مورخوں نے ہند کی زبان ہندوی یا ہندی کا ذکر کیا ہے، چنانچہ ۱۰۲۲ عیسوی
میں طبقات اکبری کے مصنف نظام الدین نے کلنجر کے راجہ کی مصنفہ چند نظموں کا
(جو اس نے ہندوی زبان میں تیار کیں) ذکر کیا ہے۔ پہلا مسلم جس نے ہندوی
میں کچھ لکھا، مسعود ابن سعد تھا۔ جس کا انتقال ۱۱۳۰ء کے قریب ہوا، لیکن یہ ہندوی
یا ہندی مغربی اَپ بھرنش کی ایک شاخ تھی۔ غالباً ابھی ہندی کا آغاز نہیں
ہوا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سولھویں صدی سے پیشتر ہندوی کا کوئی بہت وسیع

اور معتبر مواد و نمونہ نہیں ملتا۔"[۳]

ابوالفضل نے "آئینِ اکبری" (جلد ۳ ص ۹۸) میں اکبر کے زمانے میں ہندوستان کی زبانیں گنواتے ہوئے یہ نام لیے: "دہلی، بنگالہ، ملتان، مارواڑ، گجرات، تلنگانہ، مرہٹہ، کرناٹک، سند اور افغان شال (جو سندھ اور کابل اور قندھار کے درمیان ہے)، بلوچستان کشمیر میں رائج ہیں"۔ حافظ محمود شیرانی اس کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں: کہ افغان شال سے اس کی مراد پشتو ہے" اور "زبان دہلی میں ابوالفضل غالباً اُردو یا ہندی کو شامل کر رہا ہے"۔ اگرچہ خود ابوالفضل نے بھی مختلف مواقع پر زبان کے سلسلے میں ہندی کا لفظ ہی استعمال کیا ہے لیکن "آئینِ اکبری" کی جلد اول میں اس لفظ کے متنوع استعمالات سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس کے اپنے ذہن میں بھی ہندی کے بارے میں واضح تصور نہ تھا۔ چنانچہ جب وہ دیباچہ میں یہ لکھتا ہے: "چونکہ میں نے اس دفتر میں بعض مقامات پر ہندی الفاظ استعمال کیے ہیں" (ص ۱۲) تو ظاہر ہے کہ یہ مروج زبان کے عام اور مستعمل الفاظ کے بارے میں ہے۔ لیکن جب وہ یہ لکھتا ہے: "اہلِ زبان ..... و زبان دان حضرات کا ایک گروہ ہمیشہ ہندی و یونانی و عربی و فارسی زبانوں کی کتابوں کا ترجمہ دوسری میں کرتا ہے" (ص : ۱۹۱) تو یقیناً یہاں اس کے ذہن میں سنسکرت ہے۔ کیونکہ ہندی سے ترجمہ کی گئی کتابوں کے سلسلے میں اس نے مہا بھارت اور رامائن کا نام لیا ہے۔ جب وہ مختلف مواقع پر قدیم علوم اور فنون کے ضمن میں "ہندی حکما" (ص ۵۴۷) یا "ہندی حکیم" (جلد دوئم : ص ۲۰) کہتا ہے تو اس وقت بھی اس کے ذہن میں قدیم سنسکرت مصنفین ہوتے ہیں۔ اسی طرح "ہندی تاریخ" (ص ۵۴۸) کا عنوان قائم کر کے جو کچھ لکھا، وہ درحقیقت اسطور سازی کے بارے میں ہے۔ الغرض! اُردو زبان کے ہندی نام کے بارے میں ابوالفضل کی سند کوئی اتنی معتبر نہیں۔ البتہ "آئینِ اکبری" کی بدولت لاتعداد ایسے الفاظ محفوظ ہو گئے جو آج بھی یا توجوں کے توں بولے جاتے ہیں یا ان میں لہجہ یا املا کا معمولی سا تغیر ہوا۔ اسی سے حافظ محمود شیرانی نے یہ استدلال کیا کہ "ابوالفضل

جس زبان کو زبان ہندی دزبان روز گار کہہ رہا ہے۔ اس سے اس کی مراد یہی اُردو زبان ہے۔[۵]

مغل، ہندو اور ہندوی

بابر اور ہمایوں کو ہندوستان میں امن اور سکون سے رہنا نصیب نہ ہوا کہ سلطنت کی بنا استوار ہو رہی تھی، لیکن اکبر اعظم کا دور اس لحاظ سے بے حد اہم ہے کہ برصغیر کے مخصوص تمدنی اور مذہبی حالات، کی روشنی میں اپنائی گئی حکمت عملی سے مغل سلطنت کی مضبوطی اور مقبولیت کے ساتھ ساتھ اس کی حدود میں بھی وسعت ہوئی۔ سیاسی امور سے قطع نظر تہذیبی، تمدنی اور اسی لیے لسانی اعتبار سے بھی عہد اکبر بیحد اہمیت حاصل کرلیتا ہے۔ اس دور میں مختلف علاقوں کے باشندے اپنی اپنی زبانیں اور کلچر لیے مغل پرچم تلے اکھٹے ہو گئے اور یوں ان مشترک تہذیبی اقدار کی استوار ہوئی جن کے نتیجے میں گنبد پر کلس بنایا گیا اور ہندو شاعر نعت اور منقبت کہنے لگے۔[۶]

اس تہذیبی سنگم کی تشکیل میں بڑی حد تک صوفیاء اکرامؒ کی انسان دوستی اور روا داری نے اہم کردار ادا کیا چنانچہ "اردو زبان ہندوستانی کلچر اور صوفیائے اکرامؒ کے مصنف نثار احمد فاروقی کے بموجب "جکری" دراصل "ذکر" ہی کی ہندی شکل ہے۔ چشتی صوفیاء کی خانقاہوں میں قوالی کی محفل میں جکریاں گائی جاتی تھیں اسے کسی حد تک موجود ٹھمری کی بندش سے سمجھا جاسکتا ہے"۔[۷]

جہانگیر اور پھر شاہجہان کے عہد میں ایرانی ترکی اور ہندی کلچر کے امتزاج نے مصوری رقص، موسیقی اور تعمیرات میں جو جمالیاتی اضافے کیے۔ وہ پر تنوع ہونے کے ساتھ ساتھ تہذیبی اعتبار سے دور رس نتائج کے حامل بھی ثابت ہوئے۔ اس عہد میں برصغیر کے مختلف تمدنی رویوں اور تہذیبی روایات، نے خارجی (یعنی فارسی۔ ترکی اور عربی) اثرات کو جذب کرکے جس نئے تہذیبی تناظر کی تشکیل کی تاج محل اُردو زبان اور غزل اس کی اہم ترین

عطا ہیں اور یہی آج سلطنت مغلیہ کی علامات قرار دی جا سکتی ہیں۔
اس ساری تہذیبی صورتِ حال پر جگن ناتھ آزاد نے اپنی طویل نظم "اردو" میں یوں روشنی ڈالی ہے:

جہانِ علم پر چمکے مثالِ کہکشاں ہندی
حکومت کی زباں تھی فارسی اپنی زبان ہندی
ملے ہندوستانی سے جو باہم ترک و ایرانی
تو مشکل ہو گئی ایک دوسرے کی بات سمجھانی
بہت مشکل نظر آیا یہ باہم ربط کا عالم
"زبانِ یار من ترکی و من ترکی نمی دانم"
خلوصِ قلب سے لیکن یہ مشکل حل ہوئی آخر
نئی اک گفتگو کی طرز دونوں کو ملی آخر
وہ طرزِ گفتگو آزاد کچھ ایسی حسین نکلی
کہ ان دونوں زبانوں سے زیادہ دلنشیں نکلی
کیا اردو بالآخر وقت نے تجویز نام اس کا
مروت اس کا شیوہ تھا جہانگیری تھا کام اس کا

جہانگیر کے عہد تک اُردو زبان کے خد و خال نمایاں ہو رہے تھے بلکہ حافظ محمود شیرانی نے تو "تزکِ جہانگیری" کے کئی واقعات اور متعدد الفاظ کی بنا پر یہ دعویٰ کیا ہے کہ "ان میں سے اکثر الفاظ آج بھی اُردو زبان میں مستعمل ہیں۔ اس لیے ہم اس قیاس کے ترتیب دینے میں حق بجانب ہیں کہ یہ زبان جس کے ذخیرے سے جہانگیر بادشاہ یہ لفظ دے رہا ہے اُردو ہے اور اُردو ان ایام میں دربار اور اردوئے شاہی میں بولی جا رہی ہے۔"
حافظ محمود شیرانی نے اس ضمن میں معاصر شعرا کے کلام سے مثالیں پیش کرتے ہوئے

یہ نتیجہ اخذ کیا کہ "اُردو زبان مغل دربار میں ابتدا سے ہی موجود ہے۔ اس زبان کے سینکڑوں الفاظ مغلیہ مورخین نے اپنی فارسی تاریخوں میں استعمال کیے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان ان ایام میں اگرچہ تحریر میں نہیں آئی ہے لیکن مسلمانوں کے روزمرہ کی بول چال میں ملازموں، گھر کی عورتوں، مسافروں، پیشہ وروں، ہندوؤں اور غیر اقوام کے ساتھ برابر استعمال میں آ رہی ہے۔ اُردو کے تحریری نمونے جو اس عہد سے تعلق رکھتے ہیں آج دستیاب نہیں ہوتے اور نہ ان ایام میں اس زبان میں شعر و ادب پیدا کرنے کی کوشش کی گئی۔ البتہ گاہے ماہے بعض اہل قلم نے تفنناً جو کچھ کچھ لکھا ہے۔ مثلاً بابر کا شعر، جمالی اور نوری کے ریختے سید مبارک اور علامہ سعد اللہ خاں کے فقرے اور سب سے آخر میں محمد افضل کی بکٹ کہانی ہے جو ہمارے سامنے ان ایام کی اُردو کے نمونے پیش کرتی ہے۔" 9

زبان کی تشکیل کے ضمن میں برصغیر کی وسعت کے ساتھ یہ امر بھی ذہن نشین رکھا جائے کہ جغرافیائی حالات اور طویل فاصلوں کی بنا پر تہذیبی اور تمدنی اعتبار سے بعض علاقے ایک دوسرے سے اتنے دور تھے گویا جداگانہ ملک ہوں۔ کشمیر، پنجاب، بہار، مدراس، بنگال اور مہاراشٹر وغیرہ یہ سب ایک ملک کے حصے ہونے کے باوجود بھی اپنی انفرادیت میں چھوٹے چھوٹے ممالک محسوس ہوتے ہیں لیکن صرف اردو ہی ایسی زبان تھی جو ان میں رابطہ کا ذریعہ بنی۔

ہندی کے مختلف نام

شمالی اور جنوبی ہند کو جس طرح کوہ بندھیاچل نے الگ کیے رکھا اس سے فطری طور پر برصغیر دو جداگانہ خطوں میں تقسیم ہو گیا جس کے نتیجہ میں تمدنی اقدار میں اساسی نوعیت کا اتنا بُعد پیدا ہو گیا کہ آج بھی ایک دھرم کا ہونے کے باوجود شمالی اور جنوبی ہند کا ہندو الگ نظر آتا ہے۔ جب آج یہ حال ہے تو قدیم زمانے میں ان علاقوں کے جداگانہ تمدن

اپنانے کی وجوہات سمجھنی دشوار نہیں۔ اس تناظر میں زبان کا مطالعہ کرنے پر تشکیلی مراحل میں اس کے ابتدائی نقوش کی تلاش سے وابستہ دشواریوں کا باآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اُردو کے ہندی نام کے سلسلے میں بھی یہی دشواری پیش آتی ہے۔ کیوں کہ ہر خطہ نے اسے اپنے نام کی مناسبت سے نیا نام دے دیا مثلاً دکن میں اسے دکنی کہا گیا تو گجرات میں گجراتی۔ گجری یا بولی گجرات۔ یہ نئی زبانیں نہ تھیں بلکہ مقامی نام اپنائے ہوئے اُردو ہی تھی۔ جس کے ان علاقوں میں فروغ کے بارے میں ڈاکٹر جمیل جالبی کہتے ہیں:

"مشترک کلچر کے لیے رابطے کی ایک مشترک زبان چونکہ ایک بنیادی شرط ہے۔ دکن و گجرات کی ان مختلف زبانوں کے علاقے میں اُردو زبان کی حیثیت ایک مشترک بین الاقوامی زبان کی تھی اور آبادی کے مختلف عناصر کے درمیان اس کو استعمال کیے بغیر کوئی اور راستہ نہ تھا۔ اس لیے یہ زبان یہاں خوب پھلتی پھولتی رہی"۔[2]

ہندی / ہندوی قدیم اُردو کا مقبول نام رہا ہے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ بعض ماہرین کی دانست میں یہ صرف اس زبان کے استعمال کے لیے مخصوص نہیں رہا جیسے ہم اردو کہتے ہیں بلکہ مختلف اوقات میں ہندوستان کے مختلف علاقوں کی بولیاں (جیسے کھڑی بولی، گجری، دکنی، ماگھدی وغیرہ) اس نام سے موسوم کی جاتی رہی ہیں بلکہ ڈاکٹر جمیل جالبی نے تو ہندی کے اردو سانچے میں ڈھلنے کے زمانے کی تخصیص بھی کردی ہے انہوں نے اپنی تاریخ ادب اُردو" (جلد اوّل) میں جنوبی ہند میں بیجاپور کے عادل شاہی دورِ حکومت (۱۶۸۵ تا ۱۴۹۰ء) میں سلطان محمد عادل شاہ (۵۶-۱۶۲۷ء) کے عہد میں (۴۰ - ۱۶۲۷ء) میں کی گئی تحقیقات کے لسانی تجزیہ کی بنا پر یہ نتیجہ اخذ کیا ہے:

"اس دور کا اہم اور بنیادی رجحان یہ ہے کہ فارسی اثرات بیجاپور کے ہندوی اسلوب پر تیزی سے غالب آرہے ہیں اور ہندوی اصناف و

اوزان کی جگہ فارسی اصناف و بحور رمزیات وتراکیب اور اسالیب کی جگہ اصناف اور اسالیب بیان لے رہے ہیں ۔" (ص ۲۳۴)

جب یہ طے پا گیا کہ مختلف علاقوں میں مختلف ناموں کے باوجود بھی اُردو ہندوی یا ہندی تھی تو پھر کونسی زبان اصل ہندی ٹھہری ؟ ڈاکٹر رام آسرا راز کے الفاظ میں " انیسویں صدی عیسوی سے پہلے ہندی کسی بھی مخصوص زبان کا نام نہ تھا۔ ملک کے مختلف علاقوں صوبوں اور بلکہ ان کے مختلف ضلعوں میں بولی جانے والی بولیوں اور زبانوں مثلاً پنجاب کے علاقہ ملتان میں لھندا ۔ سندھ میں سندھی ، لاہور میں لاہوری آگرہ اور متھرا کے علاقے میں برج بھاشا اودھ کے دیہات میں اودھی یا پوربی حصار رہتک میں ہریانی ، بگھیل کھنڈ میں بگھیل کھنڈی جین میں جینی ، مارواڑ میں مارواڑی بیکانیر میں بیکانیری جے پوری ، بہار اور پٹنہ میں مگدھی وغیرہ سبھی ہندوستان کی بولیوں اور زبانوں کی نسبت سے ہندی کہلاتی تھیں ، اُردو کی بنیاد بھی چونکہ ہندوستان کی ہی بولیاں تھیں اس نسبت سے اُردو بھی ہندی کے نام سے موسوم کی جاتی تھی "[۱۱]

ڈاکٹر راز کے بقول " عرف عام میں ہندی صرف دو ہی بولیوں کو تسلیم کیا جاتا تھا، پہلی برج بھاشا جو شری کرشن کی سرزمین متھرا اور اس کے گرد و نواح میں بولی جاتی تھی ۔ دوسری اودھی جو اودھ کے راجہ شری رام چندر جی کی راجدھانی اجودھیا کی بولی ہے ۔ ...... ہندو کے مذہبی نقطہ نظر سے یہ دونوں بولیاں بہت مقدس سمجھی جاتی ہیں ۔"[۱۲]

شاید اسی لیے میرؔ نے یہ کہا :

کیا جانوں لوگ کہتے ہیں کس کو سرورِ قلب

آیا نہیں ہے لفظ یہ ہندی زباں کے بیچ

الفریڈ ماسٹر لندن کا ایک مضمون " اُردو کی ابتدا " اس لحاظ سے قابلِ توجہ ہے کہ اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ کس کس نے سب سے پہلے اُردو کے مختلف ناموں میں امتیاز کیا ۔ ان

کے بقول کول بروک پہلا شخص ہے۔ جس نے ۱۸۰۱ عیسوی میں ہندی اُردو اور عوامی ہندوستانی میں فرق کیا اس سے قبل ۱۷۸۰ء میں گل کرسٹ ہندوستانی کے الفاظ کو عربی، فارسی اور ہندوی میں تقسیم کر چکا تھا۔ کھڑی بولی کا (ادبی) اظہار ۱۸۰۳ء عیسوی میں ہوتا ہے اور ۱۸۱۱ عیسوی میں للولال جی کوی اس کو بے میل ہندی قرار دیتے ہیں۔ اور اس کا مقابلہ ریختہ یا اُردو سے کرتے ہیں۔ مصنف اپنی بات جاری رکھتے ہوئے استدلال کرتا ہے "ہندوی کے متعلق یہ کہنا صحیح نہ ہوگا کہ وہ ایک شہر میں پیدا ہوئی مثلاً قنوج میں جیسا کہ کول برک نے کہا ہے۔ دہلی میں جیسا کہ گریرسن نے کہا ہے یا لاہور میں جیسا کہ گراہم بیلی نے کہا ہے اور نہ وہ برج سے پیدا ہوئی جیسا کہ للولال جی نے رائے ظاہر کی ہے بلکہ یہ کہنا زیادہ قرین حقیقت ہے کہ وہ آریائی ہندوستان کے تمام شہروں میں پیدا ہوئی اس کی لفظی ساخت یکساں تھی اور اس کے ذخیرۂ الفاظ میں مقامی بولیوں کی آمیزش تھی۔ اصل میں یہ کاروبار کی زبان تھی جیسا کہ ڈاکٹر سنیتی کمار چیٹرجی نے کہا ہے۔ گریرسن نے جس مقامی زبان ہندوستانی کا ذکر کیا ہے وہ اُردو کی بنیاد نہیں تھی۔ بلکہ مسلمانوں کے رہنے اور بسنے کے نتیجے میں وجود میں آئی تھی۔ ہندوی سے پہلے اپ بھرنش کاروباری زبان تھی اور اس کو یہ شرف تیرھویں صدی تک حاصل رہا۔ اور وہ اسی طرح ممتاز اور ممیز تھی جیسے کہ بعد میں ہندوی اٹھارہ دیش بھاشاؤں میں ممتاز و ممیز ہوگئی اگرچہ یہ نام پراکرت اور بھاشا کی طرح بہت عرصے تک بغیر کسی قید اور تعین کے ہر بولی کے لیے استعمال ہوتا رہا۔"[۱۳]

خسرو: مشترک لسانی کلچر کی علامت

امیر خسرو نے مثنوی "نہہ سپہر" میں جہاں ہندوستان کی متعدد خصوصیات کا تذکرہ کیا وہاں اس امر پر بطورِ خاص زور دیا کہ دیگر زبانیں بولنے والے افراد یہاں کی ہندی نہیں بول سکتے، لیکن ہندوستانی تمام زبانیں بولنے پر قادر ہیں۔

"خطائی مغل ترک عرب سب کے سب
ہندی زبان میں دوختہ لب ہیں

"ہم (ہندوستانی) نہایت راستی سخن کے ساتھ ہر ملک کے لوگوں کی بولیاں بول لیتے ہیں اور اس خوبی کے ساتھ کہ جس طرح چرواہا اپنے جانوروں کی شناخت اور رہنمائی کرتا ہے۔ یہ مثل اس لیے صادق آتی ہے تاکہ ہم دوسرے ملکوں کا سفر کر سکیں (اور وہاں کی باتیں آسانی سے بول سکیں) دوسروں میں یہ طاقت نہیں ہے کہ کبھی اس توانائی (صحت کے ساتھ) اس جانب نگاہ کر سکیں"۔[۱۴]

اس کے بعد ایک مقام پر یہ عنوان قائم کیا ہے:

"اس مثبت دلیل میں کہ گفتگو ہند (زبان) ہندی کو اپنے خوشگوار الفاظ کی بنا پر ترکی و فارسی زبان پر ترجیح ہے"۔ (ترجمہ محمد رفیق عابد)

امیر خسرو نے اپنے دیوان "عزۃ الکمال" (۶۹۳ھ) کے آخر میں لکھا ہے:

چو من طوطی ہندم از راست پرسی
ز من ہندی پرس تا نغز گویم

اس دیوان کے دیباچہ میں وہ مزید رقمطراز ہیں:

ترک ہندوستانیم من ہندوی گویم جواب
شکری، مصری، ندرم کو عوب گویم سخن
جزوے چند نظم ہندوی نیز نثر دوستاں
کردہ شدہ است اینجا ہم بہ بگوی
بس کردم و نظر برنداشت کہ لفظ ہندوی
در پارسی لطیف اور دن چنداں لطفی

ندارد مگر لبضرورت آں جاکہ ضرورت

بودہ است آوردہ شدہ"

امیر خسرو کی مثنوی "نہہ سپہر" کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس میں ایک مقام پر انھوں نے ہندوستان میں مروج زبانوں کا تذکرہ یوں کیا ہے:

سندی و لاہوری و کشمیر و کبر

دھور سمندری تلنگی و گجر

معبری و گوری و بنگال و اودھ

دہلی و پیرامنش اندر ہمہ حد

ایں ہمہ ہندوست ز ایام کہن

عامہ بہ کارست بہ ہر گو نہ سخن

اس ضمن میں ڈاکٹر گوپی چند نارنگ نے اس رائے کا اظہار کیا ہے: "ان اشعار میں امیر خسرو نے جن بارہ زبانوں کا ذکر کیا ہے پانچویں مصرعے میں ان سب کو ہندوی کہا ہے گویا خود امیر خسرو کی زبان دہلی کا باشندہ ہونے کے ناطے "دہلوی ہندوی" ہوتی جو اس فہرست کی بارھویں زبان ہے اور جس کو خسرو دہلی اور پیرامنش دہلی کی زبان بتاتے ہیں۔ گویا امیر خسرو نے جس ہندوی اردو یا ہندوستانی میں شعر کہے ہیں اس کو "دہلوی ہندوی" کہنا چاہیے۔" [15]

ان زبانوں کی تفصیل یوں ہے۔ سندی (سندھی) لاہوری (پنجابی) کشمیر (کشمیری) کبر (ڈوگری) دھور سمندری (تامل) تلنگی، گجر (گجری، گجراتی) معبر (گھاٹی) گوری (پہاڑی) بنگال (بنگلہ) اودھ (اودھی) دہلی (ہندوی)

مثنوی "نہہ سپہر" میں امیر خسرو نے ہندوی کے ضمن میں یوں لکھا:

" ہند کی زبانوں پر بھی اس قاعدہ کا اطلاق ہوتا ہے۔ پرانے

زمانے میں یہ ہندوی زبان کہلاتی تھی —— غزنویوں اور ترکوں کی آمد ہوئی تو ان کی ظاہری و باطنی زبان فارسی تھی —— جب اہل ملک کے چھوٹے بڑے ان سے گھل مل گئے تو ہر شخص نے اچھی بری فارسی سیکھ لی اور اس کے علاوہ جو زبانیں یہاں تھیں وہ اپنی حدود سے باہر (یعنی علاقوں سے باہر) راہ نہ پا سکیں —— الغرض اگر ہم فارسیوں، ترکوں اور عربوں سے انساط دلی حاصل کرنے کی کوشش کریں تو لغو ہوگا۔[۱۶]

"بخالِ ہندوش"

جہاں تک لفظ ہند یا ہندو کا تعلق ہے تو لغت میں ہندو کے معنی چور غلام کافر اور معشوق کے ہیں۔ اگر مسلم حملہ آوروں اور پھر حکمرانوں کو مقامی آبادی چور غلام یا کافر نظر آئی تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے کہ حاکموں کو محکوم ایسے ہی نظر آتے ہیں اور جہاں تک معشوق کا تعلق ہے تو یقیناً یہاں کے سانولے حسن نے دلوں پر قیامت ڈھائی ہے:

بخالِ ہندوش بخشم ثمرقند و بخارا را

اویس احمد ادیب کی کتاب "تنقیدی مطالعے" (ص ۷۷) میں ایک مقالہ بعنوان "ہندو اور ہندوستان کی لسانی تحقیق" شامل ہے جس میں انہوں نے ٹھاکر جے آر۔ رائے کے ایک مضمون "تاریخ ہند" (زمانہ جولائی ۱۹۴۵ء) سے یہ دلچسپ اقتباس درج کیا ہے:

> "علمائے مغرب اور ان کے نقش قدم پر چلنے والے ہندو اہل قلم یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہندو لفظ سندھ سے بگڑ کر بنا ہے کیوں کہ ایران میں س کو ھ سے بدل ڈالتے ہیں، مگر اصل یہ ہے کہ ہندو لفظ سنسکرت کے لفظ اندو (چاند) سے بگڑ کر بنا ہے جو قرین قیاس ہے کہ عوام کی زبان میں اندو سے ہندو آسانی سے بن جاتا ہے .... لفظ ہندو سے شرمانے کی کوئی وجہ

نہیں ۔ فارسی اور اُردو لغات میں اس لفظ کے کچھ ہی معنی ہو ۔لیکن یہ سنسکرت کا لفظ اندو بمعنی چاند ہے ۔ جو اپنے اندر زبردست تاریخی یادگار لیے ہوئے ہیں۔"

ڈاکٹر سہیل بخاری کی دانست میں زبان کے لیے ہندی نام نسبتی ہے" جو مسلمانوں نے ہندوستان سے بنایا اور ہندوستان کی دیسی یا مقامی زبان کے لیے استعمال کیا ہے۔ اس لیے آج جو لوگ اس لفظ سے ہر جگہ صرف ایک ہی مخصوص بولی مراد لیتے ہیں، وہ غلطی پر ہیں۔ مسعود سعد سلمان کے ہندی دیوان کی بولی امیر خسرو کی ہندی سے اور ملک محمد جائسی کی ہندی امیر خسرو کی ہندی سے مختلف زبان ہے" [۱۲]

میر اثر ... اپنی مثنوی "خواب و خیال" (۱۱۵۲ھ) میں جہاں اپنی زبان کو ریختہ کہتے ہیں وہاں ہندوی بھی کہا ہے ۔ ملاحظہ ہو شعر:

فارسی سو ہیں ہندوی سو ہیں
باقی اشعار مثنوی سو ہیں

میر تقی میر نے اپنا تذکرہ "نکات الشعرا" (۱۱۶۲ھ) میں مکمل کیا تو ترقیمہ میں یوں لکھا:

"تمام شد نکات الشعرا ہندی" [۱۳]

ڈاکٹر سہیل بخاری نے "اُردو کا روپ" میں متعدد ذرائع سے حاصل کردہ معلومات کی روشنی میں ہندی اور ہندوی نام کی جو مثالیں جمع کی ہیں ۔ان میں سے بعض پیش ہیں ۔ شاہ عبدالقادر دہلوی نے قرآن مجید کے ترجمے کو" زبان ہندی میں" قرار دیا، میر نے تذکرہ" نکات الشعرا" میں سودا کے لیے لکھا:

سر آمد شعرائے ہندی اوست

جبکہ میر حسن اُردو شعرائے کے تذکرے کو" تذکرہ سخن آفرینیاں ہندی زبان" کہتے ہیں ۔ اسی طرح مصحفی نے تذکرہ" ریاض الفصحا" کو" تذکرہ ہندی گویاں" کہا ہے جبکہ ڈاکٹر گلکرسٹ کی دو کتابوں کے نام" بیاضِ ہندی" اور" اتالیقِ ہندی" ہیں ۔ وہ مزید رقم طراز ہیں کہ" عرب والے

ہندوستان کی ہر بولی کو ہندی یا ہند یا کہتے تھے۔"

مولانا سید سلیمان ندوی کہتے ہیں کہ "اہل عرب یہاں کی قدیم زبانوں میں سے ہر ایک کو ہندی یا ہندیا کہتے تھے۔ وہ سنسکرت یا پالی سندھی ملتانی گجراتی سب کو ہندی ہی کہتے تھے۔" (عجائب الہند: ص ۳)۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے ہندوی کے ضمن میں یہ لکھا ہے: "یہ بول ہندی ہی کا بدلا ہوا روپ ہے جس میں واؤ نے ہمزہ کی جگہ لے لی ہے۔ یعنی ہندوی = ہند + وی (ای) اردو میں ایسے اور بھی بول پائے جاتے ہیں۔ جیسے منتری اور منتروی۔ ہنڈی یا ہنڈوی۔ کھنڈی اور کھنڈوی۔ انڈی اور انڈوی۔ گڑی اور گڑوی جن کے ایک روپ میں ہمزہ اور دوسرے روپ میں واؤ ملتا ہے۔"

ہندوستانی:

جب انگریزوں کی سیاسی (اور کسی حد تک لسانی) پالیسی کے نتیجے میں نفاق کے بوئے ہوئے بیج کانٹوں بھری فصل لاتے تو اگر ایک طرف ہندو مسلم اتحاد پارہ پارہ ہوا اور نسلی اور مذہبی فسادات عام ہوئے تو دوسری طرف بعض رہنماؤں نے دیگر امور کے ساتھ ساتھ زبان کے اشتراک سے اس نفاق کو اتحاد میں تبدیل کرنے کی کوشش کی اور اس مقصد کے لیے اُردو اور ہندی دونوں ترک کر کے ہندوستانی اپنانے کی تلقین کی گئی۔ مہاتما گاندھی اس کے پرچارک تھے۔ پریم چند اس کے حامی تھے۔ انہوں نے ایک مضمون "اُردو ہندی ہندوستانی" (زمانہ ۱۹۳۵ء) میں بڑے پُرجوش انداز میں لکھا:

"اُردو اور ہندی کی نوعیت جدا ہے، یہاں تو دونوں ہی ہندوستان کی قومی زبان کہلانے کی مدعی ہیں مگر چونکہ اپنی انفرادی صورت میں دو قومی ضرورتوں کی تکمیل نہ کرسکیں اس لیے اضطراری طور پر خود بخود ان کے استحصال کا عمل شروع ہو گیا اور وہ متحدہ صورت پیدا ہو گئی جسے ہم ہندوستانی زبان کہنے میں حق بجانب

ہیں .... جس طرح انگریزوں کی زبان انگریزی ۔جاپان کی جاپانی ۔چین کی چینی اسی طرح ہندوستان کی قومی زبان کو اسی وزن پر ہندوستانی کہنا مناسب ہی نہیں بلکہ لازمی ہے ۔اگر اس ملک کو ہندوستان نہ کہہ کر صرف ہند کہیں تو اس کی زبان کو ہندی کہہ سکتے ہیں ،لیکن اس کی زبان کو اُردو تو نہیں کہا جاسکتا، تاوقتیکہ ہم ہندوستان کو اردوستان نہ کہنے لگ جائیں ۔جواب ممکنات سے خارج ہے .... بہرحال ہندوستان کی قومی زبان نہ اُردو ہے نہ ہندی بلکہ ہندوستانی ہے جو سارے ہندوستان میں سمجھی جاتی ہے اور بڑے حصّے میں بولی جاتی ،لیکن لکھی کہیں نہیں جاتی اور اگر کوئی کہنے کی کوشش کرتا ہے تو اُردو اور ہندی کے ادیب ٹاٹ باہر کر دیتے ہیں"۔[19]

زبان کے لیے" ہندوستانی" نام کے سیاسی مضمرات کے لیے ملاحظہ ہو "نگار پاکستان" کراچی جنوری ۱۹۸۵ء کا شمارہ جس میں ڈاکٹر تارا چند، ڈاکٹر مولوی عبدالحق ، بابو راجندر پرشاد ، ڈاکٹر ذاکر حسین پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی آصف علی خاں اور مدیر ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مقالات شامل ہیں۔

کانگرس نے اُردو کا نام بدلنے کی جو تحریک شروع کی اس کا پس منظر سیاسی تھا اور یہ ان انتہا پسند اور متعصب ہندوؤں کو خوش کرنے کی ایک کوشش تھی جو اُردو کے نام سے خار کھائے تھے ۔اس کا ردّعمل بھی خاصہ شدید ہوا اور مسلمان اہل قلم نے اس کی مخالفت کی لیکن "ہندوستانی" نام کی بحث سے یوں محسوس ہوتا تھا گویا اُردو کو پہلی مرتبہ یہ نام دیا جارہا ہو حالانکہ حقیقت حال برعکس ہے۔لسانیات کے مباحث سے آگاہ حضرات اس حقیقت سے واقف ہیں کہ صدیوں قبل اُردو کو "ہندوستانی" بھی کہا گیا اور یہ غیر منطقی نہ تھا۔

اگر اُردو زبان کو ہند کی نسبت سے ہندی[21] یا ہندوی کہا جاسکتا ہے تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ ہندوستان کی مناسبت سے اسے "ہندوستانی" نہ کہا جاتا۔قدیم کتب کا جائزہ لینے پر ہندوستانی

کی متعدد مثالیں مل جاتی ہیں جن میں سرِفہرست تزکِ بابری ہے، بابر رقمطراز ہے:

"میں نے اُسے (دولت خان لودھی کو) اپنے سامنے بٹھایا اور اس کو یکالیقین دلانے کے لیے ایک شخص کے ذریعے جو ہندوستانی زبان جانتا تھا ایک جملے کا مطلب واضح کروایا۔"[۲۲]

گولکنڈہ کے قطب شاہی عہد کے ملا وجہی کی "سب رس" (۱۰۴۵ھ/۱۶۳۵ء) ہندوستانی کے استعمال کے سب سے معروف حوالے کی حیثیت رکھتی ہے وجہی نے اس مشہور تمثیلی قصے کا عنوان یوں قائم کیا تھا:

"آغاز داستان زبانِ ہندوستان"

اور کہانی کا آغاز یوں کیا:

"نقل ایک شہر تھا اس کا سیستان"

اُردو کو ہندوستان کہنے کی یہ مثال قدیم بھی ہے اور معروف بھی، لیکن میری ناقص رائے میں اُسے بطور مثال پیش کرنے والے محققین اور ماہرین لسانیات نے وجہی کی اس عبارت کو اس کی ظاہری حالت میں تسلیم کرلیا۔

یعنی مصنف کی "نیت" پر غور نہ کیا یہ سب جانتے ہیں کہ "سب رس" مقفیٰ اور مسجع اسلوب میں قلم بند کی گئی تھی۔ اس لیے یہ شبہ ہوتا ہے کہیں ایسا تو نہیں کہ داستان اور سیستان کی رعایت سے اس نے زبان ہندوستان کہہ دیا ہو جیسے اس نے "سب رس" کی توجیح کی یہ کہہ کر:

"اس کتاب کا ناؤ سب رس سب کو پڑھنے آوے ہوس بول بول کوں چڑھے آس یادگار ہو اچھے گاہ دنیا میں کئی لاکھ برس۔"

اس قیاس کو اس امر سے مزید تقویت ملتی ہے کہ مُلا وجہی نے ایک اور موقعے پر زبان کے لیے ہندی کا لفظ بھی استعمال کیا ہے:

"آج لگن اس جہان میں ہندوستان میں ہندی زبان سوں اس
لطافت اس چھنداں سوں نظم ہور نثر ملا کر گلا کر نہیں بولیا۔"

ادھر جب شمالی ہند میں اُردو کی پہلی نثری کتاب فضلی کی "کربل کتھا" (دہ مجلس ۱۱۲۵ھ/ ۳۳-۱۷۳۲ء) لکھی گئی تو فضلی نے اپنے اس ترجمے ("انوارِ سہیلی" از ملا حسین بن علی الواعظ الکاشفی) کو ہندی قرار دیا۔

"یہ ترجمہ فارسی کا ہندی از فہم و ذکاے ہوش مندی۔"[۲۳]

انہوں نے ترجمہ کی وجہ بتاتے ہوئے لکھا کہ انوارِ سہیلی فارسی میں تھی اور فارسی سے نابلد خواتین مطالب نہ سمجھ پاتیں اور رونے کے ثواب سے محروم رہتیں۔ اس لیے انہوں نے اس کا ترجمہ کیا۔ وہ لکھتے ہیں:

"اگر ترجمہ اس کتاب کا رنگین عبارت و حسنِ استعارات ہندی قریب الفہم عامہ مومنین و مومنات کیجیے۔"

انہیں اس ترجمے پر فخر ہے:

"پیش ازیں کوئی اس صنعت، کا نہیں ہوا۔ مخترع اور اب تک ترجمہ فارسی بہ عبارت ہندی نہیں ہوئے۔"[۲۴]

اسی طرح نظرِ ثانی (۱۱۶۱ھ) کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا:

"نظرِ ثانی کر بجمیت و کیفیت مضامین بہ ہندی ...."[۲۵]

بہر حال وجہی کی "سب رس" سے قطع نظر ہندوستانی کے ضمن میں ڈاکٹر سہیل بخاری نے مختلف کتابوں کی مدد سے جو شواہد جمع کیے ہیں ان کی رو سے:

۱۔ یہ نام سب سے پہلے عبدالحمید لاہوری کے "بادشاہ نامہ" کی دوسری جلد میں ملتا ہے۔ اس میں شاہ جہان کے درباری گوئے مغل خان کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے: "دریں عہد سعادت مہر سر آمد نغمہ سرائیاں ہندوستان زبان است۔"

۲۔ نواب صدر جنگ بہادر کہتے ہیں: "سب سے پہلے پرتگیزوں نے سترویں صدی عیسوی میں ہماری زبان کا نام انڈوستان رکھا یہ وہ زمانہ ہے کہ مسلمان مور کہلاتے تھے۔ اسی صدی میں زبان کو انڈوستانی بول جاتے تھے۔ مور بھی کہہ دیتے تھے۔ ۱۶۹۰ء میں ہندوستانی زبان (HINDOSTANI LANGUAGE) کا لفظ پایا جاتا ہے۔ ۱۷۲۶ء میں ایک مورخ لکھتا ہے:

"یہاں کی (ہندوستانی) زبان ہندوستانڈ (HINDOSTAND) یا مورز ہے۔"

۳۔ گلکرسٹ نے اپنی ڈکشنری کا نام انگریزی ہندوستانی رکھا ہے۔

۴۔ میرامن باغ وبہار کے دیباچے میں کہتے ہیں: "جان گل کرسٹ صاحب نے ..... فرمایا کہ قصے کو ایسی ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اُردو کے لوگ ہندو مسلمان عورت مرد لڑکے بالے خاص وعام آپس میں بولتے چالتے ہیں۔ ترجمہ کرو۔"

۵۔ گارسن دتاسی بھی اسے ہندوستانی کہتا ہے: "حضرات لفظ ہندوستانی جیسا کہ میں متعدد بار آپ سے عرض کر چکا ہوں ...."

۶۔ گریرسن نے بھی اس بولی کو ہندوستانی کہا ہے۔[۲۶]

الغرض اس انداز کی متعدد مثالیں مل سکتی ہیں لیکن یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ مُلّا وجہی کی استثنائی مثال سے قطع نظر زبان کے لیے لفظ ہندوستانی غیر ملکیوں نے ہی استعمال کیا کیوں کہ یہ یورپین زبانوں (انگریزی، فرانسیسی یا ڈچ) کے مزاج کے عین مطابق تھا بلکہ ادیس احمد ادیب نے تو یہ دعویٰ بھی کیا ہے اُردو زبان کے لیے سب سے پہلے ہندوستانی لفظ گلکرسٹ نے ۱۷۸۷ء میں استعمال کیا تھا۔[۲۷]

لیکن حقیقت برعکس ہے کہ گل کرسٹ سے بھی قدیم تر شواہد پیش کیے جا چکے ہیں اس لیے اس ضمن میں اس کی اوّلیت تسلیم نہیں کی جا سکتی، حالانکہ اس کے اپنے بیانات سے تو یہی

محسوس ہوتا ہے کہ گویا یہ نام اسی کی ایجاد ہے۔ جیسا کہ اس نے "قصص ہند" کے دیباچے میں لکھا:

"میں نے ہندوستانی کی تعریف یہ کی کہ وہ ایسی زبان ہے
جس میں ہندی، عربی اور فارسی کی آمیزش برابر تناسب
سے ہو۔"

گل کرسٹ ۱۷۹۶ء میں "ہندوستانی گرائمر" کلکتہ سے طبع کرا چکا تھا۔

اُردو کے لیے "ہندوستانی نام" "HINDOOSTANEE" کے ضمن میں مزید شواہد ہیں:

کیپٹن جوزف ٹیلر کی مدون کردہ ڈکشنری جب ۱۸۰۸ عیسوی میں چھپی تو اُردو کو "ہندوستانی" قرار دیا گیا۔ جان شیکسپیئر نے اپنی لغت کو "HINDUSTANI AND ENGLISH" کہا۔ جبکہ دیباچے میں اس نے اُردو کو ہر جگہ "ہندوستانی" لکھا ہے۔ ڈاکٹر ہیرس (HARRIS) بھی یہی لکھتا ہے۔ ملاحظہ ہوں اس کی یہ دو ڈکشنریاں:

1. "DICTIONARY: ENGLISH AND HINDOSTANY" MADRAS, 1970
2. "AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF THE HINDUSTANY LANGUAGE AS SPOKEN IN THE CARNATIC", MADRAS, 1824.

اسی طرح جان جوشوا کیٹلر کی قواعد ۱۷۱۵ء اور شلز کی قواعد (۱۷۴۵ء) میں بھی اُردو کو "ہندوستانی" ہی کہا گیا ہے۔

اُردو کے لیے "ہندوستانی" نام انگریزوں کو بہت مرغوب رہا ہے۔ مندرجہ بالا تمام حوالے تو ڈیڑھ دو صدی پرانے ہیں جبکہ اُردو قواعد اور لغت کے بارے میں نہ تو اساسی نوعیت کا مواد موجود تھا اور نہ ہی کسی کو لسانی تحقیقات کی شد بُد تھی اس لیے جس نے جو کچھ لکھ دیا وہ اگر سند نہ بنا تو بربنائے قدامت حوالہ تو ضرور ہی قرار پا گیا تعجب تو اس وقت ہوتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ انگریزی میں مختصر تاریخِ ادبِ اردو کا مؤلف ڈاکٹر گرام بیلی اپنی وفات ۱۹۴۲ء

تک اُردو کو ہندوستانی ہی کہتا رہا۔ اس کے انتقال کے بعد "TEACH YOURSELF HINDUSTANI" (۱۹۵۱ء) طبع ہوئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس کے کاغذات سے اس کتاب کو ترتیب دینے والے مرتبین پروفیسر جے۔آر۔فرتھ (PROF. J.R. FIRTH) اور اے۔ایچ۔ہارلے [۲۸] (A.H. HARLEY) نے بھی دیباچے میں ہر موقع پر "آج کی دنیا کی عظیم زبانوں میں سے ایک زبان" کو ہندوستانی ہی لکھا ہے (دیباچہ از جے۔آر۔فرتھ) لیکن جب وہ رسم الخط کی بات کرتا ہے تو "URDU SCRIPT" لکھتا ہے۔

اب جب کہ جدید دور کے انگریز مصنفین کا تذکرہ ہو رہا ہے تو ایک اور کتاب کا ذکر بھی سن لیجیے جس میں اُردو کو واقعی اُردو ہی کہا گیا ہے یہ ہے:

"A TEXT BOOK OF URDU PROSODY AND RHETORIC"
BY CAPT. G. D PYBUYS. LONDON, 1924

ریختہ:

ریختہ کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

غالب کا یہ مشہور شعر سب نے سن رکھا ہے اور اسے بالعموم اس امر کی شہادت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے کہ کسی زمانے میں اُردو کو ریختہ بھی کہتے تھے اور یہ نام عہدِ غالب تک مستعمل بھی تھا۔ ریختہ کے ضمن میں غالب کا ایک اور شعر بھی پیش کیا جا سکتا ہے:

جو یہ کہے کہ ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی
گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کے اسے سنا کہ یوں

ریختہ کی تعریف پر غور کرتے ہوئے اس کے عمومی مفہوم کے ساتھ اُردو کے قدیم نام کے طور پر اس کا مطالعہ کیا جائے تو دلچسپ صورتِ حال نظر آتی ہے۔

حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات سے یہ احساس ہوتا ہے کہ بابر کے زمانے سے ہی اردو فارسی اور ترکی زبانوں کی آمیزش یعنی ریختہ کا آغاز ہو چکا تھا۔ چنانچہ انہوں نے بابر کی ترکی زبان کا یہ شعر نقل کرنیکے بعد اس کے بارے میں ڈاکٹر ڈینی سن راس کی رائے بھی درج کی ہے:

"مجکا نہوا کچھ ہوس مانک و موتی
فقرا هلیفہ بس بولغوسیہ در پانی و روتی

پہلا مصرعہ تو بالکل صاف ہے جیسے آج کل ہم لکھیں گے":

مجھ کو نہ ہوئی کچھ ہوس مانک و موتی

یعنی مجھ کو لعل و موتیوں کی آرزو نہیں ہے۔ دوسرے مصرعے کے معنی ڈاکٹر ڈینی سن راس نے یوں بیان کیے ہیں:

"فقیروں کے لیے صرف روٹی اور پانی کفایت کرتے ہیں"۔

ڈاکٹر ڈینی راس اپنے دیباچے میں اس شعر کے متعلق کہتے ہیں:

"اس شعر میں ہم اُردو اور ترکی زبانوں کا ایک غیر معمولی اتحاد مشاہدہ کرتے ہیں فارسی اور اُردو کے مخلوط اشعار ایک زمانے میں نہایت عام تھے۔ جن سے ریختہ کی اصطلاح جس نام سے پرانی اُردو شاعری معروف ہے رواج پذیر ہوئی"۔[۲۹]

ڈاکٹر ڈینی سن راس نے دیوان بابر رسالہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال (۱۹۰۰ء) میں شائع کرایا تھا۔

بابر اور مغلوں کی اپنی زبان اور اہل ہند پر اس کے اثرات کے بارے میں ماسکو یونیورسٹی کے ایک محقق خال میرزالف تاش مرزا کے بموجب بابر کے زمانے میں وسطی ایشیا کے علوم کی زبان عربی سمجھی جاتی تھی۔ دربار کی زبان فارسی تھی جس میں شعر و شاعری ہوتی تھی، اور سارا سرکاری

کام بھی ہوتا تھا اور کئی بادشاہوں مثلاً بابر کے گھر کی زبان ترکی تھی - بابر اور اس کے رفقار، فرغانہ کے باشندے ہوتے ہوئے بھی اپنی مادری زبان اچھی طرح جانتے اور بولتے تھے[۱۹]

لغات میں ریختہ اور اس سے متعلق دیگر الفاظ کے متنوع معنی سے جو مفہوم مرتب ہوتا ہے اسے مولانا محمد حسین آزاد کی آبِ حیات کے الفاظ میں یوں بیان کیا جا سکتا ہے :

"مختلف زبانوں نے اُسے ریختہ کیا جیسے دیوار کو اینٹ مٹی چونا سفیدی وغیرہ پختہ کرتے ہیں یا یہ کہ ریختہ کے معنی ہے گری پڑی پریشان چیز کیونکہ اس میں الفاظ پریشان جمع ہیں" (ص ۲۱)

مولوی عبدالغفور نساخ نے اپنے رسالہ "زبانِ ریختہ"[۳۱] میں بھی اس خیال کا اظہار کرتے ہوئے مختلف زبانوں کے الفاظ کی مثالوں سے اس کی وضاحت کی ہے "معماروں کے محاورے میں ریختہ اسی مصالحہ (کذا) کو کہتے ہیں جس کو واسطے استحکام در و دیوار کے چند اجزا مخلوط کر کے بناتے ہیں اور چونکہ زبان اُردو کی نظم میں بھی الفاظ عربی مثل اللہ رسول و فارسی مثل دل و زبان و ترکی مثل چاقو و باروچی وعبرانی مثل یوسف اور ہارون و یونانی مثل کیمیا و قرطاس و اسطرلاب و ہندی مثل خنجر و پرتلا انکل و سنسکرت مثل موتی و دانت و کمالو زبان تامل مثل اڑ بمعنی (ماش) و زبان تلنگو (کذا) مثل بڑا - جو کہ ماش وغیرہ چیزوں کے لیے بناتے ہیں و زبان گجرات مثل ننھا بمعنی خورد کے و زبان چین مثل لیچی یا لیموں میوہ معروف و زبان ملائی مثل گدام و زبان امریکہ مثل تمباکو کی ترکیب ہے - اس لیے اس کا نام ریختہ رکھا گیا"[۳۲]

لفظی معنی سے قطع نظر کر کے بطور ایک لسانی اصطلاح ریختہ کا مطالعہ کرنے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ریختہ اُردو زبان کے لیے نسبتاً کم اور شاعری کے لیے زیادہ تر

استعمال ہوتا رہا ہے۔ ان شعرا کے ہاں بھی جنہوں نے اردو کے لیے ہندوی یا ہندی استعمال کیا۔ گذشتہ سطور میں میر اثر کی مثنوی "خواب و خیال" (۱۱۵۳ ہجری) میں سے ہندوی کی مثال پیش کی گئی تھی۔ اسی مثنوی میں اثر نے ایک موقع پر یہ کہا ہے:

مرتبہ ریختہ کا اور ہوا
معتبر فارسی کے طور ہوا

لیکن اس سے پہلے ولی بھی ریختہ استعمال کر چکا تھا:

ولی تجھ حسن کی تعریف میں ریختہ بولے
سُنے تو اس کو جان و دل سوں حسّانِ عجم آکر

اس انداز کے شاکر ناجی کے دو اشعار پیش بھی ہیں:

ریختہ ناجی کا ہے محکم اساس
بات میری بانیٔ ایہام ہے

بلندی سن کے ناجی ریختے کی
ہوا ہے پست شہرِ فارسی کا

میاں شاہ قیام الدین علی قائم چاند پوری (وفات ۱۲۰۸ھ/۱۷۹۳ء) کے دیوان سے ریختہ کے استعمال کی چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں:۔

قائم نے ریختہ کو دیا خلعتِ قبول
ورنہ یہ پیشِ اہلِ ہنر کیا کمال تھا

قائم جو کہیں ہیں فارسی یار
اس سے تو یہ ریختہ ہے بہتر

قائمؔ میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی[34]

ادھر مصحفی نے اپنی غزلوں میں ہندوی اور ریختہ دونوں الفاظ استعمال کیے ہیں :۔

مصحفی فارسی کو طاق پہ رکھ
اب ہے اشعار ہندوی کا رواج

کیا ریختہ کم ہے مصحفی کا
بُو آتی ہے اس میں فارسی کا

ان شعرا کے علاوہ اس انداز کی مزید مثالیں بعض نثر نگاروں کی کتابوں سے بھی مل سکتی ہیں مثلاً میر کے معاصر گردیزی نے "تذکرہ ریختہ گویاں" (۱۱۶۶ ہجری) میں ریختہ استعمال کیا ہے ۔ ریختہ کی فنی حیثیت کے ضمن میں میر تقی میر کے تذکرہ "نکاۃ الشعرا" (۱۱۶۴ھ/۱۷۵۰ء) سے رجوع کیا جا سکتا ہے جس کے اختتام "بر خاتمہ" کے زیر عنوان ریختہ کے بارے میں جو لکھا وہ آج بھی سودمند ثابت ہو سکتا ہے ۔میر خود شاعر تھے ۔شعرا کے مرتبے سے واقف تھے ۔ شاعری پر تنقیدی نگاہ رکھنے اور لفظ و معنی کی نزاکتوں سے آگاہ تھے ۔ انہوں نے ریختہ کی جو چھ اقسام گنوائی ہیں دیکھا جائے تو وہ معاصر غزل پر محیط ہیں :۔

"ریختہ میں متعدد اقسام ملتی ہیں ۔ ان میں سے فقیر کو جن سے آگاہی ہے ان کو لکھا جاتا ہے ۔پہلی وہ جس میں ایک مصرعہ فارسی اور ایک ہندی[35] ہوتا ہے چنانچہ حضرت امیر (خسرو) علیہ رحمہ کا قطعہ لکھا گیا ۔ دوسری وہ جس میں نصف مصرعہ فارسی نصف ہندی ، چنانچہ میر معز کا شعر لکھا گیا ۔تیسری وہ جس میں "حرف و فعل و فارسی"[36] بر دئے کار لائے جاتے ہیں اور یہ "قبیح" ہے چوتھی صورت

میں "ترکیباتِ فارسی" لے آتے ہیں۔ ان میں سے جو "مناسب زبان ریختہ" ہوں
اُن کا استعمال تو جائز ہے لیکن "غیر شاعر" اس سے آگاہ نہیں ہوتے: "نامانوس
ریختہ" ترکیبوں کا استعمال "معیوب" ہے اور اس کا جاننا بھی "سلیقہ شاعری پر
موقوف ہے۔ اس فقیر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کہ "ترکیب فارسی" گفتگوئے
ریختہ" کے مطابق ہو، تو پھر اس کے استعمال میں چنداں مضائقہ نہیں۔ پانچویں
قسم" ایہام" ہے اس" فن" کا" شاعران سلف" میں رواج تھا، لیکن اب
اس" صنعت" کی طرف طبیعتیں کم مائل ہیں مگر سلیقہ شرط ہے۔ ایہام کی معنی یہ ہیں
کہ جس لفظ پر" بنائے بیت" استوار کی جاتی ہے۔ اس کے دو معنی ہوتے ہیں
ایک" قریب" کے دوسرے" بعید" کے لیکن شاعر کو قریب کے نہیں بلکہ دور کے
معنی" منظور" ہوتے ہیں۔ چھٹا انداز وہ ہے جو میں نے اختیار کیا ہے اور
تمام "صنعتوں" پر محیط ہے۔ چنانچہ" تجنیس"، "توصیع"، "تشبیہ"، "صفائے گفتگو"،
"فصاحت"، "بلاغت"، "ادا بندی"، "خیال" وغیرہ کا اس" ضمن" میں نام لیا جا سکتا
ہے" ۲۷

اگرچہ میر تقی میر کا یہ اقتباس قدرے طویل ہے لیکن میر نے ریختہ کے جو چھ انداز گنوائے
ان کی آج بھی اہمیت ہے مزید برآں دیگر شہادتوں کے ساتھ ساتھ خود میر کے بیان سے
بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ زبان کو تو ہندی کہتا ہے، مگر" شاعری" کو" ہندی شاعری" یا" غزل"
یا" ریختہ" قرار دیتا ہے جس کا مطلب یہ ہوا کہ عہد محمد شاہی میں ہندی اور ریختہ کا مفہوم طے
پا چکا تھا اور ان کے استعمال میں کوئی الجھن نہ تھی۔ جبھی تو میر نے یوں تعلّی کی:-

دل کس طرح نہ کھینچیں اشعار ریختے کے
بہتر کیا ہے میں نے اس عیب کو ہنر سے

ریختے کے اس استعمال کی مزید مثالیں بیش ہیں۔ قاضی نور الدین فائق کا تذکرہ "مخزن الشعرا"

(تذکرہ شعرائے گجرات (۱۲۶۰ھ / ۱۸۶۲ء) میں بھی کئی مواقع پر ریختہ کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ تذکرہ کے تقریظ نگار میر کمال الدین حسین کامل نے بھی ریختہ کا لفظ استعمال کیا ہے [۳۸]

شاید یہ طے کرنا مشکل ہو کہ ریختہ آخری مرتبہ شاعری کے مفہوم میں کب استعمال ہوا۔ تاہم جہاں تک نثر کا تعلق ہے تو رتن ناتھ سرشار کے فسانہ آزاد میں (جلد اول) اس کا استعمال آخری معلوم ہوتا ہے فسانۂ آزاد کے آغاز میں صبح کی منظر نگاری کرتے ہوئے آزاد نے یہ لکھا:

"روشنی طبع کے صدقے ایک ایک قدم پر ایک ایک مصرعہ ریختہ موزوں ہوتا چلا جاتا تھا..... " [۳۹]

سرشار نے منشی نول کشور کے اودھ اخبار (اجرا ۱۸۵۸ء) میں "فسانۂ آزاد" بالاقساط لکھنا شروع کیا تھا۔ پہلی قسط "ستمبر ۱۸۷۸ء کے شمارے میں طبع ہوئی جبکہ ناول تین برس بعد پہلی مرتبہ شائع ہوا تھا

حافظ محمود شیرانی نے بحیثیت مجموعی ریختہ پر جو تبصرہ کیا وہ درج ذیل ہے:

"ریختہ سے ہماری مراد ایسا کلام منظوم ہے جس میں ملمع کی طرح فارسی اور ہندی کے الفاظ یا فقرے متحد ہو کر کسی خاص مقصد یا مفہوم کو ادا کریں۔ ابتدائی دور کے ریختوں میں ہندی الفاظ کی آمیزش بہت کم ہوتی ہے بلکہ بعض کے تو پورے پورے شعر میں صرف ایک لفظ ہندی کا ملتا ہے جو بھی قافیے میں نمودار ہوتا ہے۔ ایسی نظموں کی تحریک ہزل و ظرافت اور تفنن طبع کی خاطر شروع ہوتی ہے مگر وقت گذرنے پر یہی تحریک بڑے سنجیدہ اور اہم مقاصد کا مرکز بن جاتی ہے اور ہماری اردو شاعری کا تمام قصر اسی کی بنیاد پر تعمیر پاتا ہے اگر ریختہ کے بانی حضرت امیر خسرو مانے جائیں تو اس کی ابتداً ساتویں صدی ہجری کے ربع چہارم سے [۴۰] تسلیم کرنی ہوگی لیکن اگر یہ مانا جائے کہ

امیر خسرو کے بعد یہ نظمیں رائج ہوئیں تو ہمیں ان کا زمانہ اسی عہد سے دو صدی بعد یعنی نویں صدی کا ربع چہارم ماننا پڑے گا جو شیخ باجن اور شیخ جمالی کا زمانہ ہے اور جب بہلول اور سکندر لودھی حکمران تھے۔ دسویں صدی کے ریختہ کے نمونے بہت کم ملتے ہیں" نہ ۵

حافظ شیرانی نے "دسویں صدی ہجری کے بعض جدید دریافت شدہ ریختے" پیش کئے ہیں بلکہ جس مقالے سے یہ اقتباس لیا گیا یہ اس کا عنوان ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر جمیل جالبی نے "تاریخ ادب اردو" (جلد اول) میں بھی اس نوع کی مثالیں پیش کی ہیں۔ طوالت کی وجہ سے ان سب سے صرفِ نظر کیا جاتا ہے

ریختہ ساز: امیر خسرو

خسرو کا مشہور ریختہ درج ہے ہر چند کہ میر تقی میر نے تذکرۂ "نکات الشعرا" میں اس کے بجائے یہ درج کیا ہے:

زر گر پسرِ چو مہ پارا
کچھ گھڑیے سنواریے پکارا
نقدِ دلِ من گرفت و بہ شکست
پھر کچھ نہ گھڑا نہ کچھ سنوارا

بحرِ متقارب میں لکھا گیا امیر خسرو کا یہ ریختہ پیش ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
چو تابِ ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں
یکایک از دل دو چشم جادو بصد فریبم ببرد تسکیں
کسے پڑی ہے کہ جا سناوے پیارے پی سے ہماری بتیاں

شبانِ ہجراں دراز چو زلف زمانِ وصلت چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

چو شمع سوزاں چو ذرہ حیراں ہمیشہ گویاں بہ عشق آں
نہ نیند نیناں نہ انگ چینا نہ آپ آوے نہ بھیجے پتیاں

بہ حق آں مہ کہ روزِ محشر بداد مارا فریب خسرو
پیت من کے دورا ہے راکھوں جو جائے پاؤں پیا کی کھتیاں

خسرو کی یہ ریختہ غزل اگر ایک طرف مستند لسانی حوالے کی صورت اختیار کر چکی ہے تو دوسری طرف تخلیقی سطح پر یہ اس طرزِ احساس کی غماز ہے جو ہندی گیت اور دوہوں سے مخصوص رہا ہے یعنی عورت کی جانب سے اظہارِ عشق اسی کے زیرِ اثر دکنی غزل میں بھی عورت عاشق کا فعال کردار ادا کرتی نظر آتی ہے۔ شمالی ہند میں شاعری کی ابتدائی مثالیں اس سے معرا نہیں۔ یہ اندازِ عشق بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر اس وقت تک برقرار رہا جب تک کہ تخلیقی طرزِ احساس میں ہندو تہذیب اور مقامی کلچر کے اثرات نمایاں اور فعال رہے۔ لیکن فارسی کا غلبہ ہوتے ہی اندازِ عشق یوں بدلا کہ کیا عاشق اور کیا معشوق عورت کو ہر دو لحاظ سے جذبات کی مملکت سے جلا وطن کر دیا گیا اور پھر جب وہ لکھنؤ کے طوائفانہ تمدن میں واپس آئی تو "ریختی" کی صورت میں کجروی کی دلدل ثابت ہوئی۔

اگرچہ خسرو کا یہ ریختہ لسانی اہمیت اختیار کر چکا ہے لیکن مختلف کتابوں اور مقالات میں یہ مختلف صورتوں میں ملتا ہے (مثلاً مقالات حافظ محمود شیرانی جلد دوم: (ص ۸۸) دراصل یہ ریختہ بھی اچھی خاصی تحقیقی داستان کا حامل ہے بقول ڈاکٹر گوپی چند "تاریخی اعتبار سے امیر خسرو کے ہندوی کلام کا جو تھا اہم ماخذ قدرت اللہ قاسم کا تذکرہ "مجموعہ نغز" (اختتام ۱۲۲۱ھ/ ۱۵۰۶ء) ہے جس میں امیر خسرو کی مشہور غزل زحال مسکیں مکن تغافل کے پانچ اشعار درج کیے گئے ہیں جنھیں بعد میں محمد حسین آزاد نے آبِ حیات میں شامل کیا

اگرچہ آب حیات کا متن بعینہٖ وہی نہیں۔ محمود شیرانی نے مجموعہ نغز کو مرتب کر کے ۱۹۳۲ء میں شائع کیا۔ جبکہ وہ اپنی کتاب پنجاب میں اُردو ۱۹۲۸ء میں شائع کرا چکے تھے اور اس میں اس غزل کے اشعار مجموعہ نغز۔ قلمی سے ہی لیے ہونگے لیکن اس میں بھی متن بالکل وہی نہیں .... عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مجموعہ نغز کا مندرجہ بالا متن ہی اس غزل کا قدیم ترین متن ہے۔"

ریختہ میں تنوع:

ریختہ کے ضمن میں ڈاکٹر جمیل جالبی نے بھی ایک غزل نقل کی ہے۔ یہ حسن دہلوی کی ہے جس کے بارے میں جمیل جالبی لکھتے ہیں۔" امیر خسرو کے ایک ہم عصر اور ان کے پیر بھائی امیر حسن، حسن دہلوی (م: ۷۸۳ھ / ۱۳۳۷ء) ہیں۔ جنہیں عبدالرحمٰن جامی نے سعدی ہندوستان کہا ہے۔ حسن دہلوی فارسی کے پُرگو و قادرالکلام بے مثال شاعر تھے۔ محمد تغلق کے زمانے میں برہان الدین غریب (م: ۷۳۸ھ / ۱۳۳۷ء) کے ساتھ دولت آباد چلے گئے تھے۔ ان کی ایک غزل سے اس دور کی زبان پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ یہ زبان بھی ادبی سطح پر استعمال میں آ کر اپنا نیا سفر ارتقا طے کرنے لگی تھی جس نے بھی فارسی اور ہندی کو ملا کر وہی طریقہ اختیار کیا، جو امیر خسرو کے کلام کی خصوصیت ہے:

ہر لحظہ آید در دلم دیکھوں اُسے ٹک جائے کر
گویم حکایت ہجر خود باآں صنم جیو لائے کر
آں سیم تن گو ید مرا در کوئے ما آئی چرا
ماہی صفت ترپیسوں جو ٹک نہ دیکھوں جائے کر
تا کے خورم خونِ جگر کا سیں کہوں دُکھ جائے کر
سوزم فتادہ در تنم سیہہ دے گئے سلگائے کر

گشتم چوں جوگی در بدر بام اگر جائے خبر
پھر پھر رہیا بہوتوں نگرا جھوں نہ ملیلا آے کر
بسیار گفتم این سخن اے دل بجس رغبت مکن
ان کی بتاہی اُت کنٹھں بہوکوں کہے سمجھائے کر
بس حیلہ کردم اے حسن بے جا شدم از دم بدم
کیسے رہوں تجھ جیو بن تم لے گئے سنگ لائے کر[41]

حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" اور "مقالات حافظ محمود شیرانی" (جلد دوم) نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اُردو" اور ڈاکٹر جمیل جالبی نے متذکرہ تاریخ میں اس عہد کے متعدد شعراء اور صوفیا کے کلام اور اقوال سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جنہیں ریختہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

سعدی (مگر شیرازی نہیں) کی صورت میں ایک اور ریختہ گو کی دلچسپ غزل ملتی ہے کچھ محققین نے انہیں سعدی کاکوروی لکھا تو بعض نے اورنگ آباد کا بتایا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر الواس اشپرنگر (پیدائش آسٹریا ۳ ستمبر ۱۸۱۳ء وفات ۱۸۹۳ء) کے ایک مقالے

"HAS SADY SHYRAZI WRITTEN REKHTA VERSE"

(مطبوعہ جرنل آف ایشیاٹک سوسائٹی بنگال ۱۸۵۲ء) کا تذکرہ بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر محمد وحید مرزا کی کتاب "امیر خسرو" میں بھی اس کا حوالہ ملتا ہے اور اسی مقالے میں خسرو کا مشہور ریختہ "زحال مسکیں" بھی شامل ہے بہرحال سعدی جو کوئی بھی ہو اس کا ریختہ ہے پُرلطف اور مخاطب کوئی چنچل نار ہے:

قشقہ چو دیدم بر رخش گفتم کہ یہ کاریت ہے[42]
گفتا کہ دُر رے باد لے اس ملک کی یہ ریت ہے
اے مرد ماں شہر شما کتنی بری یہ ریت ہے
ہے ہے بانی پر سد کسے پردیسیا ماریت ہے

ہم نا تن کو دل دیا تم دل لیا اور دکھ دیا[۴۳]

ہم یہ کیا تم وہ کیا ایسی بھلی یہ پیت ہے[۴۴]

دونین کی کیا کچھ کہوں رو رو بخونِ دل کرؤں

پیش سگ کویت دھروں پیا سانہ جانے میت ہے

سعدی طرح انگیختہ شیر و شکر آمیختہ

در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے

بعض کتب میں مقطع یوں بھی درج ہے :

سعدی کہ گفتہ ریختہ در ریختہ در ریختہ

شیر و شکر آمیختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے[۴۵]

نساخ کے رسالہ" زبان ریختہ "کے مرتب ڈاکٹر محمد انصار اللہ ناظر نے حاشیے میں لکھا ہے :

" پروفیسر نورالحسن ہاشمی کی تحقیق کے مطابق یہ غزل سعدی کی نہیں بلکہ ملا شیری متوفی ۹۹۴ھ کی ہے اشعار کا متن ہاشمی صاحب کے مطابق یاں منود ہے :

جیوے تم یہ دکھ دیا تیرا ہموں کہہ کیا کیا

تم وہ کیا ہم یہ کیا کیسی بھلی پرتیت ہے

دونین نے کھر کر درد ے روئے نہ خون دل بھرو

پیش سگ کویت دھرو بھوکر نہ جاوے نیت ہے

شیری غزل انگیختہ شیر و شکر آمیختہ

در ریختہ در ریختہ ہم شعر ہے ہم گیت ہے"[۴۶]

الغرض ہندوؤں اور مسلمانوں کی زبانوں اور تمدنوں کے امتزاج سے تخلیقی سطح پر ہندستان

میں جو نئی امتزاجی تحریک جنم لے رہی تھی ۔ ریختہ اس کی منفرد علامت قرار پاتا ہے
جس کو شاعروں اور تذکرہ نگاروں نے زندہ رکھا ۔ چنانچہ پہلے اُردو تذکرہ گلشن ہند
(۱۸۰۱ء) کے مؤلف میرزا علی لطف زبان کے لیے ریختہ اور اردو دونوں کو بیک وقت
استعمال کرتے ہیں وہ تذکرہ کے آغاز میں لکھتے ہیں:

"راعنائی اور زیبائی دلبرانِ سخن کو اس زینت آفرین کی حمد
سے حاصل ہے جس نے معشوقانہ زبانِ ریختہ کو یہ لباس بوقلموں رنگ
پہنایا ۔ دلربائی اور رنگین ادائی نازفروشانِ ناطق کو اس بے نیاز کی ثنا
سے شامل ہے جس نے محبوبانِ کلامِ اُردو کو زیورِ الفاظ عربی اور فارسی کی آرائش کے
ساتھ خرامِ ناز سکھایا۔" [۲۴]

شیخ ناسخ نے متروکات کے جس عمل کا آغاز کیا ریختہ بھی اس کی زد میں آ گیا چنانچہ
ناسخ اور اس کے شاگردوں نے اسے ترک کر دیا غالب جو ریختہ کا لفظ استعمال کر گیا تو
ایک تو اس لیے کہ وہ شاگردِ ناسخ نہ تھا اور دوسرے اس لیے بھی کہ ناسخ کے مقابلہ
میں غالب کا الفاظ کا جمالیاتی اور تہذیبی شعور کہیں ترقی یافتہ تھا ۔

غزل عربی قصیدے کی تشبیب سے جدا ہوئی (حق تو یہ ہے کہ قصیدہ میں صرف
تشبیب ہی تخلیقی حسن کی حامل ہوتی ہے) ایرانی نفاست پسندوں کی تخلیقی توانائی سے پختگی
حاصل کی اور ہندوستان کی تخلیقی جمالیات کی مظہر قرار پائی تخلیقی سطح پر ریختہ تہذیبی اور لسانی
امتزاج کے زمانے کی یادگار ہے شاید اسی لیے جب تمدن یک رنگ ہو گیا تو خسرو کا طرزِ
احساس اور اس کا مظہر ریختہ متروک قرار پا گیا ۔ مجھے ذاتی طور پر ریختہ بہت پسند ہے اور
خسرو اور سعدی کے اسلوب والے ریختے آج بھی من بھاتے ہیں ۔

ریختہ کے متبادل کے طور پر کبھی کبھی "مراختہ" بھی استعمال کیا جاتا رہا ہے ۔ جیسا کہ
ڈاکٹر محبوب الٰہی نے "نکات الشعراء" کے مقدمہ میں لکھا ہے :

"نہ صرف مراختہ کی مجلسوں میں بلکہ نہج کی ملاقاتوں میں بھی معاصرین کے افکار پر نکتہ چینی کی جاتی تھی"[۵۴]

ریختہ اور موسیقی:

گذشتہ سطور میں ریختہ کے سلسلے میں جو لکھا گیا وہ لسانی اور ادبی نقطہ نظر سے تھا لیکن ریختہ کا ایک مفہوم موسیقی کے حوالے سے بھی اُجاگر ہوتا ہے اور یہ مفہوم مقامی تھا یعنی ایرانی موسیقی کی روایات سے اس کا کوئی تعلق نہیں بقول حافظ محمود شیرانی:

"ریختہ نے ساتویں قرن ہجری میں ہندوستان میں نئے معنی پیدا کر لیے اس کی تفصیل یہ ہے کہ جب امیر خسرو دہلوی نے ایرانی اور ہندی موسیقی کے اتحاد سے ایک نئی چیز تیار کی۔ اس کے لیے انھوں نے بعض نئی اصطلاحات مثلاً قول، ترانہ، معروضی، صوت، بسیط، دو بحر، چہار اصول، نقش، فارسی اور غزل وغیرہ وضع کیں۔ اسی سلسلے میں انھوں نے ریختہ کی اصطلاح بھی وضع کی اس اصطلاح سے موسیقی میں یہ مقصد قرار پایا کہ جو فارسی خیال ہندی کے مطابق ہو اور جس میں دونوں زبانوں کے سرود، ایک تال اور ایک راگ میں بندھے ہوں اس کو ریختہ کہتے ہیں۔ ریختہ کے لیے کسی پردے کی قید نہیں ہے وہ ہر پردے میں باندھی جاتی ہے.... گویا ریختہ کا اطلاق ایسے سرود پر ہوتا ہے جس میں ہندی اور فارسی اشعار یا مصرعے یا فقرے جو مضمون، تال اور راگ کے اعتبار سے متحد ہوتے تھے ترکیب دے دیے جاتے تھے۔ اس کی مثال میں امیر خسرو کی وہ غزل بتائی جاتی ہے جس کا مطلع ہے:

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تابِ ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیو کاہے لگائے چھتیاں[۹۳]

ریختہ کی تاریخ کا مطالعہ لسانی اور موسیقی کے ساتھ ساتھ ایک تہذیبی تناظر کا حامل بھی نظر آتا ہے۔ ہندو مسلم اتحاد کے جس عمل کا آغاز شہنشاہِ اکبر نے مغل سلطنت کے استحکام کے لیے کیا تھا وہ جب تہذیبی رنگ میں رنگا گیا تو اس نے جس تمدن کی بنا استوار کی، وہ نہ شدھ ہندوانہ تھا اور نہ ہی خالص مسلم بلکہ ان دونوں کے امتزاج سے جو معرضِ وجود میں آیا وہ ہی ہندوستانی تمدن تھا۔ اسی نے جب تخلیقی سطح پر اظہار پایا تو ریختہ (اور اس کی مظہر چیزیں) معرضِ وجود میں آئیں۔ عوامی سطح پر ہندو مسلم تمدن کے ملاپ سے جو نئی صورتِ حال رونما ہو رہی تھی غزل اور موسیقی میں ریختہ اس کا مظہر تھا۔

واضح رہے کہ البیرونی کی مانند خسرو "باہر والا" نہ تھا (جس کا اظہار اس کی تالیف "کتاب الہند" سے ہوتا ہے) بلکہ اس کے برعکس خسرو کے طرزِ احساس کی تخلیق مقامی مٹی سے ہوئی تھی۔ جیسا کہ انھوں نے کئی مواقع پر اپنی شاعری میں بالعموم اور مثنوی "نہ سپہر" میں بالخصوص فخریہ انداز میں کہا ہے۔

خسرو کے والد سیف الدین محمود (وفات ۶۵۸ھ) لاچینی ترک تھے محمد تغلق کے دربار سے وابستہ تھے والدہ مقامی خاتون تھیں اور ان کے نانا عماد الملک ہندی نژاد تھے۔ امیر خسرو (۶۵۱ھ/۱۲۵۳ء) میں ضلع ایٹہ کے شہر پٹیالی میں پیدا ہوئے۔ آٹھ برس کی عمر میں والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تو دہلی میں اپنے نانا عماد الملک کے پاس آ گئے جو غیاث الدین بلبن کے درباری تھے اور یہیں سے ان کا تعلق دہلی کے درباروں سے ہوتا ہے چنانچہ مختلف سفارتی اور فوجی امور میں بنگال اور اودھ سے لے کر ملتان تک کے علاقوں کی سیر کی بلکہ ملتان میں تو قید بھی ہو گئے تھے۔ ۷۲۵ھ میں انتقال کیا۔ امیر خسرو نے جن گیارہ سلطانوں کا زمانہ دیکھا ان کے نام یہ ہیں۔ غیاث الدین بلبن، معزالدین، کیومرث، جلال الدین خلجی،

فیروز خلجی، علاء الدین خلجی، شہاب الدین خلجی، مبارک خان، خسرو خان، غیاث الدین، محمد بن تغلق۔

امیر خسرو متنوع ذہنی دلچسپیوں کے حامل تھے۔ تخلیقی شخصیت اور انسائیکلوپیڈیائی ذہن کے حامل تھے۔ ان کی مادری زبان ہندوی تھی۔ مذہبی زبان عربی۔ دربار اور ادب کی زبان ترکی اور فارسی تھی۔ وہ ان سب زبانوں کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور بعض مقامی بولیوں سے بھی آشنا تھے اور ان سب میں شعر کہنے پر قادر تھے۔ لیکن خسرو کی تخلیقی اپج کسی ایک میدان کی پابند نہ تھی۔ انھوں نے شاعری، موسیقی، تصوف اور دنیا داری سب میں کمال حاصل کیا۔

کیوں کہ خسرو باہر سے نہ آئے تھے اس لیے وہ اپنے ہندوستانی ہونے پر فخر کرتے ہیں:

اثبات گفت، ہند بہ حجت کہ راجح است
بر پارسی و ترکی از الفاظ خوش گوار

ہمارا مقصد امیر خسرو کے حالاتِ زندگی بیان کرنا نہیں صرف اس تہذیبی عمل کی نشان دہی مقصود تھی جس کا مظہر امیر خسرو بنتے ہیں اور علامت ریختہ۔ خواہ وہ شاعری کے حوالے سے ہو یا موسیقی کے حوالے سے۔

اُردو اور چنگیز خان

مسلمانوں کی آمد سے ہندوستان کی جامد تاریخ میں تغیرات کی جو لہریں پیدا ہوئیں، ان کا متنوع جہات پر مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک زبان کی تشکیل کا تعلق ہے تو بھی جزوی لسانی تحقیقات کے بغیر صرف بدلتے ناموں ہندی، ہندوی، ریختہ، ہندوستانی اور اُردوئے معلیٰ سے ہی سے تاریخی تغیرات اور ان سے وابستہ سیاسی، سماجی اور تمدنی امور کو بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔

ترکی میں اُردو لشکر کو کہتے ہیں اب شواہد پیش کرنے کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے ۔
تاہم ایک دو حوالے پیش ہیں :

حکیم سیّد شمس اللہ قادری کے بموجب " امیر علاؤ الدین جوینی کی تاریخ " جہاں کشا "
اور وزیر رشید الدین فضل اللہ کی " جامع التواریخ " سے معلوم ہوتا ہے کہ چنگیز خاں اور اس کی
اولاد کے زمانے میں مغل بادشاہوں اور بادشاہ زادوں کی فرودگاہوں اور لشکر گاہوں کو اردو
کہا کرتے تھے ۔ یہاں تک کہ ان کا مستقرِ حکومت بھی اُردو کہلاتا تھا اور قراقرم کا قدیم نام
بھی اُردو بالیغ تھا ۔ چنگیز خاں کے فرزند جوجی خاں کی اولاد نے " دشتِ قپ چاق " اور
رُوس و بلغار " میں ایک وسیع حکومت قائم کر لی تھی اس کے حکمران جب کسی مہم پر مستقر سے
روانہ ہوتے تو زریں خیموں میں قیام کرتے تھے جس کے باعث ان کے لشکر گاہیں اردوئے
مطلّا (GOLDEN HORDE) کہلاتی تھیں خود انہیں خوانینِ اُردو مطلّا کے لقب سے
شہرت ہو گئی تھی ۔ نمبر ۵

آئی ۔ آئی قاضی نے ۱۵ دسمبر ۱۹۳۸ء کو کراچی میں منعقدہ یوم اُردو کے خطبہ صدارت
میں لفظ اُردو کے آغاز اور بدلتی صورتوں کے بارے میں خاصی دلچسپ اور معلومات افزا گفتگو
کی ۔ ان کے بقول " یہ لفظ اصلاً ترکی نہیں ہے " بلکہ " اُردو سندھی میں بھی ڈھیر یا اشیائ
کے ذخیروں اور انسانوں کے اجتماع کو کہتے ہیں " اور " عربوں کے سندھ میں ورود سے
تین ہزار قبل سے رائج ہیں "۔

وہ اس لفظ کی حکایت یوں بیان کرتے ہیں :

" لفظ اُرد (URD) سندھ یا ہند میں پیدا نہیں ہوا اس کی ابتدا ما قبل
تاریخ کے ماضی میں ہوئی وہ لوگ جو ہند المانی (INDO - GERMANIC) زبانوں سے
کچھ شناسائی رکھتے ہیں اس لفظ کو اسکینڈے نیویا ، ایران اور ہندوستان میں (یہ تینوں
علاقے آریائیوں کے خاص وطن ہیں) ایک وقت موجود پاتے ہیں ۔ قدیم نارڈک (NORDIC)

دیو مالا میں لفظ ارد (URD) یا ارتھ (URTH) ایک دیوی کا نام ہے جو خود تقدیر ہے
ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہند المانی زبانوں کے بولنے والوں میں اپنے مغربی و مشرقی مساکن
کی طرف مراجعت سے پہلے ہی یہ لفظ مستعمل تھا اگر ہم اویستا یا قدیم فارسی زبان کا مطالعہ
کریں تو ہمیں یہ لفظ وہاں مل جائے گا اردبل کا شہر اردشیر بادشاہ اسی لفظ کے استعمال
کے ثبوت ہیں جس مفہوم میں ۔ یہ لفظ آج سندھ میں مستعمل ہے اسی مفہوم میں جدید
فارسی میں بھی استعمال ہوتا ہے ۔ مثلاً فوج ، کیمپ، بازار وغیرہ اور ان تمام مفاہیم میں
قدرِ مشترک بالکل واضح ہے ۔ یہ ڈھیر بھی ہے، مجمع بھی اور مجموعہ بھی لفظ "ارد" میں شروع
ہی سے ایک مخصوص اشارہ دہشت اور خوف کا بھی ملتا ہے ۔ تجسیمی صورت میں یہی
خصوصیت "ارد" دیوی کی ہے جس کے معنی ایک ایسی شے کے ہیں جو مقدر کی طرح دہلا
دینے والی ہو.... ان آریا مہاجرین نے جو اسکینڈے نیویا کی طرف گئے اس لفظ کے
ساتھ یہی مفہوم وابستہ کیا.... پس ہم دیکھتے ہیں کہ لفظ "ارد" آریائی زبان کے قدیم
ترین لفظوں میں سے ہے اور آج تک زندہ چلا آتا ہے ۔ یہ آریائی تمدن کی ابتدا، اور اس
کی خاصیت کا مظہر ہے ۔ یعنی انسانی معاشرت کا ۔ حضرات یہی وہ لفظ ہے جو لفظ
اُردو کا ماخذ ہے "[۵۱]

حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات سے اُردو کی کہانی کچھ اور ہی رنگ اختیار کر لیتی ہے وہ
لکھتے ہیں" یہ لفظ ترکی میں مختلف شکلوں میں ملتا ہے یعنی اورد ، اوردہ ، اوردو اور اردو ۔
جس کے معنی فرودگاہ ، لشکر اور پڑاؤ نیز لشکر و حصۂ لشکر ہیں ۔ اس کے علاوہ اس کا استعمال
خیمہ ، بازار، لشکر، حرم گاہ ، محل و محل سرائے شاہی و قلعہ پر بھی ہوتا ہے "[۵۲] اس پر جابر
علی سید کی اس رائے کا اضافہ کر لیجیے تو اُردو کہاں سے کہاں تک جا پہنچتی ہے " اُردو ،
یلدرم ، بیگ ، بیگم ، ابا ، باجی ۔ ترکی منگول ۔ کشور کشاؤں کے ہمراہ جب پولینڈ
(لہستان، فارسی) پہنچا تو پولش زبان کے مزاج میں ڈھل کر HORDE بن گیا جس کی جمع

HORDES ہے اور MONGOL HORDES منگولی عساکر کے معنی میں انگریزی میں متداول ہے۔[۵۳]

اپنوں کی باتیں تو سن لیں اب ذرا یہ بھی دیکھئے کہ ایک ترک اس سلسلے میں کیا کہتا ہے سلجوق یونیورسٹی قونیہ (ترکی) کے صدر شعبہ اردو ڈاکٹر ایرکان ترکمان کے بموجب ۷۳۲ء میلادی کل تگین بادشاہ نے ایک ستون کندہ کرایا جس کی عبارت ترکی زبان کے قدیم ترین نمونوں میں سمجھی جاتی ہے اس میں لفظ اُردو (ORDU) "مرکز حکومت" دارالخلافہ یا چھاؤنی کے معنی میں کندہ ملتا ہے۔ ان کے مقالہ بعنوان" لفظ اُردو کا مطلب اور تاریخی پس منظر" (اخبار اُردو اسلام آباد جولائی ۸۷ء) سے اُردو کے استعمال کی تاریخ پیش ہے :

"ترکوں کے مسلمان ہونے کے بعد سنہ ۱۰۷۲ء میلادی میں یوسف خاص حاجب نے" قوتا دغو بلیک" کے نام سے کتاب لکھی تھی جس کا مطلب ہے "مبارک علم یا علم دولت" اس ضخیم کتاب میں جگہ جگہ اردو کا لفظ آتا ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس صدی میں اس لفظ کے معنی یہ تھے۔ محل یا شہر۔ ترکی کے پرانے لہجے" اویغوری میں اردو کا لفظ "محل" اور" لشکر گاہ" کے معنوں میں استعمال ہوتا تھا۔ اس کا تلفظ" اردو" کی شکل میں بھی مستعمل تھا۔ گیارہویں صدی عیسوی میں محمود کاشغری نے عربی پر ترکی کی فوقیت دکھانے کے لیے ایک لغت لکھی تھی۔ جس کا نام" دیوان لغات الترک" ہے۔ اس میں سات ہزار پانچ سو کے لگ بھگ الفاظ اور ان کے معانی ملتے ہیں۔ لفظ اُردو کے بارے میں جو کچھ اس میں ہے پیش کرتا ہوں :

" اُردو: وہ شہر جس میں خاقان (بادشاہ) مقیم ہوتا ہے۔ اس طرح کاشغر میں کیونکہ بادشاہ رہتے تھے۔ اس لیے اُسے بھی" اردو کند" کہا جاتا تھا۔ اُردو: بالا ساغون کے نزدیک ایک شہر کا نام ہے۔ بالا ساغون شہر کو" قوذ

اردو" کہتے ہیں":

اُردو باشی (ORDUBASI) وہ شخص جو خاقان کا بستر بناتا ہے۔

کلاؤزن صاحب اپنی لغت[54] میں ایسے ہی معنی دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

" اُردو (ORDU) یا اوردو (ORDO) بادشاہ کے رہنے کا محل

بادشاہ کا خیمہ منگولی میں یہ لفظ اوردو (ORDO) کی شکل میں ترکی سے لیا گیا

ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ جب منگولیں فوج نے انجام پایا اور ترکی کی عسکری

طرز کو اپنایا تو یہ لفظ چنگیز خاں کے بعد یعنی تیرھویں صدی عیسوی میں منگولی سے

یورپ کی زبانوں میں HORDE ORDO کی شکل اختیار کر گیا۔ لاطینی میں

اور چینی میں AO-T'OT کی شکل ہو گئی۔ ترکی کے چغتائی لہجے میں اُردو

سے مراد قیام گاہِ لشکر۔ حرم سلاطین و محل ہے"۔

الغرض اُردو کے معنی کی جتنی متنوع صورتیں گنوائی جاتی ہیں ان سب کا بلاواسطہ یا

بالواسطہ طور پر لشکر ہی سے تعلق بنتا ہے اور کیا پتہ لاہور کا اُردو بازار بھی دراصل لشکر کی قیام گاہ

ہو جبکہ آج ناشرین اور سٹیشنرز کی وجہ سے اُردو زبان ادب سے اس کا تعلق سمجھا جاتا ہے۔

اردو: لشکر

جب اُردو لشکر تھا تو پھر اُردو کا لفظ بھی ترکی لشکر کے ساتھ یہاں آنا چاہیئے تھا اور

ایسا ہی ہوا۔ شاید تاریخی شواہد یا کسی سیاح کے سفرنامے میں اُردو کا لفظ مغلوں سے پہلے

نظر آ جائے تاہم مغلوں کی آمد کے بعد سے تو اُردو کا لفظ کہیں نہ کہیں اپنے اصل مفہوم (لشکر)

میں مل جاتا ہے۔ اوّلین اور قدیم حوالہ پہلے مغل حملہ آور بابر کے ہاں ملنا چاہیئے اور واقعی

ملتا بھی ہے۔ چنانچہ اس کی تزک میں لفظ اُردو کا استعمال اگر قدیم ترین نہیں تو کم از کم قدیم

یقیناً ہے:

"دروقت رسیدن نزد باہیان جادر ہائے مارا

کہ عقب ماندہ بودے بنیند مارا خیال کردہ

زور برمی گردند و اردوئے خود رسید بہ

ہیچ چیز تقیہ نہ شدہ کوچ مے کنند"

بابر اپنی لشکری ٹکسال کو بھی "اردو" کہتا تھا۔[55]

اکبری عہد حکومت میں بھی اُردو لشکر اور اس کے متعلقات کے لیے استعمال ہوتا رہا۔ چنانچہ شیرانی نے اُردو علیہا۔ اُردو معلّیٰ۔ اُردو لشکر۔ اُردو حضرت، اُردو ظفر یں، اردو عالی اور اُردو بزرگ جیسے الفاظ گنوائے ہیں۔[56] ان مرعوب کن ناموں کا بابر کے لشکر سے موازنہ نفسیاتی دلچسپی سے خالی نہیں بابر تھوڑی جمعیت (محض دس بارہ ہزار) مغل لے کر آیا تھا۔ اس لیے یہ "محض" اردو" تھا۔ لیکن اکبر کے عہد میں سلطنت وسیع بھی تھی اور مضبوط بنیادوں پر مستحکم بھی۔ اس لیے یہ کیسے ممکن تھا کہ اکبر اعظم کا لشکر "محض" اردو" رہے چنانچہ وہ اردوئے معلیٰ کہلاتا ہے۔ یہ وہ احساس تفاخر ہے جو شہنشاہیت سے مخصوص ہے جس کے باعث محض ایک فانی مرد ظلِ سبحانی کہلواتا ہے۔ اکبر تو خیر اعظم تھا ہی چنانچہ وہ مہابلی بنا اور اس کے لشکر کی ٹکسال نے اُردوئے ظفر ترین اور اُردو ظفر قرین کا نام پایا۔

مغل اور اُردو:

امن و امان خوشحالی، فتوحات اور ان کے نتیجے میں وسیع مغل سلطنت کی حدود میں بسنے والی متنوع نسلوں پر مشتمل اپنی اپنی زبانیں اور بولیاں بولنے والی رعایا میں جو ترک لفظ مقبول بلکہ زبان زد عوام ہوئے ہوں گے 'اُردو' اور اس کی متنوع صورتیں بھی ان میں شامل ہوں گی اس لیے کہ اس عہد میں لشکری ہونا باعثِ عزت بھی تھا اور تحفظ اور حصول زر کا ذریعہ بھی۔

جہانگیر کے عہد تک اُردو کا لفظ ملتا ہے ۔ وہی اپنے اصل ترکی مفہوم میں ہیں لیکن زبان کے لیے ہندی ہی مستعمل تھا ۔ ایک موقعہ پر اس نے اپنی تزک میں یوں لکھا :

" یہ کالا پانی ضرور آلام کہ بزبان ہندی مراد آب سیاہ است" تزک میں جہانگیر پر جستجو ذہن کا مالک نظر آتا ہے ۔ اسی لیے تجربات اور مشاہدات کا شائق ہے ۔ وہ اشیاء اور وقوعات کو سمجھنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اس کی مے نوشی سے مرتب پانے والے عمومی تاثر کے برعکس وہ کھلی آنکھ رکھنے والا انسان نظر آتا ہے ۔ بے حد ذہین اور معاملہ فہم منجملہ دیگر امور کے تہذیبی تمدنی ، لسانی اور انسانی نقطہ نظر سے بھی اس کی تزک مالا مال ہے ۔ جب ہم اس کی تزک میں عام الفاظ پڑھتے ہیں تو تعجب ہوتا ہے کہ یہ اتنے پرانے ہیں ۔ تالاب ۔ بلی ، تھانہ ۔ بوٹا ۔ گوٹ ۔ ٹیکہ ۔ چوکیدار ۔ چبوترہ ۔ گول ۔ چمپ گھڑی ، کٹوری کھچڑی ، باجرا وغیرہ ۔ ویسے اس انداز کی مزید مثالوں کی تلاش میں کسی حد تک تزک بابری اور بڑی حد تک ابوالفضل کی " آئین اکبری" سے بھی مدد مل سکتی ہے یہی نہیں بلکہ سفرناموں اور تہذیبی یا تاریخی کتابوں سے بھی اس نوع کی قدیم مثالیں تلاش کی جا سکتی ہیں ۔ اس انداز کی ایک نمایاں مثال ابن بطوطہ کا سفرنامہ (۷۲۵ھ) بھی ہے یہ فیروز شاہ تغلق کے دور میں آیا تھا اور ہندوستان کے بارے میں جو کچھ لکھا وہ اب اہم تاریخی ماخذ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے ۔ بقول ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ "اس نے چالیس کے لگ بھگ ایسے الفاظ استعمال کیے جو آج بھی مروج ہیں ۔ کوتوال بموسہ ۔ پودا ۔ منڈی گلہ بان ۔ بارگہہ ۔ ٹٹو ۔ ڈال ۔ چک ۔ مرتبان (وہ اُسے مرطبان لکھتا ہے" ۔ ۵۵

بہرحال ان قدیم الفاظ کا زندہ رہنا ایک الگ مبحث ہے جہاں تک خود

اُردو کا تعلق ہے تو خود محققین متفق ہے کہ اُردو کے ہندی یا ہندوی نام عہد شاہجہان میں متروک ہوئے اور شاہجہان آباد میں زبان نے اُردوِ معلی کا نام پایا۔

شاہجہان کے درباری مورخ محمد صالح کنبوہ نے "عملِ صالح (شاہجہان نامہ) کے نام سے عہد شاہجہان کی جو مفصل تاریخ تین جلدوں میں قلمبند کی۔ اس میں اس نے شاہجہان آباد کی تعمیر کا احوال بڑے پرجوش انداز اور شاعرانہ اسلوب میں بیان کیا ہے۔ اس کے بقول اگرچہ آگرہ اور لاہور "مرکز فیض ہیں ..... تہذیب تمدن کے تمام لوازم یہاں باافراط دستیاب ہوتے ہیں" مگر شاہجہان نیا دارالحکومت بسانا چاہتا تھا۔ کیونکہ آگرہ میں نشیب و فراز زیادہ ہیں۔ شہر ناہموار ہے"۔ جبکہ لاہور" شہر کی وضع نامرغوب ہے"۔ چنانچہ شاہی حکم کی تعمیل میں شاہی معماروں اور مہندسوں نے دریائے جمنا کے کنارے دارلملک دہلی کے قریب نور گڑھ سے متصل ایک میدان منتخب کیا جو دریا کے کنارے بہشت بریں کا نمونہ معلوم ہوتا تھا۔ یہ قطعہ اراضی بادشاہ نے پسند کیا" حضرت کے حسب الحکم نو محرم ۱۰۴۹ھ ۲۲۔اردوی بہشت مطابق ۱۲ مئی ۱۶۳۹ جمعرات جمعہ کی درمیانی شب میں ۵ گھنٹے ۱۲ منٹ گزرنے پر" تعمیر کا آغاز ہوا اور" بیسویں سال جلوس میں یہ تمام عمارتیں مکمل ہوگئیں اور نجومیوں اور منجموں کی تجویز کردہ مبارک ساعت کے مطابق ۲۰ فرور دین ۲۴ ربیع الاول ۱۰۵۸ھ (۱۸ اپریل ۱۶۴۸ھ) کو قلعہ نشین ہوا کہ" زہرہ و مشتری کی نظر اس روز سیدھی" تھی۔ تعمیر کی لاگت ۵۰ لاکھ روپے اور" اتنی ہی رقم اس کے محلوں نشیمنوں اور دیوان عام و خاص وغیرہ میں خرچ" ہوئی۔ جبکہ مسجد کی تمام عمارتیں آخر رمضان ۱۰۶۰ھ (آخری ستمبر ۱۶۵۰ء) میں ڈیڑھ لاکھ روپے کی لاگت سے تیار ہوئیں"۔[۵۵]

شاہ جہاں اس وقت ستاون برس (شمسی) سال کا تھا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ اپنے تعمیر کردہ دارالحکومت میں مدت عمر پوری نہ کرسکا۔، ذی الحجہ ۱۰۶۷ھ ۱۶ ستمبر ۱۶۵۷ء کو جس بیماری کا آغاز ہوا وہ اگرچہ اس سے صحت یاب ہو گیا اور ۳۰ دسمبر ۱۶۵۷ کو جشنِ صحت بھی

منایا گیا مگر حصولِ تخت کے لیے شہزادوں میں کشمکش اور درباریوں میں سازشوں کا آغاز ہو گیا جس میں بالآخر اورنگ زیب کامیاب ہوا اور یوں شاہ جہاں کی ۳۲ سالہ حکومت کا قید خانہ میں خاتمہ ہوا۔

دارا شکوہ گرفتار ہو کر ۲۰ ذی الحجہ ۱۰۶۹ھ (۳۰ اگست ۱۶۵۶ء) بدھ جمعرات کی نصف شب کو ذبح کیا گیا۔ یہی انجام سلیمان شکوہ اور شہزادہ مراد کا بھی ہوا۔ جبکہ شاہ جہان کا آگرہ میں عالمِ قید میں ۲۶ رجب ۱۰۷۶ھ میں (۳۱ جنوری ۱۶۶۶ء) اتوار پیر کی درمیانی شب میں ۳ گھڑی رات گذرے انتقال ہوا اور ۲۰ برس کے عرصے میں ۵۰ لاکھ کی لاگت سے تیار ہونے والے تاج محل میں دفن کیا گیا۔

بابر کی شخصیت میں جلال و جمال کا امتزاج ملتا ہے۔ وہ فاتح بھی تھا اور شاعر بھی۔ اس کا بازوئے شمشیر زن قلم کی تخلیقی لطافتوں سے بھی آشنا تھا۔ شاید اسی لیے مغل سلطنت بھی جلال و جمال کی مظہر نظر آتی ہے۔ اکبر تک جلال کا امتزاج رہا مگر جہانگیر کے بعد جلال کی جگہ جمال نمایاں نظر آتا ہے جو شاہجہاں میں نقطۂ عروج تک پہنچ جاتا ہے۔ تہذیبی سطح پر تاج محل اس کا مظہر نظر آتا ہے تو تخلیقی سطح پر زبان جو شاہجہان آباد میں اردوئے معلیٰ کے لقب سے سرفراز ہوئی۔

اُردوئے معلّیٰ:

بقول میر امن:

"تب بادشاہ نے خوش ہو کر جشن فرمایا اور شہر کو اپنا دارالخلافہ بنایا۔ تب سے شاہجہاں آباد مشہور ہوا۔ اگرچہ دلی جدی ہے وہ پرانا شہر اور یہ نیا کہلاتا ہے اور وہاں کے بازار کو اُردو معلی کا خطاب دیا۔"

قدیم دور میں تہذیب و تمدن کا مرکز دربارِ شاہی ہوتا تھا۔ بادشاہ کی پسند و

ناپسند عوام کے لیے مثال اور نمونہ ہوتی تھی۔ جب شاہ جہان آباد کی زبان محض عوام کی بولی نہ رہی بلکہ اردوئے معلّٰی قرار پائی تو ظاہر ہے کہ اس نے لطافت کی نئی حدوں کو چھو لیا ہوگا۔ شاہی محل، شہزادے، شہزادیاں، شاہی دربار اور اراکین دربار زبان کے ساتھ ساتھ دیگر تمدنی امور میں بھی سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ آج کی اصطلاح میں انہیں "TRENDSETTER" کہہ سکتے ہیں تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ بحیثیت مجموعی اندازِ زیست میں جو لطافت پیدا ہو رہی تھی زبان پر اس کے اثرات نہ پڑتے۔ یہ ہونا تھا اور یہی ہوا۔ شاہ جہان آباد اور اردو یوں لازم و ملزوم ہوئے کہ اردو معلّٰی کے ساتھ ساتھ زبان شاہجہان آباد یا اصطلاحِ شاہ جہان آباد کا نام بھی پایا۔ ملاحظہ ہو۔ سراج الدین علی خاں آرزو (۱۰۸۹ھ/۱۶۸۹ء) کی لغت "نوادر الالفاظ" جس میں آرزو نے ہندوستان کی زبانیں گنواتے ہوئے یہ بھی لکھا ہے:

"زبان اُردو یا اردوِ معلّٰی یا زبانِ شاہجہان آباد یا اصطلاح شاہ جہان آباد یا اہل اردو یا ہندی فصحا۔"

اس سے اُردو کے مترادفات کے ساتھ ساتھ یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ اس دور میں اُردو شاہ جہان آباد سے مخصوص تھی اور بعض اوقات، اُسے زبان دہلوی کہا گیا تو وہ بھی اسی مناسبت سے ہے۔

غالب کے مشہور شاگرد علاؤالدین کا ایک نادر مضمون "ریختہ کی کہانی علائی کی زبانی" ملتا ہے جو ۵ رمئی ۱۸۶۶ء کو دلی سوسائٹی کی ایک نشست میں پڑھا گیا تھا اور "ماہ نو" (کراچی جلد ۱۲ شمارہ ۳ ۱۹۵۹ء) میں اس کی اشاعتِ مکرر ہوئی۔ تاریخی اہمیت کے اس مضمون سے یہ اقتباس ملاحظہ ہو:

"واضح ہو کہ لشکر کو فارسی میں اردو بھی کہتے ہیں جس کا ترجمہ عربی میں جیش اور انگریزی میں کیمپ یا آرمی ہے

ہر چند کہ بعض لوگ بمعنی لشکر ترکی بتاتے ہیں مگر یہ لفظ
فارسی کا ہے با ایں حال جب اس زبان نے ترکیب
پائی اور لشکر کے بازارگاہ میں جہاں اطراف و اکنافِ
عالم کے تجار آ جاتے تھے ۔ صرف محاورات و کلمات
ہوتے تھے تو یداً " بعد یوم اس کی ترقی ہوتی گئی اور
نام اس کا زبان اردو ہوا ۔ ازآں جا کہ بعد عہد اکبر زمانہ شاہ
جہان آباد قرار پایا اور خود اپنی ذات سے بادشاہ بھی
اسی جگہ متمکن بردوام رہا ۔ تو نام اس لشکر کا تعظیماً اردوئے
معلّی رکھا جس کا ترجمہ انگریزی میں رائل کیمپ ہو سکتا
ہے ۔ بدیں نظر اُردو سے مراد خاص زبان شاہ جہان
آباد ہوئی ۔"

شاید اُردو زبان عوام کی زبان پر اس سے پہلے بھی ہو لیکن اتنا یقینی ہے کہ شاہجہان آباد کی نستعلیق فضا اور تعلیم یافتہ افراد کی سرپرستی کے باعث اُردو کے ذخیرۂ الفاظ میں خصوصی اضافہ ہوا ہوگا ۔ یہ قیاس اس لیے غلط نہیں کہ دارالحکومت میں دربار کی زبان فارسی ہی تھی جو تخلیقی مقاصد کے لیے بھی استعمال کی جا رہی تھی ۔ یہی درباری علماء اور فضلا جب اُردو بولتے ہونگے تو غیر شعوری طور پر اپنے مطالعے کی بنا ، پر اس میں عربی ، فارسی و ترکی الفاظ کی آمیزش بھی کر جاتے ہوں گے مزید براں دارالحکومت ہونے کی بنا پر نہ صرف یہ کہ ہندوستان کے مختلف علاقوں کے لوگ اپنی اپنی مخصوص زبانیں اور بولیاں بولتے یہاں آتے رہتے تھے بلکہ غیر ملکی سفارت کار بھی آتے تھے ۔ غیر ملکی لوگ نئے الفاظ لاتے ۔ نئی چیزیں اپنے ہمراہ نئے نام لاتیں اور نئے تصورات نئی اصطلاحات لاتے ۔ یوں قطرہ قطرہ بہم شود دریا کے مصداق ذخیرۂ الفاظ میں بتدریج اضافہ ہوتا گیا ۔ حتیٰ کہ اکھڑ لشکریوں کے معمولی ضروریات پوری کرنے

والی گنواری بولی بطور ایک شائستہ مزاج زبان کے اپنا روپ نکھارتی گئی ۔ اس حد تک کہ شاہ جہان آباد کی تعمیر کے نصف صدی بعد وہ ایک ایسی معیاری زبان کی صورت اختیار کر گئی جس میں اب تخلیقی قوت بھی تھی اس لیے ولی کی دہلی آمد پر (۱۱۱۲ھ) جب مشہور صوفی شیخ سعد اللہ گلشن نے دکنی اسلوب کی غزلیں سن کر یہ مشورہ دیا تو (تحقیقی اعتبار سے متنازعہ ہونے کے باوجود بھی) لسانی نقطہ نظر سے اہمیت اختیار کر جاتا ہے :

"زبان دکنی را گذاشتہ و ریختہ را موافق

اُردوئے معلی شاہ جہان آباد موزوں بکند"

اس عہد کے مخصوص لسانی تناظر میں دکنی میں کوئی خرابی نہ تھی (کہ اس میں ایک صدی سے مثنوی، قصیدہ، مرثیہ اور غزل لکھی جا رہی تھی) میرے خیال میں واحد خرابی یہ تھی، کہ وہ دکنی تھی ۔ شاہ جہان آباد کی نہ تھی یعنی مفرس اور معرّب نہ تھی اس کا تعلق پس ماندہ دکن کی چھوٹی چھوٹی حکومتوں سے تھا جبکہ اُردوئے معلّی عظیم مغل سلطنت کے ذی شان دارالحکومت شاہ جہان آباد کی زبان تھی ۔ اسی لیے وہ فصیح تھی اور سند بھی ۔ سوچ کا یہی انداز قائم چاند پوری کے اس مشہور شعر سے بھی عیاں ہے :

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ

اک بات لچر سی بزبان دکنی تھی

شیخ سعد اللہ گلشن کے قول اور قائم کے اس مقطع سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ اب تک ریختہ شاعری (بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ غزل) کے لیے استعمال ہو رہا تھا جبکہ اُردو زبان کے لیے دکنی اور اُردوئے معلّی ملتے ہیں، چنانچہ میر نے نکات الشعرا (۱۷۵۲ء) اور قائم کے مخزن نکات (۱۷۵۷ء) دونوں میں زبان کے لیے "اُردوئے معلّی" یا "اردوئے معلّی کے محاورے کے مطابق" لکھا گیا ہے ۔ میر تقی میر کے فرزند میر کلو عرش (نام میر حسن عسکری) کا یہ شعر ملاحظہ ہو جس میں زبان کے لیے اُردوئے معلی لایا گیا ہے :

ہم ہیں اردوئے معلّی کے زباںداں اے عرشؔ
مستند ہے جو کچھ ارشاد کیا کرتے ہیں[59]

اُردوئے معلّی خوب صورت اصطلاح اور شاعرانہ ترکیب تھی، لیکن زبان زدِ عوام نہ ہوسکتی تھی۔ چنانچہ عوامی زبان پر یہ مختصر ہوکر اُردو رہ گئی۔ اس عہد کے کئی تذکروں سے اس امر کی شہادت بھی مل جاتی ہے۔ "تذکرہ گلزار ابراہیم" (۱۷۸۶ء) اور مصحفی کے "تذکرہ ہندی" دونوں میں اُردو معلیٰ کی جگہ اُردو مستعمل ہے یہی نہیں بلکہ نثر کے ساتھ ساتھ غزل میں بھی اُردو کا استعمال نظر آجاتا ہے جیسے مصحفی کا یہ مقطع:

خدا رکھے زباں ہم نے سنی ہے میر و مرزا کی
کہیں کس منہ سے ہم اے مصحفی اردو ہماری ہے

ڈاکٹر سیّد عبداللہ کے بقول "غالباً آرزو ہی پہلے مصنف ہیں جن کی تصانیف میں اُردو کا لفظ زبان کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ تحسین (نوطرز مرصع) شاہ مراد لاہوری (نامہ مراد) اور مصحفی کا زمانہ آرزو سے موخر ہے۔ نوادر الالفاظ میں لفظ اُردو کئی موقعوں پر آیا ہے، "مثلاً ہڑبنا بزبان اُردو اہل شہر نسبت شاید زبان قریان و مواضع باشد بدیں معنی نگلنا شہرت دارد....." اُردو کا لفظ خان آرزو کی تصنیف مُثمر میں بھی بعض موقعوں پر استعمال ہوا ہے۔" (مقدمہ نوادر الالفاظ ص ۲۹)۔

ہڑبنا کے معنی کی تشریح سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ گرد و نواح کے مقابلے میں شہر دہلی کی زبان فصیح سمجھی جاتی تھی۔ جبھی تو خان آرزو نے بطور خاص یہ کہا کہ اہل شہر کی زبان پر یہ لفظ نہیں ہے۔

حافظ محمود شیرانی کی تحقیقات کے مطابق "مغربی مصنفین میں مسٹر گل کرائسٹ پہلے شخص ہیں جو اپنی انگریزی تالیف" قواعد زبان ہندوستانی" طبع ۱۷۹۶ عیسوی مطابق ۱۲۱۰ ہجری میں اُردو کا استعمال کرتے ہیں۔ ان کے جملے کا ترجمہ یہ ہے:

" ریختہ وہ مخلوط زبان ہے جس کو اُردو یا دربار کی شستہ زبان بھی

کہتے ہیں۔" [۶۰]

ڈاکٹر گیان چند جین کی تحقیقات کے نتیجے میں "جہاں تک لشکر بازار یا لال قلعے سے

ہٹ کر اُردو کو زبان کے معنی میں استعمال کرنے کا تعلق ہے۔ اس کی قدیم ترین مثال

ہمیں محمدی مائل دہلوی شاگرد قائم کے دیوان میں ملتی ہے اس کا دیوان ۱۱۷۶ھ میں مرتب

ہوا..... اس دیوان میں ایک قطعہ ہے جس کا ذکر محمد اکرام چغتائی نے کیا ہے۔ اس قطعہ میں

کوئی شاعر سے لفظ اردو کے بارے میں پوچھتا ہے۔ شاعر جواب دیتا ہے:

مشہورِ خلق اردو کا تھا ہندوی لقب

اگلے سفینوں بیچ یہ کہاتے ہیں سب لکھ

شاہجہاں کے عہد سے خلقت کے بیچ میں

ہندوی تو نام مٹ گیا اردو لقب چلا

اسی طرح زبان کے معنی میں لکھنے میں لفظ اُردو ۱۱۷۶ھ سے قبل استعمال کیا گیا ہے۔" [۶۱]

حواشی

۱۔ یہاں ۲۲۵ زبانیں اور ۵۰۰ مقامی بولیاں ملتی ہیں۔ ان متعدد زبانوں میں تقریباً پچیس کروڑ انسان آریائی زبانیں بولتے ہیں۔ سات کروڑ دراوڑی، ڈیڑھ کروڑ تبت چینی اور نصف کروڑ منڈا۔ دوسری ہند آریائی زبانوں کو ہندوستان کے تقریباً ۲۳ لاکھ باشندے بولتے ہیں، لیکن آریائی مثلاً بنگالی، مراٹھی۔ ہندی بولنے والوں کی تعداد پچیس کروڑ سے زیادہ ہے۔ (بحوالہ آریائی زبانیں از سدھیشور ورما۔ ص ۹)

۲۔ "پنجاب میں اردو" ص: ۴۳

۳۔ "آریائی زبانیں" ص ۱۲

۴۔ "مقالات حافظ محمود شیرانی" مرتبہ مظہر محمود شیرانی جلد دوئم ص ۱۶

۵۔ 〃 〃 〃 〃 ص ۱۸

۶۔ اس ضمن میں پروفیسر خواجہ احمد فاروقی مقالہ بعنوان "میر کے زمانے میں مشترک تہذیب کے خدوخال" میں لکھتے ہیں: ہندو مصنفین جب کبھی فارسی میں لکھتے ہیں تو بسم اللہ الرحمٰن الرحیم سے شروع کرتے ہیں اور تمہید کے طور پر حمد و نعت ضرور لکھتے ہیں اسی طرح جب مسلمان ہندی میں لکھتے ہیں تو ابتدا میں شری گنیش جی اور سرسوتی جی کی تعریف و توصیف ضرور کرتے ہیں کشور پریم کشور فراقی کا نجی روزنامہ "وقائع عام شاہی" رام پور سے چھپ گیا ہے۔ اس کی ابتدا بسم اللہ الرحمٰن الرحیم یا فتاح حمد و ثنا اور درود تحیات و سلام سے ہوتی ہے اگر مصنف کا نام نہ معلوم ہو تو آغاز دیکھ کر یہ پہچاننا مشکل ہے کہ لکھنے والا ہندو ہے یا مسلمان" ("اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب" مرتبہ: ڈاکٹر کامل قریشی۔ ص ۱۰۹)

۷۔ ایضاً۔ ص ۲۲۹

۸۔ "مقالات حافظ محمود شیرانی" جلد دوم ص ۱۴۳

۹۔ ایضاً ص ۶۰

۱۰۔ "تاریخ ادب اُردو جلد اوّل" ص ۱۶

۱۱۔ ڈاکٹر رام آسرا راز: "اُردو اور ہندی کا لسانیاتی رشتہ" ص ۴۰

۱۲۔ ایضاً ص ۴۰

۱۳۔ "اردوئے معلّی" (قدیم اُردو نمبر شمارہ ۴۹)

۱۴۔ بعض اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ ایک ہی سانس میں ہندی اور ریختہ کا لفظ استعمال کیا گیا جیسے "عبدالغفور نساخ نے رسالہ زبان ریختہ (تاریخی نام) ۱۲۷۵ ہجری/۱۸۵۰ عیسوی میں یہ لکھا۔ "غرض محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں نظم ہندی کا بڑا رواج ہوا اور بیشتر اہلِ علم ریختہ کہنے لگے۔"

۱۵۔ "امیر خسرو کا ہندوی کلام" مطبوعہ سہ ماہی "غالب"، کراچی، جنوری، مارچ ۱۹۷۷ء

۱۶۔ ترجمہ محمد رفیق عابد ص ۹۴ - ۱۹۵

۱۷۔ ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصّہ ص ۱۵

۱۸۔ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی۔ ص ۱۵۷

۱۹۔ "مضامین پریم چند" مرتبہ: عتیق احمد۔ ص ۱۹۲ - ۱۹۳

۲۰۔ بقول قائم:

اے گردشِ زمانہ تیری کج روی کے بیچ ... یکسر نواحِ ہند سے شعر و سخن گیا

۲۱۔ جرأت نے قائم کے انتقال کی تاریخ میں کہا تھا:

جرأت نے کہی رو کے یہ تاریخ وفات ..... یکتائی کے ساتھ

قائم بنیادِ شعرِ ہندی نہ رہی ..... کیا کہیے اب آہ (۱۰۲۸ھ)

۲۲۔ بحوالہ محمد نعیم اللہ خیالؔ، "اُردو ایک ہمہ گیر زبان" ص ۴۲

۲۳۔ "کربل کتھا" شعبہ اُردو، دہلی یونیورسٹی، ص ۲۵

۲۴۔ "کربل کتھا" شعبہ اُردو، دہلی یونیورسٹی، ص ۲۸

۲۵۔ ایضاً ۔ ص ۳۲ کربل کتھا کی لسانی اہمیت کے لیے اُردو معلّیٰ (قدیم اُردو نمبر شمارہ: ۹) میں مطبوعہ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مقالہ 'کربل کتھا کی زبان' اور ڈاکٹر خلیق انجم کا مقالہ 'کربل کتھا کا لسانی مطالعہ' ملاحظہ ہو۔

۲۶ " اردو کا روپ" ص ۹۶ - ۹۷

۲۷ ۔ اویس احمد ادیب، "تنقیدی مطالعے" ص ۲۳۸

۲۸۔ خود بارلے بھی "COLLOQUIAL - HIDUSTANI" (لندن ۱۹۴۴ء) کا مؤلف ہے۔

نوٹ: مختلف انگریز مصنفوں کا ہندوستانی کا املا بھی قابلِ غور ہے۔

۲۹۔ مقالات حافظ محمود شیرانی جلد ۲ ص: ۹، ۱۰

۳۰۔ "ازبک اور اُردو زبانوں میں مشترک الفاظ" مطبوعہ اُردو معلّیٰ قدیم اُردو نمبر۔

مقالہ نگار کے حواشی:

ا۔ "ترکی زبان کو ہم موجودہ ازبک زبان کی پرانی شکل سمجھتے ہیں جس کو چغتائی بھی کہتے ہیں۔

ب۔ "بابر کو ازبکستان کے لوگ ایک بہت مشہور ازبک شاعر کی حیثیت سے جانتے ہیں۔ اس کی چغتائی میں غزلوں کو نہ صرف ازبک میں مقبولیت ملی بلکہ سوویت یونین کی زبانوں میں اس کا ترجمہ ہو چکا ہے"۔

۳۱۔ بقول فرمان فتح پوری "۱۲۷۵ھ مطابق ۱۸۵۸ء میں تکمیل کو پہنچا اور مطبع نول کشور لکھنؤ سے پہلے ۱۸۷۲ء میں اور بعد ازاں ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا"۔

۳۲۔ "ڈاکٹر انصار اللہ ناظر نے مفید مقدمہ اور حواشی کے ساتھ اسے ۱۹۷۷ء میں علی گڑھ سے شائع کیا" نگار پاکستان کراچی جنوری ۱۹۸۸ء

۳۳۔ نگار پاکستان حوالہ بالا۔

۳۴۔ اس کے برعکس ...

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میر — یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

۲۵۔ اس سے یہ ظاہر ہو جاتا ہے کہ میر اُردو زبان کو ہندی اور اُردو شاعری کو ریختہ کہتے ہیں۔ جیسا کہ وہ اپنے ایک شعر میں بھی لکھ چکے ہیں:

سرسبز ملک ہند میں ایسا ہوا کہ میر — یہ ریختہ لکھا ہوا تیرا دکن گیا

۲۶۔ وادین مرتب کی ہیں۔

۲۷۔ تذکرہ مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی ص ۱۵۷

۲۸۔ تذکرہ مطبوعہ اتر پردیش اُردو اکیڈمی لکھنو ۱۹۸۵ء

۲۹۔ مطبوعہ سنگ میل پبلی کیشنز لاہور

۴۰۔ مقالات حافظ محمود شیرانی جلد دوئم ص ۲۷

۴۱۔ "تاریخ ادب اُردو" جلد اوّل ص ۲۵ - ۲۴

۴۲۔ "آبِ حیات" میں مصرعہ ثانی یوں ہے:

گفتا کہ دُر ہو بادرے اس شہر کی یہ ریت ہے

۴۳۔ حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اُردو" (ص ۱۷۴) میں ایک بیاض سے خسرو سے منسوب ایک غزل درج کی ہے اس میں بھی اس مفہوم کا ایک شعر ملتا ہے جو درج ہے۔ شیرانی اسے خسرو کی غزل تسلیم نہیں کرتے:

میرا جو من تم نے لیا تم نے اٹھا غم کوں دیا — غم نے مجھے ایسا کیا جیسا پتنگا آگ پر

۴۴۔ ناسخ نے رسالہ زبانِ ریختہ میں یہ مصرعہ یوں درج کیا ہے۔

تم یہ کیا ہم وہ کیا یہ ہی جگت کی ریت ہے

۴۵۔ مقالاتِ حافظ محمود شیرانی (جلد اول) میں مصرعہ ثانی یوں ہے:

شیر و شکر ہم ریختہ ہم ریختہ ہم گیت ہے

۴۶۔ نگار پاکستان، کراچی، جنوری ۱۹۸۸ء

۴۷۔ علی لطف میرزا : تذکرہ گلشن ہند ص ۶

۴۸۔ نکات الشعراء ، لکھنو ، اتر پردیش اردو اکادمی ۔ ص ۱۱

۴۹۔ "پنجاب میں اردو" ص ۳۳ - ۳۲

۵۰۔ اردوئے قدیم ، ص ۱۲۰

۵۱۔ "سویرا" ، لاہور ، شمارہ ۵۲ - ۵۰ ، مئی ۱۹۷۶ء

۵۲۔ مقالات حافظ محمود شیرانی ، جلد اول ، ص ۱۱

۵۳۔ "لفظ کمیداں کی تحقیق" مطبوعہ ، اخبار اردو ، کراچی ، فروری ۱۹۸۳ء

۵۴۔ لغت کا نام ہے : "SIR GERARO CLAUSON" AN ETYMOLOGI CAL DICTIONARY OF THIRTEENTH CENTURY TURKISH" OXFORD, 1972 P. 203

(حاشیہ مصنف)

۵۵۔ مقالات حافظ محمود شیرانی ، جلد اول ص ۲۰

۵۶۔ ایضاً " " "

۵۷۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ : اردو نثر کا آغاز وارتقا" ص ۱۸

۵۸۔ "عمل صالح" جلد ۳ ۔ ص : ۴۹۴ ۔ ۵۱۵

۵۹۔ جبکہ باپ نے کہا تھا :

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا مستند ہے میرا فرمایا ہوا

۶۰۔ حوالہ سابق ص : ۲۶۱

۶۱۔ "حقائق" ۔ ص ۳۴۷

۳۔ اُردُو زبان کا آغاز

پوچھنا تاریخ سے پیدائشِ اُردو کا حال!
کمسنوں سے ہے بزرگوں کی ولادت کا سوال
جس زباں کی آفرینش کا تجھے آئے خیال
اس کے اسبابْ و علل اور فلسفے کو دیکھ بھال
ملک میں اردو زباں افواج کی بھرتی نہ تھی
یک بیک الفاظ کی بارش ہوا کرتی نہ تھی

(ناطق لکھنوی)

ماضی کی گپھا

اردو کے آغاز، نشوونما اور ارتقاء کی داستان بہت طویل ہے۔ اس میں تاریخی انقلابات، تہذیبی تغیرات اور تمدنی کروٹوں کے لہر در لہر سلسلے شامل ہیں۔ اگرچہ اس کے آغاز کو مختلف خطوں (پنجاب، دکن، سندھ) سے مشروط کرنے کا رجحان خاصہ قوی نظر آتا ہے اور اپنے نظریہ کی توثیق میں لسانی شواہد کی فراہمی میں ماہرینِ لسانیات نے جو محنت کی اس کی اہمیت تسلیم مگر لسانی موشگافیوں سے قطع نظر اردو کا آغاز تو اسی روز ہوگیا تھا جب اس خطۂ ارض پر انسانی حلق سے پہلا لفظ ادا ہوا تھا۔ وہ لفظ ادا کرنے والا کون تھا؟ اس کا تعلق کس قبیلے، کس نسل یا علاقے سے تھا؟ وہ لفظ بعد میں کس زبان سے وابستہ قرار

پا یا ؟ یہ واقعہ کب رونما ہوا ؟ یہ سب بعد کی باتیں تاریخی تحقیقات اور لسانی اُن
آج ہم جس شجر سایہ دار کو اردو زبان کا نام دیتے ہیں۔ اس کا بیج ہزاروں برس قبل
اسی خطہ میں اس وقت بویا گیا جب تاریخ کا طلوع نہ ہوا تھا۔ واضح رہے کہ بن ماہرین
نے قدیم اور زمانہ قبل تاریخ کے بارے میں تحقیقات کی ہیں وہ مختلف شواہد کی بنا پر
اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ پہلا انسان موجودہ پنجاب کے علاقے میں آباد ہوا تھا۔ اس ضمن میں
وادی سوان کا بطور خاص نام لیا جاتا ہے جب پہلا آدمی کہتے ہیں تو دو چار ہزار برس کی
بات نہیں ہوتی بلکہ ہزاروں برس پر محیط ماضی بعید کا قصہ ہے۔ جب انسان جنگلی جانوروں
کی سطح سے قدرے بلند ہو کر دورِ حجر میں داخل ہوا۔ رشید اختر ندوی "ارضِ پاکستان
کی تاریخ" میں مستند حوالوں کی روشنی میں یہ بیان کرتے ہیں؛

"نئے دور کے علمائے تاریخ بیل کیمبرج ایکسپیڈیشن ۱۹۳۵ء کے بے حد ممنون ہیں
جس کے سبب آریوں کے پہلے سے باشندگان پنجاب اور سندھ کے بارے میں بہت
وزنی معلومات میسر آئی ہیں اور ان معلومات کی روشنی میں کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں پہلا
آدمی شمال مغربی پہاڑی دامنوں میں آباد تھا۔ یہ پہاڑی دامن وہ ہیں جنہیں دریائے ہڑو
اور دریائے سون سیراب کرتے ہیں۔ یعنی موجودہ راولپنڈی اور اٹک کے اضلاع اور
دوسرے دامن جموں سیالکوٹ اور پونچھ ہیں۔ ان دامنوں میں ان علمائے تاریخ کی رُو سے
انسان پہلے درمیانی برفانی عہد کے آخر اور ثانی برفانی دور کے شروع میں رہتا تھا۔"[۱]

جبکہ ویدک ایج کے ایک مقالہ نگار پروفیسر سنکلیا کا بیان ہے کہ پہلا آدمی پنجاب کی سرزمین
میں دورِ حجر اول کے پہلے حصے یا دوسرے برفانی عہد سے لے کر چوتھے برفانی عہد اور اس
کے درمیان وقفوں میں گو متواتر اور مسلسل آباد رہا تھا۔ لیکن یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ پہلا
آدمی یا پنجاب کا پہلا آبادکار ایک ہی نسل سے تھا یا مختلف النسل تھا اور آیا پہلی نسل جب
ختم ہوئی تو دوسری نسل نے اس کی جگہ لی یا متعدد نسلیں ایک ساتھ اس سرزمین میں آباد

رہی تھیں۔ ۲۰

آج یہ عہد ہم سے اتنا دور ہے کہ اس کا تصور بھی ممکن نہیں لیکن اتنا تو باور کیا جاسکتا ہے کہ خواہ وہ انسان ہمارے معیار کی رو سے جانوروں سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو لیکن وہ پھر بھی کسی نہ کسی اندازِ تکلم کا تو حامل ہوگا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ دو عورتیں بیٹھی ہوں اور وہ خاموش ہوں خواہ وہ عہدِ حجر کی عورتیں ہی کیوں نہ ہوں۔

کسی بھی زبان کو لے لیں وہ اپنی انفرادی حیثیت میں کبھی بھی دیگر لسانی اثرات سے آزاد اور تمدنی تغیرات سے محفوظ ہوا بند ڈبے میں محفوظ نہیں ملتی بلکہ ایک زندہ عضویت کی مانند متنوع بلکہ متضاد اور بعض اوقات تو متناقض عوامل سے اثرات قبول کرتی مدارج ارتقا طے کرتی جاتی ہے۔ اگر زبان کو سمندر سے تشبیہ دی جائے تو جیسے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے دریا اس میں آکر گرتے ہیں۔ ان دریاؤں نے کتنے پہاڑوں کی برف سمیٹی، کتنی جھیلوں کے پانیوں سے دامن میں کشادگی پیدا کی۔ کتنے ندی نالوں کو ہمسفر کیا، کتنے سیلابوں رداشت کیا، ساحل سے سر پٹکتی کف آلود لہر سے کبھی بھی اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ بادی النظر میں تو وہ ہزاروں قطروں سے تشکیل پانے والی ایک لہر ہوتی ہے۔ کچھ یہی عالم اس زبان کا ہوتا ہے جسے ہم مکمل حالت میں پاتے ہیں۔ شاید زبان کو حالت میں کہنا درست نہ ہوگا۔ اس لیے کہ زبان ایک زندہ سماجی وقوعہ ہے جس زندہ انسانوں کے اعمال سے تعلق ہوتا ہے۔ یہ ان کے دکھ، درد، خوشی، مسرت، غور و فکر بات، احساسات اور ان سے بھی بڑھ کر ان کی تخلیقی سرگرمیوں کی امین ہوتی ہے۔ لیے انسانوں اور معاشرے کے ارتقا کے ساتھ ساتھ زبان بھی بڑھتی، پھلتی پھولتی ل ارتقا طے کرتی جاتی ہے۔ جس طرح کائنات میں دمادم صدائے کن فیکون کی گونج ہے اور انسانیت خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہوتی ہے، اسی طرح، زبان بھی ن کے بہاؤ کے ساتھ بنتی سنورتی اور نکھرتی رہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ زمانے کے

رہی تھیں۔[۲]

آج یہ عہد ہم سے اتنا دور ہے کہ اس کا تصور بھی ممکن نہیں لیکن اتنا تو باور کیا جا سکتا ہے کہ خواہ وہ انسان ہمارے معیار کی رو سے جانوروں سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو لیکن وہ پھر بھی کسی نہ کسی اندازِ تکلم کا تو حامل ہو گا۔ بھلا یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ مورتیں بیٹھی ہوں اور وہ خاموش ہوں خواہ وہ عہد حجر کی عورتیں ہی کیوں نہ ہوں۔

کسی بھی زبان کو لے لیں وہ اپنی انفرادی حیثیت میں کبھی بھی دیگر لسانی اثرات سے آزاد اور تمدنی تغیرات سے محفوظ ہوا بند ڈبے میں محفوظ نہیں ملتی بلکہ ایک زندہ عضویت کی مانند متنوع بلکہ متضاد اور بعض اوقات تو متناقض عوامل سے اثرات قبول کرتی مدارج ارتقا طے کرتی جاتی ہے۔ اگر زبان کو سمندر سے تشبیہہ دی جائے تو جیسے مختلف علاقوں سے آئے ہوئے دریا اس میں آ کر گرتے ہیں۔ ان دریاؤں نے کتنے پہاڑوں کی برف سمیٹی، کتنی جھیلوں کے پانیوں سے دامن میں کشادگی پیدا کی۔ کتنے ندی نالوں کو ہمسفر کیا، کتنے سیلابوں کو شانت کیا، ساحل سے سر پٹکتی کف آلود لہر سے کبھی بھی اس بات کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا کہ بادی النظر میں تو وہ ہزاروں قطروں سے تشکیل پانے والی ایک لہر ہوتی ہے۔ کچھ یہی عالم اس زبان کا ہوتا ہے جسے ہم مکمل حالت میں پاتے ہیں۔ شاید زبان کو مکمل حالت میں کہنا درست نہ ہو گا۔ اس لیے کہ زبان ایک زندہ سماجی وقوعہ ہے جس کا زندہ انسانوں کے اعمال سے تعلق ہوتا ہے۔ یہ ان کے دکھ، درد، خوشی، مسرت، غور و فکر، جذبات، احساسات اور ان سے بھی بڑھ کر ان کی تخلیقی سرگرمیوں کی امین ہوتی ہے۔ اس لیے انسانوں اور معاشرے کے ارتقا کے ساتھ ساتھ زبان بھی بڑھتی، پھلتی پھولتی مراحلِ ارتقا طے کرتی جاتی ہے۔ جس طرح کائنات میں دمادم صدائے کن فیکون کی گونج رہتی ہے اور انسانیت خوب سے خوب تر کی جستجو میں ہوتی ہے، اسی طرح، زبان بھی وقت کے بہاؤ کے ساتھ بنتی سنورتی اور نکھرتی رہتی ہے۔ یہی نہیں بلکہ زمانے کے

چلن اور عصری تقاضوں کی ہمنوائی میں انداز تزئین بھی بدلتی جاتی ہے۔ یوں دیکھیں تو زبان بھی کسی طرح دارحسینہ سے کم نہیں۔ آرائش جمال سے فارغ نہیں ہوتی۔

لہذا زبان کو مکمل ہونے کی بجائے نشو و نما یافتہ یا ترقی یافتہ کہہ سکتے ہیں بطور مثال اردو یا کسی بھی نشوونما یافتہ زبان کو لے لیں۔ آج اس کے آغاز کے بارے میں قطعی طور سے حکم لگانا اگر ناممکن نہیں تو دشوار یقیناً ہو گا۔ وہی سمندر والی مثال۔ پانی کی لہر کو چھلنی میں چھان کر یہ نہیں بتایا جا سکتا کہ یہ کس دریا کی بچھڑی موج ہے۔ یہی حال بحر اللسان کی موج کا ہے۔ اردو کا کوئی عام سا فقرہ لے لیں۔ اس فقرہ کا ہر لفظ جداگانہ روداد بیان کرے گا۔ ایسی روداد جس کا آغاز شاید ہزاروں سال قبل ہوا ہو۔

قافلۂ سخت جاں

آج یہ الفاظ ہماری روزمرہ کی گفتگو میں عام استعمال ہوتے ہیں۔ نانا، نانی، ماما، مامی، پھوپھا، پھوپھو، سالا، سالی، موسی، بَرہ (بمعنی دولہا)، پیڑھی (بمعنی نسل)، نتھ گہنا، آنچل، دھسہ، لوڑا، کوس، ببول، بڑ، دھتورا، ککڑی، کریلا، نیم، پستہ، آوا، بھٹی، پینڈا، آرا، ڈنڈا، برچھا، ڈھال، لوہنی، کھوجی، جھونپڑی، دالان، پھاٹک، بھاڑا، چھیلا، چنٹر، دھندا، ڈھیلا، ڈھارس، ڈھیٹ، گیرو، لاگ، مرت، مورکھ، منڈلی، ناٹا، سنج، روڑا، اڑوس پڑوس، دھوم دھام، کھٹ پٹ۔[3] کیا آپ کو یہ معلوم ہے کہ یہ اور ان جیسے لاتعداد الفاظ اس منڈاوی زبان کے ہیں جو ہمارے علاقے میں آریاؤں بلکہ دراوڑوں سے بھی پہلے بولی جاتی تھی۔ یہ منڈا قبائل کی زبان تھی اور آج سے تقریباً چھ ہزار برس قبل رائج تھی۔ عین الحق فرید کوٹی منڈا قبائل اور ان کی زبان کی قدامت کے بارے میں یہ معلومات بہم پہنچاتے ہیں؛

"عام طور پہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ منڈا قبائل برصغیر کے قدیم ترین باشندے

ہیں اور دراوڑوں کی آمد سے قبل یہاں آباد تھے۔ ماہرین منڈا قبائل کو قدیم آسٹریلوی نسل سے منسلک قرار دیتے ہیں جو کہ ایک وقت نیوزی لینڈ سے لے کر پنجاب تک پھیلی ہوئی تھی۔ برصغیر کا منڈا گروہ کول بھیل سنتھال' منڈا سامدا' ہو، کورواجانگ اور کورکو وغیرہ قبائل پر مشتمل ہے.......

گو آمری نال تہذیب (یعنی منڈا قبائل کی تہذیب) کی ابتدا ماضی کے دھندلکوں میں گم ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کی آخری منازل کے اثرات تقریباً دو ہزار دو سو ق.م تک موجود ملتے ہیں۔ جس کے بعد ہڑپائی تہذیب میں مدغم ہو جاتی ہے۔ اس کا ابتدائی دور حجری عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ لیکن آخری مراحل میں کانسی عہد کے اثرات بھی سامنے آتے ہیں جنہیں ہم غالباً ہڑپائی تہذیب سے تعلقات کا نتیجہ قرار دے سکتے ہیں۔ اس دور میں ابھی تک فنِ تحریر نے جنم نہیں لیا تھا اور فنِ تعمیر میں بھی پختگی نہیں آئی تھی۔"[4]

جبکہ رشید اختر ندوی نے مغربی محققین کی جدید تحقیقات کی روشنی میں یہ لکھا ہے:

"ارضِ پاکستان کے سب سے پہلے آباد کار وہ سیاہ فام لوگ تھے جو برفانی عہد میں افریقہ اور ملیشا سے یہاں پہنچے اور کسی ایک حصے میں نہیں بلکہ پورے ملک میں پھیل گئے تھے۔ ارضِ پاکستان کی سب سے پہلی آبادیاں ان لوگوں کی تھیں جو کولیری یا منڈا زبانیں بولتے تھے اور جو انڈو چائنا نسل کے ایک گروہ مون کھمیر سے متعلق تھے۔"[5]

محمد مجیب کے بموجب "ہندوستان کے وحشی قبیلے دو حصوں میں تقسیم کیے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو منڈا زبانیں بولتے ہیں۔ چھوٹا ناگ پور، سنتھال، پرگنوں مہادیو پہاڑیوں اور صوبہ مدراس کے بعض شمالی ضلعوں میں ملتے ہیں جیسے کہ سنتھال گونڈ بھیل منڈا ہو۔ دوسرے وہ ہیں جو مون خمیر زبانیں بولتے ہیں اور آسام میں کھاسی پہاڑیوں میں آباد ہیں۔ جیسے کہ ناگ اور کھاسی۔"[6]

دیکھا آپ نے لفظ کا سفر کتنا طویل ہوتا ہے۔ متعدد الفاظ میں سے یہ چند منتخب الفاظ اس امر کا ثبوت ہیں کہ لفظ کی زندگی عوامی استعمال سے مشروط ہوتی ہے اور وہ اسی صورت میں ہزاروں سال تک زندہ رہ سکتا ہے اگر وہ ہزاروں سال تک فعال رہ کر لوک زبان رہے۔ یوں اگر ایک طرف لفظ جذبات و احساسات کو زندگی بخشتا ہے تو دوسری طرف اس عمل سے وہ خود بھی زندگی پا لیتا ہے۔ آباء اپنا ورثہ لفظ کی صورت میں بھی چھوڑ جاتے ہیں اور الفاظ کے ذریعے سے بھی۔ آنے والی نسلیں اس ورثے سے استفادہ کے ساتھ ساتھ اس میں حتی المقدور اضافہ بھی کرتی ہیں (یا انہیں کرنا چاہیئے) یہ اضافہ جب تخلیقی سطح پر ہوتا ہے تو ثقافتی ورثہ اور تہذیبی روایات کی صورت اختیار کر جاتا ہے لفظ اس ورثے کے تحفظ اور اگلی نسلوں کو منتقلی کے ضمن میں بنیادی کردار ادا کرتا ہے اس لیے کہ لفظ وہ محور ہے جس پر تہذیبی روایات تمدنی اقدار اور تخلیقی صلاحیتوں کے سیارے گردش کناں ملتے ہیں۔

اقوام اور تہذیب و تمدن کی مانند زبان کی بھی اپنی مخصوص تاریخ ہوتی ہے۔ ایسی تاریخ جو بظاہر تو اقوام اور تہذیب و تمدن سے مربوط نظر آتی ہے (بلکہ بعض صورتوں میں ان ہی سے نام بھی پاتی ہے) لیکن درحقیقت وہی تہذیب و تمدن کے انداز بھی متعین کرتی ہے۔ یہ انداز تخلیقی سطح پر طے پاتے ہیں جس طرح قوموں کو سونا نہیں افراد امیر بناتے ہیں۔ اسی طرح زبان کو الفاظ (اپنی عام فہم اور سادہ صورت کے علاوہ) استعارات، علامات، تلمیحات اور صنائع لفظی و معنوی کی صورت میں تونگر بناتے ہیں۔ یوں دیکھیں تو اردو کے آغاز کی داستان لفظ کی حکایت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

لسانی تحقیق: تناظر

جہاں تک اردو لسانیات میں اردو زبان کے آغاز کے بارے میں تحقیقات اور ان کی روشنی میں نظریہ سازی کا تعلق ہے تو آج یعنی ۱۹۹۳ء تک اس کی عمر صرف ۶۶ برس بنتی

ہے (حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اردو" ۱۹۲۸ء میں طبع ہوئی تھی، اگرچہ "دکن میں اردو" ۱۹۲۳ء میں چھپی مگر لسانی اہمیت کے مواد، لسانیات کے سائنٹیفک تصور اور نظریہ سازی کی بناء پر "پنجاب میں اردو" کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ دیکھا جائے تو لسانی تحقیقات اور زبان کے تجزیاتی مطالعہ کے لحاظ سے یہ عرصہ زیادہ نہیں لیکن جس زبان میں خود نثر کی عمر ۱۹۲ برس (میر امن کی باغ و بہار ۱۸۰۱ء) جس میں تنقید کی عمر سو برس (حالی کا "مقدمہ شعر و شاعری" ۱۸۹۳ء) ہو تو اس میں لسانی نظریہ سازی کی اتنی عمر بھی غنیمت ہے۔ البتہ انگریزوں اور دیگر مغربی مستشرقین کے کام سے قطع نظر کر کے صرف اردو مصنفین کو لیں تو انشا کی "دریائے لطافت" کو پہلی کتاب قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہر چند کہ یہ فارسی میں لکھی گئی۔

تحقیقی نقطہ نظر سے اردو لسانیات کا سرمایہ مخطوطات، قدیم مسودات اور قلمی بیاضوں کی صورت میں ملتا ہے اور ان ہی پہ ماہرین لسانیات کی تحقیقات کی اساس استوار نظر آتی ہے۔ ان کے بعد کسی حد تک آثار قدیمہ، کتبے، سکے، فرامین اور اسی نوع کے دیگر تاریخی شواہد سے بھی کام لیا جاتا ہے۔ لیکن اس نوع کے شواہد کی تفہیم اور ان سے وابستہ تاریخی کوائف کی چھان پھٹک کے لیے جس خصوصی تربیت کی ضرورت ہوتی ہے ہمارے لسانی محققین میں سے حافظ محمود شیرانی کی استثنائی مثال سے قطع نظر شاید ہی اور کوئی محقق ان کی سوجھ بوجھ رکھتا ہو۔ البتہ مخطوطات، مسودات اور بیاضوں کے ضمن کیلگی تحقیق میں ہمارے لسانی محققین نے خصوصی کارکردگی کا مظاہرہ کیا اور یقیناً یہ ان حضرات کی محنت (بلکہ مشقت) کا ثمر ہے جو آج اردو لسانیات میں تحقیقات کا دائرہ اتنا وسیع نظر آتا ہے سرفہرست یقیناً حافظ محمود شیرانی ہیں ان کے بعد نصیر الدین ہاشمی، مولوی عبدالحق، مسعود حسن رضوی ادیب، مسعود حسین خاں، قاضی عبدالودود، محی الدین قادری زور، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، مشفق خواجہ، اکرام چغتائی، رشید حسن خاں، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ جیسے محققین کے اسماء قابل ذکر ہیں۔ ان کی کاوشوں کی بناء پہ ایسے لاتعداد شعرا، نثر نگاروں اور کتب کی "دریافت نو" ہو گئی جو مخطوطوں اور بیاضوں

میں گویا دفن ہو چکے تھے۔ اس سے تاریخ ادب کے آفاق میں وسعت کے ساتھ ساتھ لسانی اہمیت کا مواد بھی دستیاب ہوگیا۔ ایسا مواد جس سے ادبی مورخین، تاریخی مورخین اور لسانی ماہرین اب تک استفادہ کر رہے ہیں۔

اردو زبان کے آغاز اور ابتدائی نشو و نما سے وابستہ مباحث کے لحاظ سے بیشتر ماہرین لسانیات میں اسے کسی خاص خطے سے مشروط کرنے کا رجحان قوی تر نظر آتا ہے۔ چنانچہ پنجاب (حافظ محمود شیرانی "پنجاب میں اردو")، دکن (نصیر الدین ہاشمی "دکن میں اردو")، سندھ (سید سلیمان ندوی "نقوش سلیمانی") کو اردو کی جنم بھومی ثابت کرنے کے لیے جو نظریات پیش کیے گئے ہیں انہیں خصوصی شہرت حاصل ہے بلکہ بیشتر لسانی مباحث بھی انہیں نظریات کی ضمنی پیداوار قرار پاتے ہیں۔ ظاہر ہے کسی نظریہ میں بھی کلی صداقت نہیں ہو سکتی جبکہ ناکافی شواہد کے باوجود (یا پھر ان ہی کے باعث) جزوی صداقت سب میں نظر آجاتی ہے۔

کسی خاص خطے یا مقام سے اردو زبان کو مخصوص کرنے کے پہلو بہ پہلو ان ماہرین کے لسانی نظریات بھی ملتے ہیں جنہوں نے اردو کا کسی خاص بولی یا زبان سے ٹانکا پھر دیا۔ اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد (برج بھاشا) ڈاکٹر شوکت سبزواری (قدیم ویدک بولی)، ڈاکٹر مسعود حسین خاں (ہریانوی)، ڈاکٹر سہیل بخاری (مرہٹی) اور عین الحق فرید کوٹی (دراوڑی) کے تصورات خصوصی تذکرہ چاہتے ہیں۔

آغاز: مقامی نظریات

پنجاب میں اردو

بلکہ قصرِ ہند کا پہلا ہی در پنجاب تھا
اس لیے اُردو کا اوّل مستقر پنجاب تھا

نقطۂ مرحوم پئے اہلِ نظر پنجاب تھا
دائرہ تھا دور تک مرکز مگر پنجاب تھا
جیسے خط رخ کا بڑھے ابرو کی جدول چھوڑ کر
بڑھ چلا یوں نقشِ ثانی، نقشِ اول چھوڑ کر
تخم جو الفاظ کے بوئے گئے پنجاب میں
ہر طرف بہتے پھرے وہ جنگ کے سیلاب میں

(حکیم ناطق لکھنوی)

اگرچہ حافظ محمود شیرانی کی کتاب "پنجاب میں اردو" سے اس لسانی بحث کا آغاز ہوا کہ سب سے پہلے اردو کے شجر کی تخم پاشی اور آبیاری اس خطے میں ہوئی لیکن اس لسانی بحث سے قطع نظر بھی پنجاب میں اردو کی روایت ملتی ہے۔ ایسی روایت جس کا مخطوطات اور قدیم قلمی بیاضوں میں دفن لسانی مواد سے کوئی تعلق نہیں بلکہ یہ تخلیقی ادب کی زندہ روایت ہے۔

اہلِ زبان کا دوبئی: پنجاب

مسلم حکمرانوں کے عہد میں پہلے دہلی (اور کچھ عرصے کے لیے لکھنو) کے دارالحکومت رہنے کی وجہ سے یہ شہر تہذیب و تمدن اور ادب و شائستگی کا گہوارہ بنے رہے۔ چنانچہ مغل سلطنت کے زوال کے باوجود دہلی کی مرکزی حیثیت قائم رہی۔ ۱۸۵۷ء کے بعد جب بساط الٹی تو سب کچھ تلپٹ ہو کر رہ گیا۔ انگریزی اقتدار میں بدلے حالات کے تحت دہلی کے بجائے علی گڑھ سرسید کی احیاءِ علوم کی تحریک کا مرکز بنتا ہے۔ حالی پانی پت کے تھے اس لیے وہ "مقدمہ شعر و شاعری" میں لکھنوی شعراء پر اعتراضات کرنے کی جرأت کر سکے۔ ان دو شہروں کے بعد جامعہ عثمانیہ کی صورت میں حیدر آباد دکن نثر کے فروغ، تراجم اور سائنسی علوم کے مطالعات کا مرکز بنتا ہے۔ بالفاظِ دیگر دہلی اور لکھنو کے باشندوں کے ہاتھوں سے ادب و ثقافت کی

قیادت نکل چکی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ انہیں اس کا احساس تک نہ ہو سکا اور وہ تذکیرو تانیث کی بحثوں ہی میں الجھے رہے۔ حتیٰ کہ ۱۹۴۷ء میں پنجاب کے شرنارتھیوں اور بعد میں سکھ تانگے والوں نے لکھنو کو گویا لاہور کا بھاٹی بنا دیا۔ یوں کہ اب قدیم لکھنو صرف فلموں میں دیکھنے کو ملتا ہے۔

۱۸۵۷ء کے بعد دہلی، لکھنو اور دیگر علاقوں کے تباہ حال شرفا اور تعلیم یافتہ مگر بے کار نوجوانوں کے لیے پنجاب نے ایک طرح سے دوبئی کی صورت اختیار کر لی تھی کہ اس عہد کے بعض لٹے پٹے شرفا نے لاہور میں ملازمت اور عافیت پائی۔ محمد حسین آزاد کا تمام قابلِ ذکر کام لاہور میں ہوا۔ حالی نے پنجاب بک ڈپو میں ملازمت سے انگریزی کی شدبدھ حاصل کی۔ ڈپٹی نذیر احمد بھی کنجاہ (گجرات) میں رہ چکے تھے اور سرسید نے نہ صرف اہل پنجاب کو زندہ دلانِ پنجاب کا خطاب دیا بلکہ مدد اور چندہ مانگنے کے لیے لاہور آئے۔ یہ تو صرف چند معروف شخصیات ہیں ورنہ نہ جانے کتنے ہی لوگ یہاں آئے ہوں گے۔ اگر ایسے اصحاب کا تذکرہ مرتب کیا جائے تو یہ بذاتِ خود ایک تحقیقی موضوع بنتا ہے۔

پنجابیوں نے لوٹ لیا

پنجاب میں اردو زبان سے دلچسپی کی تاریخ خاصی قدیم ہے اور جس کی بنیادی وجہ لاہور کا صوبائی دارالحکومت ہونے کی بنا پہ مختلف تمدنی اور لسانی دھاروں کا امین ہونا ہے۔

حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں حضرت مراد شاہ لاہوری (۱۷۷۲ء، ۱۸۰۰ء) (۱۱۸۶ھ، ۱۲۱۵ھ) کے ایک منظوم خط "نامہ مراد" (۱۷۸۱ء، ۱۱۹۶ھ) کا ذکر کیا ہے۔ جبکہ ڈاکٹر محمد باقر کے بموجب یہ خط ۱۲۰۳ھ میں لکھا گیا۔[1] ان کے والد پیر کرم شاہ (عرف میتا شاہ) شاہ جہان آباد کے نزدیک (۱۷۸۶ء، ۱۲۰۱ھ) میں ڈاکوؤں کے ہاتھوں ہلاک ہو گئے تھے۔ یہ منظوم خط اس واقعہ کی تفصیل ہے۔ گویا یہ خط مزاجاً مثنوی کے قریب ہو جاتا ہے۔ آج اس

خط کی لسانی اہمیت اس بنا پر ہے کہ اس میں زبان کے معنی میں اردو استعمال کیا گیا ہے:

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زبان ہے
کہ جس کا قائل اب سارا جہاں ہے

اس نوع کے شواہد کی روشنی میں یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ ۱۸۵۷ء میں شرفائے دہلی کی آمد سے قبل ہی پنجاب میں اردو گوئی کی روایت ملتی تھی۔ یہی نہیں بلکہ خود پنجاب کا پنجابی ادب بھی "اہل درد" کو متاثر کرتا رہا۔ بقول انشاء:

سنایا رات کو قصہ جو ہیر رانجھا کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

انشاء کے علاوہ بعض دیگر شعراء کے ہاں بھی کسی نہ کسی انداز میں پنجاب کا تذکرہ مل جاتا ہے جیسے بہت پہلے قائمؔ نے کہا تھا:

چھین لیتے ہیں مرے دل کو نگاہوں کے بیچ
حسن رہزن ہے جو پنجاب کی راہوں کے بیچ

جبکہ بقول ذوقؔ:

پنجاب میں بھی وہ نہ رہی آب و تابِ حسن
اے ذوقؔ پانی اب تو وہ ملتان بہہ گیا

ادھر اصلاح زبان کی تحریک کی سب سے اہم شخصیت ناسخؔ لاہور کی پیدائش تھے۔ اب اگر لاہور، دہلی یا لکھنو ثابت نہ ہو سکا تو وجہ ظاہر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دہلی اور لکھنو کے تہذیبی سقوط کے بعد لاہور ہی میں جدید خیالات اور تصوراتِ نو کے چراغ فروزاں ہوئے۔ ۱۸۶۵ء میں انجمن پنجاب کے منظوم مشاعرے اس انداز کی اولیں مساعی تھی۔ ۱۹۰۱ء میں مخزن کا اجراء، علامہ اقبال کی شاعری اور پھر فیض، راشد اور میرا جی جیسی شخصیات، الغرض برصغیر کی تخلیقی سطح پر فکرِ نو کی ہر تحریک کا بلا واسطہ یا بالواسطہ طور پر پنجاب ہی سے تعلق نظر آتا ہے۔

اپنے موضوع کے حوالے سے صرف ادب کی بات ہو رہی ہے ورنہ سیاست، صحافت، موسیقی، مصوری، الغرض ہر معاملے میں پنجاب نے قائدانہ کردار ادا کیا۔

پرانا مسالہ

جب نصیر الدین ہاشمی نے اپنی کتاب "دکن میں اردو" علامہ اقبال کی خدمت میں پیش کی تو انہوں نے کتاب کے بارے میں رائے دیتے ہوئے اس خیال کا بھی اظہار کیا:

"غالباً پنجاب میں بھی کچھ پرانا مسالہ موجود ہے۔ اگر اس کے جمع کرنے میں کسی کو کامیابی ہو گی تو مورّخ اردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے۔"

(مرقومہ: مئی ۱۹۲۵ء)

علامہ اقبال کو اس وقت تک یہ علم نہ ہو گا کہ ایک محقق "پرانا مسالہ" جمع کرنے میں لگا ہوا ہے جو اس خط کے تین برس بعد ایک اہم لسانی نظریہ کی صورت میں مدون ہو کر ایسا سدا بہار نظریہ ثابت ہوا کہ تائیدی اور تردیدی دلائل کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ "دکن میں اردو" سے نہ تو حافظ محمود شیرانی کی اہمیت کم ہوتی ہے اور نہ ہی ان کے کام کی، بلکہ آنے والے ماہرین نے تو ڈاکٹر شوکت سبزواری کی مانند کھل کر ان کی لسانی خدمات کا اعتراف کیا:

"مولانا شیرانی مرحوم کا اردو داں طبقہ کو شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے غالباً اردو میں سب سے پہلے اردو کے چہرہ سے نقاب اٹھا کر اس کے خد و خال کا گہرا حکیمانہ مطالعہ کیا۔ پنجابی، ہریانی، برج بھاشا سے اس کا مقابلہ کر کے اردو داں طبقے کو تقابلی لسانیات کی ہلکی سی جھلک دکھائی۔"[9]

ڈاکٹر شوکت سبزواری یہ تسلیم نہیں کرتے کہ "اردو نے پنجاب میں جنم لیا اور پنجابی کی

بیٹی ہے۔" [۱۰] لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی اس نظریے کو غیر مشروط طور پر تسلیم کرتے ہیں:

"پنجاب کا اردو سے وہی تعلق ہے جو ایک ماں کا اپنی بیٹی سے
ہوتا ہے۔ بیٹی بیاہ کر کہیں چلی جائے لیکن ماں اور بیٹی کا ازلی رشتہ اسی طرح
قائم رہتا ہے اور چونکہ ماں کبھی ڈائن نہیں بن سکتی اس لیے اردو اور اہل
پنجاب کا یہ رشتہ ناتا اسی طرح قائم ہے۔" [۱۱]

معلمِ اوّل

ان آراء پر جب ڈاکٹر خلیق انجم کی یہ رائے مستزاد کر لیں تو بطور لسانی محقق حافظ محمود شیرانی کا مرتبہ و مقام متعین ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر خلیق انجم اپنے مقالہ "ہندوستان میں اردو تحقیق و تدوین کا کام" میں لکھتے ہیں:

"اردو کے پہلے باقاعدہ محقق ہونے کا شرف حافظ محمود شیرانی کو
حاصل ہے۔ آپ اعلیٰ ترین محقق کے لیے کوئی بھی مغربی یا مشرقی معیار قائم
کر لیں، حافظ محمود شیرانی اس پر پورے اتریں گے۔ ادبی تحقیق کی حافظ صاحب
میں جو صلاحیتیں تھیں اور جو علم انہوں نے حاصل کیا تھا وہ ان سے پہلے کسی کو
نصیب ہوا اور نہ ان کے بعد۔" [۱۲]

مالک رام نے بھی "اردو میں تحقیق کا معیار" کے موضوع پر سمپوزیم میں اس رائے کا
[اظہ]ار کیا:

"محمود شیرانی اور پرنسپل محمد شفیع وغیرہ کو بجا طور پر اس میدان میں
ایک طرح سے اولیت کا فخر حاصل ہے۔" [۱۳]

جب کہ رشید حسن خان نے اپنے مقالہ "تدوین اور تحقیق کے رجحانات" میں حافظ صاحب
[ا]ہمیت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا:

"اردو میں ادبی تحقیق کا آغاز بیسویں صدی کے آغاز سے ہوتا ہے اور کسی تکلف کے بغیر شیرانی صاحب کو اردو میں تدوین و تحقیق کا معلم اول کہا جا سکتا ہے۔" [45]

ہم ان متقدر مگر مختلف الرائے اصحاب کو حافظ محمود شیرانی کی تعریف میں متحد پاتے ہیں۔ مگر ۱۹۲۸ء میں صورت حال یہ نہ تھی۔ ابھی اہلِ زبان کی باقیات موجود تھیں یہ وہ لوگ تھے جن کے لیے ساری زبان محض تذکیر و تانیث کی بحثوں تک محدود تھی اور تحقیقات عروض موشگافیوں کا ضمیمہ۔ اسی لیے انہوں نے پنجابی قلمکاروں کو تو کجا خود علامہ اقبال کے اسلوب کو بھی درخورِ اعتناء نہ جانا وہ مغز (پیغام) کو چھوڑ کر پوست (اظہار) کے پیچھے پڑے رہے لیکن بعد میں تنقیدی مطالعے کی وسعت، مغربی علوم و جدید تصورات سے آگاہی اور مغرب میں لسانیات کے جدید مباحث سے آشنائی کی بدولت حافظ محمود شیرانی کو ان کا جائز مقام دیا گیا؛

غیر ملکی الفاظ کا میزبان؛ پنجاب

جہاں تک حافظ محمود شیرانی کے تصور کا تعلق ہے تو بلاشبہ یہ نزاعی ہے اور گذشتہ چھ دہائیوں میں اس پہ کسی نہ کسی طور سے رائے زنی کی جاتی رہی ہے۔ اس ضمن میں متقدر اہم اہلِ قلم کی تحریروں، مقالات اور کتب کے حوالے دیئے جا سکتے ہیں۔

عابد علی عابد اگرچہ اس بحث میں نہیں الجھے کہ اردو کا تعلق پنجاب سے ہے کہ نہیں؛ تاہم انہوں نے اپنے ایک مقالے "الفاظ میں تاریخ" کی جو ضمنی سرخی بنائی اس سے ان کا اندازِ نظر واضح ہو جاتا ہے: "اردو اور فارسی زبان کے مطالعے میں پنجابی کی اہمیت" اس مقالہ میں انہوں نے متعدد ایسے پنجابی الفاظ لے کر جو عام بول چال کا حصہ ہیں جیسے آواز، پیار دادا، دانا، ہوا اور سوگند۔ اوستا اور سنسکرت سے ان کا لسانی رابطہ اجاگر کرتے ہوئے یہ

نتیجہ اخذ کیا:

"قدیم پنجابی کے الفاظ ایک طرف بہ خطِ مستقیم پہلوی اوستا اور فارسی باستان سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں اور دوسری طرف آریاؤں کے رشتے سے ان زبانوں سے مشابہ ہیں جنہیں سنسکرت اور ہندی کہا جاتا ہے اور جن کی ساخت گنگ و جمن میں جاکر اصل آریاؤں سے مختلف ہو گئی ہے۔ جوں جوں آریا پنجاب سے بڑھتے چلے گئے ان کی تہذیب اور ان کی زبان اور تہذیب سے قدرے مختلف ہوتی چلی گئی۔ صرف پنجاب ایک ایسا خطہ ہے جو لسانی اور تمدنی طور پر ایک طرف ایرانی اور دوسری طرف پرانے آریائی آباؤ اجداد سے اور تیسری طرف وادیٔ گنگ و جمن کے آریاؤں سے رشتہ جوڑتا تھا۔"[۱۵]

اس دلچسپ مقالے سے صرف ایک مثال پیش ہے جس سے یہ اندازہ ہو جائے گا کہ عابد علی عابد نے کس طرح لسانی طرزِ استدلال سے مسئلہ روشن کیا ہے۔ "کلمہ آواز پر غور کیجئے اس کی داستان دراز ہے۔ اس کا اوستائی مادہ وچ ہے۔ سنسکرت واچ ہے۔ پہلوی واجک ہے۔ لاطینی "VOX" ہے۔ انگریزی اور فرانسیسی لفظ "VOICE" اسی سے بنے ہیں۔ اب ملاحظہ کیجئے کہ اوستا کا وچ اور سنسکرت کا واچ اور پہلوی کا واجک وہی لفظ ہے جو پنجابی میں اب تک واج ہے۔ اس پر بھی غور فرمایئے گا کہ ہندی لفظ وچن اور بچن اسی مادہ واچ سے برآمد ہوا ہے۔ فارسی جدید میں اس لفظ کی شکل جیسا کہ سب جانتے ہیں آواز ہے۔ پنجابی میں جو لفظ واج ہے وہ اپنی قدیم شکل میں قائم ہے۔ قدیم پنجابی اس پر الف کا اضافہ نہیں کرے گی اور یوں قدیم پنجابی کا کلمہ واج وچن اور وچ اور واجک کے درمیان ایک درمیانی کڑی بن کر رہ گیا۔"[۱۶]

پنڈت برجموہن دتاتریا کیفی نے "کیفیہ" (۱۹۴۲ء) میں اردو اور پنجابی کے لسانی اشتراک پر زور دیتے ہوئے پنجابی کے بارے میں یہ لکھا۔ "غیر ملکی الفاظ سے مہمان نوازی کا برتاؤ

سب سے پہلے اس کے حصے میں آیا۔"[17] کیفی نے میر وارث شاہ (۱۷۰۰ء) کے لسانی تجزیہ سے یہ دلچسپ نتیجہ اخذ کیا۔ "اگر ڑ اور ڑی کے لاحقوں کو اور چند مقامی خصوصیات کو نکال دیا تو وارث شاہ کی زبان اور ہماری انیسویں صدی کے ابتدائی برسوں کی زبان میں کم فرق پایا جائے گا۔"[18] اپنے استدلال کی بنا پر اگر انہوں نے غیر مشروط الفاظ میں یہ دعویٰ کیا تو اس پر تعجب نہیں ہونا چاہیئے:

"اردو زبان پنجاب میں پیدا ہوئی۔"[19]

"خمارِ گندم"

حافظ محمود شیرانی کی کتاب سے پہلے ہی ایسے مقالات کی اشاعت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا جن میں کسی نہ کسی طرح سے "پنجاب میں اردو" کے مقدمہ کی وکالت ملتی ہے۔[20] یہی نہیں بلکہ "دکن میں اردو" کے سالِ اشاعت یعنی ۱۹۲۳ء ہی میں شیر علی سرخوش کا تذکرہ "اعجازِ سخن" طبع ہوا۔ انہوں نے اپنے مفصل مقدمہ میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ اردو کا مولد پنجاب ہے۔ مؤلف کے خلوص پر شبہ نہیں مگر یہ سعی بول بالا نہ ہو سکی کہ ان کے پاس لسانی کے برعکس جذباتی دلائل تھے مثلاً ان کے بقول:

"ایک سائنسی دلیل صوبہ پنجاب کے مردم خیز ہونے کی یہ ہے کہ انسان کی بہترین غذا گیہوں ہے جو ہمارے دماغ کو بے حد تقویت پہنچاتی ہے اور وہ اہلِ پنجاب کے روزمرہ کے استعمال کی چیز ہے۔ غرض کوئی وجہ نہیں ہے کہ ایک خاص مشرقی زبان جیسی کہ اردو ہے، اس ملک میں پیدا نہ ہوئی ہو۔ ہاں بے شک پیدا ہوئی ہے۔"

اس لیے اگر مولوی عبدالحق نے اپنے تبصرے میں اس کتاب کو اڑا دیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیئے۔ ملاحظہ ہو تبصرہ مشمولہ "تنقیداتِ عبدالحق" مرتبہ محمد تراب علی خاں باز۔ اسی کتاب میں

"پنجاب میں اردو" پر تبصرہ بھی شامل ہے۔ مولوی عبدالحق اگرچہ یہ لکھتے ہیں: "پروفیسر شیرانی کی یہ کوشش اردو داں طبقہ کے لیے قابلِ فخر ہے۔"[21] مگر اپنے لسانی دلائل دینے کے بعد وہ اس کو تسلیم نہیں کرتے کہ دہلی میں "...... پنجاب سے اردو پہنچی ہے۔"[22] بلکہ وہ تو اس کے برعکس بات کرتے ہیں۔ "کہ اردو کا اثر پنجابی پر پڑا ہے۔"[23]

آفتابِ تحقیق

شاید آج ان مقالات مباحث یا "اعجازِ سخن" کی لسانی اہمیت نہ ہو لیکن ان سے اتنا تو یقیناً واضح ہو جاتا ہے کہ اہلِ پنجاب نے اردو زبان پر اپنا حق جتانا شروع کر دیا تھا۔[24] اسے یوں سمجھئے کہ گھٹا تلی کھڑی تھی بس پہلے قطرے کی دیر تھی اور یہ پہلا قطرہ ثابت ہوئی۔ "پنجاب میں اردو۔"

حافظ محمود شیرانی نے ایک سچے محقق کی مانند اس تصور کے خدوخال سنوارنے میں پیشرو ماہرین کی کوششوں کا اعتراف کرتے ہوئے پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی اور شیر علی خان سرخوش کے تذکرہ "اعجازِ سخن" کی اولیت کا اعتراف کیا۔ جبکہ دیباچہ نگار عبدالمجید سالک نے حافظ محمود شیرانی کے خاندان اور نجی کوائف کے بارے میں لکھتے ہوئے کتاب کے سلسلے میں اس رائے کا اظہار کیا:

> "پنجاب میں اردو حضرت علامہ کے آفتابِ تحقیق کی صرف ایک شعاع ہے لیکن اس ایک شعاع سے زبان اردو کے ماخذوں کا گوشہ گوشہ منور ہو گیا اور جو محققین اور طلبہ ایک صدی سے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مار رہے تھے ان کو ایسی روشنی مل گئی جو ہمیشہ ان کے لیے چراغِ راہ بنی رہے گی۔"

عہد آفریں نظریہ

حافظ شیرانی کا یہ نظریہ لسانی مباحث میں اب مستقل اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ ابھر
اس کی تائید کریں یا تردید اس سے فرق نہیں پڑتا۔ اصل بات یہ ہے کہ اب اس سے
نظر ممکن نہیں۔ بلاشبہ لسانیات میں یہ عہد آفریں نظریہ ہے۔ حافظ محمود شیرانی کے دلائل کے
سمندر کو مختصر ترین الفاظ کے کوزہ میں یوں بند کیا جا سکتا ہے:

"ہم اردو کے آغاز کو شاہجہان یا اکبر کے دربار اور لشکرگاہوں کے ساتھ وابستہ کرنے
کے عادی ہیں لیکن یہ زبان اس زمانے سے بہت زیادہ قدیم ہے بلکہ میرے خیال میں اس
کا وجود انہی ایام سے ماننا ہوگا جب سے مسلمان ہندوستان میں آباد ہیں۔" (ص ۱) "جس زبان
سے اردو ارتقاء پاتی ہے وہ نہ برج ہے نہ ہریانی نہ قنوجی ہے۔ بلکہ وہ زبان جو صرف دہلی اور
میرٹھ کے علاقوں میں بولی جاتی تھی۔" (ص ۲۴) "آج دیکھا جاتا ہے کہ دہلی کے قریب ہی تین زبانوں
یعنی ہریانوی، برج اور راجستھانی کا سنگم ہے۔ ہریانوی کوئی علیحدہ زبان کہلانے کی مستحق نہیں
ہے بلکہ وہ پرانی اردو ہے۔ یعنی وہی اردو ہے جو گیارہویں صدی ہجری میں خود دہلی میں
بولی جاتی تھی۔ اس میں اور اردو میں بہت کم فرق ہے۔ اگر اس کو اردو نہ مانیں تو اردو
کی شاخ ماننے میں تو عذر نہیں ہونا چاہیئے۔ بہرحال یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ یہ زبان اسلامی دور
میں دہلی کے اثرات میں بنتی ہے۔" (ص ۲) "اردو دہلی کی قدیم زبان نہیں ہے بلکہ وہ
مسلمانوں کے ساتھ دہلی جاتی ہے اور چونکہ مسلمان دہلی سے ہجرت کر کے جاتے ہیں، اس
لیے ضروری ہے کہ وہ پنجاب سے کوئی زبان اپنے ساتھ لے کر گئے ہوں گے۔ اس نظریے
کے ثبوت میں اگرچہ ہمارے پاس کوئی قدیم شہادت باسند نہیں لیکن سیاسی واقعات
اردو زبان کی ساخت نیز دوسرے حالات ہیں اس عقیدے کے تسلیم کرنے پر مجبور کرتے
ہیں۔" (ص ۹) "چوتھی صدی کے اواخر سے محمودی حملوں کا آغاز ہوتا ہے اور تمام پنجاب

آل ناصر کے زیر اقتدار آجاتا ہے۔" (ص ۲۱) "اگر آل غزنہ سے پیشتر مسلمانوں کو کسی ہندی زبان کے اختیار کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی تو اس عہد میں جو خاصا دراز ہے وہ پنجاب میں کوئی نہ کوئی زبان سرکاری، تجارتی اور معاشرتی اغراض سے اختیار کر لیتے ہیں جس کو غوریوں کے عہد میں جب دارالسلطنت لاہور سے دہلی جاتا ہے "اسلامی فوجیں اور دوسرے پیشہ ور اپنے ساتھ دہلی لے جاتے ہیں۔ دہلی میں یہ زبان برج اور دوسری زبانوں سے دن رات کے باہمی تعلقات کی بنا پر وقتاً فوقتاً ترمیم قبول کرتی رہتی ہے اور رفتہ رفتہ اردو کی شکل میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ پنجاب کا اردو کے ساتھ تعلق اسی پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ بعد کے زمانے میں بھی سیاسی اسباب اسی تعلق میں تجدید پیدا کرتے رہے ہیں۔ تغلق آٹھویں صدی میں سید اور لودھی نویں صدی ہجری میں ایسے خاندان ہیں جو خاص پنجاب سے نکل کر دہلی آتے ہیں۔ ان کے لشکر پنجاب اور پنجابیوں سے تعلق رکھتے تھے۔ اس لیے کوئی تعجب نہیں اگر ان نوواردوں نے دہلی کی زبان پر اور اثر ڈالا ہو۔" (ص ۲۷) "اصل یہ ہے کہ اردو کی داغ بیل اسی دن سے پڑنی شروع ہو گئی ہے جس دن سے مسلمانوں نے ہندوستان میں آکر توطن اختیار کر لیا ہے۔" (ص ۴۲) "سندھ و پنجاب میں ہندو مسلم اقوام سب سے پہلے ملتی جلتی ہیں۔ اس لیے اگر انہیں ایک عام زبان کی ضرورت ہوئی تو ان ممالک میں پیش آئی ہو گی اور اردو کو ان ممالک میں وجود میں آنا چاہیئے ..... اگر سندھ میں نہیں تو پنجاب میں یقیناً انہیں کوئی نہ کوئی زبان اختیار کرنی پڑی ہو گی۔" (ص ۴۸) "اردو برج بھاشا کے مقابلے میں پنجابی بالخصوص ملتانی سے مماثلت قریبی رکھتی ہے۔" (ص ۴۹) "جب ہم اردو اور پنجابی زبانوں کی صرف و نحو ان کے قواعد اور عام ہیئت کا مقابلہ کرتے ہیں تو یہ اثر قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے اور دونوں زبانوں کی مماثلت کا راز صریح طور پر آشکارا ہو جاتا ہے۔" (ص ۵۷) "پنجابی اور اردو اپنی صرف و نحو میں ایک دوسرے کے بہت قریب ہیں۔" (ص ۴۸) "اردو اور پنجابی کی صرف کا ڈول تمام تر ایک ہی منصوبہ کے زیر اثر تیار ہوا ہے۔ اس کی تذکیر و تانیث اور جمع اور افعال کی تعریف کا اتحاد اسی

نتیجے کی طرف ہماری راہنمائی کرتا ہے کہ اردو اور پنجابی کی ولادت گاہ ایک ہی مقام ہے۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تربیت پائی ہے اور جب سیانی ہوگئی ہیں تب ان میں جدائی واقع ہوئی" (ص ۱۰۳) "اردو پر قدیم زمانوں میں پنجابی لہجہ غالب تھا۔ اس کا ثبوت دینا موجودہ حالات میں سب سے دشوار ہے اس لیے کہ ان ابتدائی زمانوں کے جبکہ مسلمان لاہور سے ہجرت کرکے دہلی میں آباد ہوئے ہیں۔ نیز اس کے بعد کی تین صدیوں تک کے کوئی کتابی نمونے ہم کو نہیں ملتے نہ ہم کو یہ علم ہے کہ اس عہد کے برج اور پنجابی میں کیا فرق تھا۔ الغرض برج پنجابی اور اردو کے نمونے کی عدم حاضری سے ہمارا کام بہت مشکل ہوگیا ہے۔" (ص ۱۳۷) "پنجاب میں اردو زبان کی تعریف میں ایک نیا باب ہے جس کا اب تک کسی نے مطالعہ نہیں کیا ہے۔ خود اہل پنجاب بھی اس سے عموماً بے خبر ہیں ..... اردو کے لیے اہل پنجاب کی طبعی مناسبت اور قدیم اردو پر پنجاب کا اثر دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اردو پنجاب کے کسی خاص خطے یا ضلع کی زبان تھی۔ اس سوال کا قطعی جواب ہمارے پاس موجود نہیں۔" (ص ۲۹۲) حضرت مراد شاہ نامہ مراد ۱۲۰۳ ہجری:

وہ اردو کیا ہے یہ ہندی زبان ہے

کہ جس کا قائل اب سارا جہان ہے" (ص ۳۸۱)

اس موضوع سے مزید دلچسپی رکھنے والے اصحاب مندرجہ ذیل مقالات سے رجوع کر سکتے ہیں:

۱۔ "پنجابی اور اردو کے لسانی روابط" از ڈاکٹر محمد ظفر اللہ مطبوعہ صحیفہ قسط اول، جنوری مارچ ۱۹۸۶ء قسط دوم اپریل جون ۱۹۸۶ء قسط سوم جولائی ستمبر ۱۹۸۶ء قسط چہارم اپریل جون ۱۹۸۹ء۔

۲۔ "فارسی اور پنجابی کے لسانی روابط" از ڈاکٹر محمد بشیر حسین ترجمہ اسلم رانا مطبوعہ "مجلہ تحقیق" جامعہ پنجاب خصوصی شمارہ ۱۹۸۲ء

٣۔ "اردو پنجابی کے لسانی رابطے" از ڈاکٹر وحید قریشی مطبوعہ ماہِ نو اکتوبر ۱۹۸۰ء

۴۔ "دکن اور پنجابی کے لسانی رشتے" از ریاض قدیر مطبوعہ ماہ نو اکتوبر ۱۹۸۲ء

۵۔ "اردو اور پنجابی کے لسانی اور تہذیبی رابطے۔" مطبوعہ ماہ نو جنوری ۱۹۷۹ء

۶۔ سرائیکی اور اردو کا باہمی ربط" از مسعود حسن شہاب دہلوی مطبوعہ ماہِ نو جولائی ۱۹۸۱ء

دکن میں اردو

"گلستان ہند کے شمالی چمن کے مغربی دروازوں سے باغبانوں نے آکر اردو کا بیج بویا، گنگا جمنا نے آبیاری کر کے چھوٹے سے پودے کو اگایا۔ اسی کے قریب قریب گلزار دکن میں بھی...... انہی ہاتھوں نے اس بیج کو زمین میں ڈالا، کرشنا اور موسیٰ درخت کے اگانے میں معاون ہوئیں۔ ہنوز شمالی چمن کا درخت بار آور نہ ہوا تھا کہ دکنی پود از زمین کی عمدگی اور بروقت آبیاری سے بہت جلد ترو تازہ سرسبز شاداب ہوگیا۔" [۲۵]

نصیر الدین ہاشمی نے مولانا محمد حسین آزاد کے اسلوب میں "دکن میں اردو" کے مقدمہ کا آغاز کرتے ہوئے ایسے لسانی شواہد پیش کیے جن سے دکن میں اردو زبان اور اس کے تخلیقی مراحل کا تعین ہو جاتا ہے۔ جہاں تک دکن میں اردو کی نشو و نما کا تعلق ہے تو اس ضمن میں ایک نکتہ توقابل توجہ ہے کہ سندھ میں محمد بن قاسم اور پنجاب پر محمود غزنوی کی یلغاروں سے کہیں پہلے دکن اور مسلمانوں بلکہ زیادہ بہتر تو یہ کہ عربوں کے دکن سے تجارتی روابط استوار ہو چکے تھے۔

عرب ہند تعلقات

ان تجارتی تعلقات اور پھر ان سے جنم لینے والے تہذیبی و تمدنی اور لسانی اثرات پر

مورخین اور لسانی محققین عرصے سے لکھتے آ رہے ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر گستاؤلی بان کی تالیف "تمدن عرب" (۱۸۸۴ء) ترجمہ شمس العلما سید علی بلگرامی) میں ان تجارتی تعلقات کے ضمن میں لکھا ہے: "عربوں کی تجارت صرف عربستان کی پیداوار تک محدود نہ تھی بلکہ وہ ان اجناس کی تجارت کرتے تھے جو افریقہ اور ہندوستان سے آتی تھیں۔ ان کی تجارت اکثر ان اشیاء کی تھی جو سامانِ عیش و عشرت میں شامل ہیں۔ مثلاً ہاتھی دانت، مصالحہ جات، خوشبو، عطریات، جواہرات سونے کا سفوف، لونڈی، غلام وغیرہ..... ہندوستان کی تجارت میں عربوں کے رقیب اہل بابل تھے۔ ان کا تعلق ہند سے خشکی کی راہ یا خلیج فارس کی طرف سے تھا۔"[26] اس زمانے میں جب کہ یورپ کو مشرق کے دور دراز حصوں کی خبر نہ تھی جبکہ افریقہ بہ استثنائے چند سواحل کے ایک نامعلوم حالت میں تھا۔ عربوں کے تعلقات تجارتی ہندوستان و چین اور وسط افریقہ اور یورپ کے غیر مشہور ممالک مثلاً روس اور سویڈن اور ڈنمارک کے ساتھ موجود تھے۔ عربوں کے تعلقات ہندوستان کے ساتھ ابتدائے زمانہ تاریخی سے شروع ہوتے ہیں لیکن کل واقعات سے ثابت ہوتا ہے کہ جس وقت یمن کے بندروں سے ہندوستان کو جہاز جانے لگے وہ زمانہ آنحضرت کی بعثت سے بہت ہی قریب تھا۔ اپنی حکومت قائم ہو جانے کے ساتھ ہی عربوں نے تعلقات تجارتی کو بہت بڑی وسعت اور ترقی دی۔ وہ بہت جلد ساحل کارومنڈل، مالابار اور سماٹرا اور جزائر بحر الہند کو فتح کرتے ہوئے جنوب میں چین تک پہنچ گئے۔"[27]

اس موضوع پر نصیر الدین ہاشمی نے بھی "دکنی کلچر" میں مفصل روشنی ڈالی ہے۔ اسی طرح سلیمان ندوی کی تالیف "عربوں کی جہاز رانی" (۱۹۳۵ء) میں بھی اس ضمن میں کار آمد معلومات جمع کی گئی ہیں۔ نصیر الدین ہاشمی نے متذکرہ کتاب میں مولانا محمد مرتضیٰ مرحوم کا ایک مقالہ "سواحل ہندوستان پر مسلمانوں کا توطن" نقل کیا ہے۔ اس میں بھی دلچسپ تفصیلات جمع کی گئی ہیں۔

سید سلیمان ندوی کی تالیف "عرب و ہند کے تعلقات" (۱۹۳۰ء) میں خاصا تحقیقی مواد فراہم

کیا گیا ہے۔ انہوں نے بعض مسلم مفسرین کے حوالے سے یہ بھی لکھا ہے کہ ہندوستان کی اس سرزمین کا نام جس میں حضرت آدم اترے "دجنار" ہے۔ کیا یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ "دجنار" ہندی کا "دکھنا" یا "دکھن" ہے۔ جو ہندوستان کے جنوبی حصے کا مشہور نام ہے اور چونکہ عرب کے ملک میں خوشبوئیں اور مصالحے اس جنوبی ہند سے جاتے تھے اور پھر عربوں کے ذریعے وہ تمام دنیا میں پھیلتے تھے۔ اس لیے ان کا بیان ہے کہ یہ چیزیں ان تحفوں کی یادگار ہیں جو حضرت آدم اپنے ساتھ جنت سے لائے تھے۔ ان تحفوں میں چھوہارے کے سوا دو پھل یعنی لیموں اور کیلے ہندوستان ہی میں موجود ہیں۔ ایک اور روایت میں ہے کہ امرود بھی جنت ہی کا میوہ تھا جو ہندوستان میں پایا جاتا تھا۔[28]

عربوں کے ہندوستان سے تجارتی تعلقات کے نتیجے میں مولانا ندوی کے بموجب عربی میں ہندوستانی جہازرانی کی بعض اصطلاحات شامل ہوگئیں جیسے بارجا (بیڑا) دونیج (ڈونگی) (ص: ۸۷) اسی طرح انہوں نے الائچی کو بھی ہندی الاصل بتایا ہے (ص: ۸۱) مزید الفاظ کے لیے صفحات (۸۳، ۸۵) ملاحظہ ہوں۔ مولانا سلیمان ندوی کی تحقیق کے مطابق قرآن مجید میں تین ہندی لفظ مسک (مشک) زنجبیل (سونٹھ یا ادرک) اور کافور (کپور) موجود ہیں (ص ۸۵) اسی طرح انہوں نے عربی میں سنسکرت کی بعض ان اصطلاحات کی نشاندہی بھی کی جو علم ہیئت سے متعلق ہیں (ص ۱۴۰)

عربوں کی بحری مہارت کا یہ عالم تھا کہ "بحر روم سے ہندوستان کا دوسرا بحری راستہ عربوں نے دریافت کیا تھا۔" (ص ۱۰۰) اور واسکوڈے گاما کو ہندوستان پہنچانے والا بھی ایک عرب تھا جس کا نام ابن ماجہ اور لقب اسد البحر تھا۔" (ص: ۱۰۱)

اس ضمن میں ڈاکٹر سید محمود نے بھی اپنی تحقیقات سے یہ نتیجہ اخذ کیا۔ "عربی زبان میں بہت سے ایسے الفاظ ہیں جو ہندوستان سے میل جول کا پتہ دیتے ہیں۔ سب سے زیادہ دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ خود قرآن مجید میں سنسکرت کا لفظ موجود ہے۔ عربی میں لفظ ہند ہی زبان کا مرکز قرار دیا گیا ہے۔ ایک سو اونٹ کے جھنڈ کو ہندیا ہندہ کہتے ہیں۔ ہند ہندی یا ہندوانی اس

تلوار کو کہتے ہیں جو بناوٹ میں مضبوط ہو اور ہندوستان میں بنائی گئی ہو یا ہندوستانی ساخت کی بنی ہو۔ قرآن مجید میں ایسے کثیر الفاظ استعمال کیے ہیں جو عربی میں داخل ہو گئے تھے۔ بخاری، سیوطی جیسے محدثین اور ثعالبی جیسے ماہرین لغت نے ان کو یکجا کیا ہے۔ علماء کی ان روایات کے مطابق جیسے کہ اور زبانوں کے الفاظ قرآن میں ہیں، ہندی یا سنسکرت کے الفاظ "ابجد" اور "سندس" کا بھی استعمال موجود ہے۔ بلخ کا ایک محلہ تھا جس کو "ہندوان" کہا جاتا تھا۔ الجزری کی روایت ہے وہاں ایک محلہ ہندوان تھا جہاں مقامات ہند سے آنے والے لوگ ٹھہرا کرتے تھے"[۲۹]

الجزری، ذہبی اور عسقلانی نے ہندوستان کے دو صحابیوں کا ذکر کیا ہے جن میں ایک کا نام سربانک یا سرمانک اور دوسرے کا نام رتن تھا۔ سربانک کے متعلق الجزری کا بیان ہے کہ وہ قنوج کے راجہ تھے۔ دوسرے ہندوستانی صحابی رتن نے بہت شہرت حاصل کی۔ اسلامی دنیا میں ان کی حدیثیں الرتنیات کے نام سے متداول ہیں۔[۳۰]

عرب و ہند تعلقات کا موضوع بہت وسیع ہے اور اس پہ کئی محققین نے خامہ فرسائی کی ہے۔ مندرجہ بالا حوالوں کے علاوہ اس ضمن میں ڈاکٹر تاراچند کی معروف تالیف "اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر" میں بھی کارآمد معلومات ملتی ہیں جن کے بقول:

"پچھمی ممالک عرب فلسطین اور مصر سے ہندوستان کے تجارتی تعلقات بہت ہی قدیم زمانے سے ہیں۔ حضرت سلیمان سونا اوفر (موجودہ جے پور) سے منگاتے تھے اور چاندی، ہاتھی دانت، بندر اور مور بھی یہیں سے جاتے تھے۔" (ص ۲۵)۔ انہوں نے اس ضمن میں یہ بھی لکھا ہے:

"مشرق و مغرب کی باہمی تجارت میں عربوں نے قدرتاً نمایاں حصہ لیا۔ عرب علاقوں میں تجارت کے کئی مرکز تھے۔۔۔۔ عرب فن جہاز سازی سے بھی اچھی طرح سے واقف تھے اور اس سلسلے میں بہترین سامان فراہم کرتے تھے۔ ورجل کا بیان ہے کہ عربی اور ہندوستانی جہاز رانوں نے انٹونی در قلوپطرہ کے ماتحت جنگ ایکٹیم میں حصہ لیا تھا۔" (ص: ۵۶ - ۵۵)

عرب دکن میں

ڈاکٹر تارا چند کے بموجب: "بمبئی گزیٹیئر میں خان بہادر فضل اللہ لطف اللہ، فریدی نے لکھا ہے کہ اسلام سے قبل چول، کلیان اور سوپارہ میں عرب آباد تھے۔ اگا تھر سائیڈس کے زمانے میں ساحل ملی بار پر عربوں کی اتنی کثرت تھی کہ بہت سے ہندوستانیوں نے بھی ان کا مذہب (غالباً صابی) اختیار کر لیا تھا۔" (ص: ۵۶) "عرب جہاز یا تو بحیرہ احمر کے ساحل سے چلتے تھے یا جنوبی ساحل سے۔ وہ ساحل کے ساتھ ساتھ چل کر اپنی منزل مقصود یعنی دریائے سندھ کے دہانے پر یا خلیج کھمبات پر لنگر ڈال دیتے تھے یا پھر ملیبار کے ساحل پر۔ ہندوستان کے سمندروں میں مسلمانوں کا پہلا بیڑہ حضرت علی کی خلافت کے زمانہ ۶۳۶ عیسوی میں آیا۔" (ص ۵۶) اس دوران میں سمندر کے ذریعے سے تجارت جاری رہی اور مسلمانوں نے جنوبی ہند کے ساحل اور سیلون کے تین شہروں میں آبادیاں قائم کیں۔ راولینڈس کا بیان ہے کہ مسلمان عرب پہلے پہل ساتویں صدی کے آخر میں ملیبار کے ساحل پر آباد ہوئے۔ فرانس ڈے روایتی تذکروں سے اس کی تائید کرتا ہے۔ اسٹورک نے موپلوں کے حالات لکھتے ہوئے اس کی تصدیق کی ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ بات بہت مشہور ہے کہ ساتویں صدی میں ایرانی اور عرب تاجر ہندوستان کے مغربی ساحل کی مختلف بندرگاہوں پر بڑی تعداد میں آباد ہوئے اور انہوں نے ہندوستان کی عورتوں سے شادیاں کیں۔ خاص طور سے ملیبار میں یہ آبادیاں بڑی اور اہم تھیں۔" (ص ۵۷) نویں صدی کا ربع اول بھی نہیں گزرا تھا کہ ملیبار کا آخری چیرامن پیرومال راجہ جو کرنگنور میں حکومت کرتا تھا، نئے مذہب یعنی اسلام میں داخل ہو گیا۔ روایتی تذکروں کے مطابق اس کی تبدیلئ مذہب ایک خواب کی بنا پر ہوئی جس میں اس نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے دیکھا" (ص ۵۹) "ملیبار کے ساحل پر مسلمانوں کی گیارہ مسجدیں تعمیر ہوئیں۔ راجہ کے تبدیلئ مذہب کا لوگوں کے دماغوں پر یقیناً گہرا اثر پڑا ہوگا اس واقعے کی یاد ملیبار میں اب تک تازہ ہے" (ص: ۶۰) "اس زمانے میں مسلمانوں

نے یقیناً بہت اہمیت حاصل کر لی تھی۔ وہ "ماپلا" کہلاتے تھے۔ جس کے معنی ہیں ایک ممتاز لڑکا یا دولہا۔ اور یہ ایک عزت کا لقب سمجھا جاتا تھا..... مسلمانوں کو اور حقوق بھی حاصل تھے۔ ایک مسلمان نامبودری برہمن کے برابر بیٹھ سکتا تھا۔" (س: ۶۱)

ڈاکٹر تاراچند کے ان اقتباسات سے عرب ہند اور اسلام کے تعلقات کی قدیم داستان کے متعدد پہلو نمایاں ہو جاتے ہیں۔

جب مسلمانوں نے جنوبی ہند کی تہذیبی اور تمدنی زندگی میں اپنا مقام مستحکم کر لیا تو انہوں نے یقیناً تبلیغِ دین کے مقدس فریضے کا آغاز بھی کر دیا ہوگا۔ تبلیغِ دین کا دو پہلوؤں سے اندازہ کیا جا سکتا ہے اول تو یہ کہ یہ تبلیغ مقامی نوعیت کی ہوگی یعنی مقامی آبادی سے مسلمانوں کے سماجی روابط یا شادیوں کے باعث لوگ مسلمان ہوتے ہوں گے۔ اس ضمن میں دین کی سوجھ بوجھ رکھنے والے حضرات نے بھی فعال کردار ادا کیا ہوگا۔ تبلیغ کا دوسرا پہلو صوفیائے کرام کی کاوشوں سے متعلق ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوستان میں اسلام کا فروغ بادشاہوں کے مقابلے میں صوفیائے کرام کی شخصی جاذبیت، 'وسیع المشربی'، دین سے محبت، فقر و غنا اور علم و فضل کی بدولت ہوا۔ چنانچہ ہندوستان کے دیگر علاقوں کی مانند صوفیائے کرام دکن اور بنگال تک پہنچے اور اپنے حسنِ اخلاق کو اسلام کا عملی نمونہ بنا کر یوں پیش کیا کہ لوگ مسلمان ہوتے گئے۔ یہ بوریا نشین دلوں کے حکمران تھے اور ان کا عمل صحیح معنوں میں محبت فاتح عالم کی تفسیر تھا۔ ان کا مسلک تھا۔ پر مجھے گفتگو عوام سے ہے اسی لیے انہوں نے ہمیشہ مقامی لوگوں سے ان کی اپنی زبان میں بات کرنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں وہ مخصوص صورتِ حال جنم لیتی ہے جس کے باعث صوفیائے کرام کی تحریروں، کتابوں، مکتوبات، منظومات و ملفوظات میں آج کے ماہرینِ لسانیات کے لیے بیش بہا سرمایہ ملتا ہے۔ مولوی عبدالحق نے اس موضوع پر جو رسالہ "اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام" (کراچی طبع سوم ۱۹۵۲ء) لکھا تھا اگرچہ جدید لسانی تحقیقات اس ضمن میں مزید شواہد بہم پہنچا چکی ہیں۔ تاہم یہ نکتہ قابلِ توجہ ہے کہ صوفیا کی تخلی

سامی نے زبان کے ابتدائی ہندوستان کے نکھارنے اور سنوارنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا اور یقیناً دکن میں بھی یہی صورتِ حال نظر آتی ہے۔ ان کی دینی زبان (عربی) تہذیبی زبان (فارسی) اور مقامی (بھاشائیں اور بولیاں) مگر جو لسانی کھچڑی پکا رہی تھیں اس نے پک کر اردو کا نام پالیا۔

اس ضمن میں الفاظ کا تبادلہ یقینی تھا۔ جب جنوبی ہندوستان کی زندگی کے متعدد شعبے متاثر ہونے لگے تو مقامی زبانوں میں عربی اور فارسی الفاظ کی بازگشت بھی سنائی دی جانے لگی۔ چنانچہ ڈاکٹر خلیق انجم "ہندوستانی قومیت اور کلچر" میں لکھتے ہیں" جنوبی ہند کی زبانوں اور خاص طور سے ملیالم اور کونکی نے براہ راست عربی سے الفاظ مستعار لیے۔"[۲۱]

"گلزارِ دکن"

یہ ہے وہ تاریخی، سماجی اور دینی پس منظر جس میں جنوبی ہند کی دھرتی میں اردو کے بیج بوئے گئے ایسے بیج جو بار آور ہو کر اعلیٰ تخلیقات کے ثمر لائے۔ شمالی ہند کے گلشنِ ادب میں اردو ابھی تک سبزۂ بیگانہ تھی جبکہ جنوبی ہند میں طرزِ احساس کی تبدیلی سے اردو تہذیبی رویوں کو اقدارِ نو سے روشناس کر رہی تھی۔ ملک کے دونوں حصے اس لسانی تغیر سے ناآشنا رہے تو اس کا بنیادی سبب فاصلوں، گھنے جنگلات اور کوہ بندیاچل کی صورت میں تلاش کیا جاسکتا ہے۔ یہ فاصلہ محض جغرافیائی نوعیت ہی کا نہیں تھا بلکہ تہذیب و تمدن، مذہبی رسوم و عقائد، نسلی خصائص وغیرہ کئی طرح سے اس کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ یہ بھی واضح رہے کہ آریاؤں، یونانیوں اور پھر مسلمانوں کے باعث شمالی ہند کی تہذیبی فضا جنوبی ہند جیسی نہ تھی جو صدیوں سے دراوڑی اثرات کی حامل تھی۔ بلکہ آج بھی تہذیبی اور تمدنی سطح پہ شمالی اور جنوبی ہند میں خاصا فرق ہے وہی جو شبانہ اعظمی اور سری دیوی میں نظر آتا ہے۔

شمالی اور جنوبی ہند میں تہذیبی ادغام کا عمل اس وقت تیز تر اور واضح صورت اختیار

کرلیتا ہے جب علاؤالدین خلجی ۱۲۹۴ عیسوی میں دکن پہ پہلی مرتبہ حملہ آور ہوتا ہے. خلجی کی دہلی واپسی کے بعد اس کے سپہ سالار ملک کافور نے فتوحات کا سلسلہ جاری رکھا چنانچہ دیوگری (۱۳۰۶ء) ورنگل یا تلنگانہ (۱۳۰۹ء) دوارسمندر اور معبر (۱۳۱۰-۱۱ء) کی فتح کے دو سال بعد یعنی ۱۳۱۲ء تک تمام مہاراشٹر مسلمانوں کے زیر نگیں ہو چکا تھا. قیاس کہ جب یہ جنگیں ختم ہونے کے بعد جہاں امور سلطنت کے سلسلے میں دہلی دربار سے متعدد امرا وزراء، اراکین دولت اور لشکریوں کی کثیر تعداد نے دکن کا رخ کیا تو ان کے ساتھ کئی عام افراد کے اہل خانہ اور ان کے ملازمین بھی دکن میں آکر آباد ہوئے ہوں گے۔ اس امر کا قوی امکان ہے کہ لاتعداد فوجیوں نے بھی شمالی ہند واپسی کی بجائے وہیں سکونت کو ترجیح دی ہو گی۔ یقیناً آپس میں سماجی روابط بھی ہوتے ہوں گے اور شادی بیاہ بھی، گویا دو علاقائی تہذیبوں کے ادغام کا عمل شروع ہو گیا اس عمل میں مزید تیزی اس وقت پیدا ہوئی جب محمد تغلق (۱۳۲۵-۵۱ء) نے ۱۳۲۶ء کی ایک سہانی صبح دہلی کی بجائے دکن کے شہر دیوگری (دیگر نام دیوگیر، دیوگری، دیوگڑھ) کو دولت آباد (یا بۃ الاسلام کے نام سے مشرف بہ اسلام کر کے) اہل دہلی کو وہاں منتقلی کا حکم دیا۔ ایسا حکم جس نے دہلی کی سماجی زندگی میں ہلچل پیدا کر دی۔ سات سو میل طے کرنے اور تاریخ ہند کی اس عجیب و غریب لانگ مارچ میں متعدد افراد سفر کی صعوبتوں کی تاب نہ لاکر مر کھپ گئے جو پہنچے ان میں سے بعض کا اس نئی دھرتی کی اجنبی زبان اور مانوس کلچر میں دل نہ لگا. جب کہ بعض کے اس دھرتی نے یوں پاؤں پکڑے کہ جب محمد تغلق نے واپسی کا ارادہ کیا تو لاتعداد لوگوں نے مراجعت نہ کی . اور بقول حافظ محمود شیرانی (مثنوی لیلیٰ مجنوں) " ان میں ایک طبقہ ایسا بھی تھا جس نے نئے وطن کو ترجیح دی اور یہیں آباد ہو گیا۔ دلی کے یہ آباد کار اپنے ساتھ دلی کا تحفہ یعنی زبان اردو بھی ساتھ لائے تھے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ اردو زبان دکن میں مرہٹی اور تلنگی زبانوں کے درمیان گلیوں اور بازاروں میں بولی جانے لگی. بغاوت امیران صدہ کے واقعہ

نے دکن کو بہت بلد خاندان تغلق کی اطاعت سے آزاد کر دیا اور عین وقت پر محمد تغلق کی وفات نے حسن بہمنی کو حاکم دکن کا مستقل تاجدار تسلیم کرا دیا۔ بہمنی دور جو ۷۴۸ھ سے شروع ہو کر ۹۳۲ھ پر ختم ہوتا ہے۔[۳۲]

دکنی:

نصیرالدین ہاشمی کے بقول "یہ فاتح اپنے ساتھ جو زبان دکن میں لے کر آئے وہ یہاں آزادانہ نشو و نما حاصل کرنے لگی کیونکہ اس کے مقابل کوئی اور زبان جو اس کے آگے بڑھنے میں رکاوٹ پیدا کرے یہاں نہیں تھی۔ اس کے برخلاف شمال میں برج مروج تھی جو وہاں کے دیسی باشندوں کی عام زبان تھی۔ اس طرح یہ زبان مسلمانوں کے ساتھ دکن پہنچی۔ عام طور سے پردیسی اور دیسی دونوں نے استعمال کی۔"[۳۳]

حافظ محمود شیرانی بھی اس استدلال سے متفق ہیں۔ چنانچہ ان کے بقول "اردو زبان دکن میں فروغ پاتی رہی اگرچہ تحریری شہادت موجود نہیں تاہم قیاس میں آتا ہے کہ مسلمانوں کی اس نئی بستی کی عام زبان اردو تھی کیونکہ اس کو تعلیم یافتہ طبقہ بول سکتا تھا۔ فارسی صرف درباری زبان تھی اور کوئی تعجب نہیں کہ ضرورتاً اگر اس عہد میں اردو تالیفات شروع ہو گئی ہوں۔"[۳۴]

جہاں تک اس تشکیل پانے والی زبان کے نام کا تعلق ہے تو نصیرالدین ہاشمی کا خیال ہے دکن میں یہ زبان ہندی اور دکنی سے موسوم رہی ہے"۔ قدیم سے قدیم دکنی شعراء اور مصنفین نے بھی اس کو ہندی اور دکنی نام بھی دیئے ہیں۔ ۱۲۸۶ ہجری تک بھی دکنی اور ہندی کا نام رائج تھا۔[۳۵]

اس زبان کو دکنی کہنے کے بارے میں ڈاکٹر جاوید وشسٹ نے اپنے مقالہ "دکنی شاعری میں ہندوستانیت" میں یہ دعویٰ کیا ہے:

"بھوگ بل کا مصنف قریشی پہلا شخص ہے جس نے اس زبان کو دکھنی کے

نام سے پکارا... محمود شاہ بہمنی (۱۴۹۲ء ۔ ۱۵۲۰ء) کے عہد کا ایک شاعر قریشی تھا۔ اس کا منظوم رسالہ بھوگ بل (۱۶۱۴ء) جنس کے موضوع پر ہے۔ یہ فارسی سے ترجمہ کیا گیا تھا اور اردو میں اس موضوع پر پہلا رسالہ ہے۔"[۲۶]

دکنی کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجئے۔

۱۔ نصیر الدین ہاشمی۔ "دکھنی (قدیم اردو) کے چند تحقیقی مضامین" دہلی ۱۹۶۳ء

۲۔ محی الدین قادری زور۔ "دکنی ادب کی تاریخ" کراچی ۱۹۶۹ء

۳۔ ڈاکٹر محمد علی اثر۔ دکنی و دکنیات" (وضاحتی کتابیات) اسلام آباد ۱۹۸۶ء

"کھل جا سم سم"

محمد تغلق کا یہ فیصلہ تاریخ ہند کے چند اہم ترین اور نزاعی فیصلوں میں شمار ہوتا ہے۔ اس فیصلے کے دہلی کی سیاست پر جو اثرات مرتب ہوئے ان کا مطالعہ ہمارے موضوع کی حدود سے خارج ہے۔ البتہ تہذیبی، تمدنی، لسانی اعتبارات سے یہ فیصلہ بے حد اہم اور دور رس نتائج کا حامل ثابت ہوا کہ شمالی اور جنوبی ہند کے مقفل دروازوں کے لیے یہ کھل جا سم سم کے مترادف تھا۔

بہمنی قطب شاہی اور دیگر بادشاہوں کے دور میں اردو زبان نے تخلیقی اعتبار سے جو ترقی کی وہ تاریخ ادب اردو کا اہم ترین باب ہے اور نصیر الدین ہاشمی نے بڑی محنت سے دکن میں اردو میں دکنی تخلیقات کی جستجو کی ہے۔ وہ اس سلسلے میں رقمطراز ہیں: "اس امر کا ابھی کوئی قطعی ثبوت نہیں ملا کہ شمالی ہند میں اردو احاطہ تحریر میں کب آئی مگر بلا خوف تردید یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ دکن میں اس کی ابتدا پہلے ہوئی۔" (ص ۲۶) انہوں نے "صاحب حال و قال درویشوں" کی سرپرستی اس کا باعث قرار دی ہے۔ چنانچہ ان کے بموجب "جدید تحقیقات کی رو سے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز سید محمد حسینی المتوفی ۸۲۵ ہجری وہ پہلے بزرگ ہیں جنہوں نے اس کی ابتدا کی اور معراج العاشقین اور ہدایت نامہ مرتب فرمایا۔" (ص ۲۷)، "دکنی زبان میں

نظم کی ابتداء نثر کے بعد ہوئی۔ (ص ۲۸) نظامی پہلا شاعر ہے جو سلطان احمد شاہ بہمنی المعروف نظام شاہ (۸۶۵-۸۶۰ھ) کے دورِ حکمرانی میں موجود تھا۔" (ص ۳۱) دکنی زبان میں غیر مسلسل نظم کہنے کی بجائے مسلسل نظم ہی کا آغاز ہوا اور مثنوی کی پہلے بنیاد رکھی گئی ہے۔ اس کے بعد رباعی، غزل، قصیدہ کا آغاز ہوا (ص ۳۱) "اردو کی ترقی اور ارتقاء کے لحاظ سے ہم حسب ذیل دور قرار دیتے ہیں:

پہلا دور	بہمنی اردو ۷۴۷ ہجری تا ۹۰۰ ہجری
دوسرا دور	قطب شاہی اور عادل شاہی اردو ۹۰۱ ہجری تا ۱۱۰۰ ہجری
تیسرا دور	مغلیہ اردو ۱۱۰۱ تا ۱۱۳۶ ہجری
چوتھا دور	سلطنت آصفیہ اور اردو ۱۱۳۶ ہجری تا ۱۲۲۰ ہجری
پانچواں دور	" " " ۱۲۲۰ تا ۱۳۰۱ ہجری
چھٹا دور	" " " ۱۳۰۱ تا ۱۳۳۶ ہجری
ساتواں دور	" " " ۱۳۳۶ تا —— ہجری

ہاشمی کی اُلجھن

سوال یہ ہے کہ کیا واقعی دکن اردو زبان کا مولد ہے؟ اس ضمن میں خود نصیرالدین ہاشمی کے ذہن میں بھی شکوک محسوس ہوتے ہیں لسانی شواہد کی بنا پر جس دوٹوک انداز سے شیرانی نے پنجاب کو اردو کا مولد قرار دیا تھا اس طرح ہاشمی نے دعویٰ نہیں کیا۔ چنانچہ پہلے باب کے آغاز میں اردو کے آغاز کے بارے میں معروف لسانی نظریات 'پنجاب' سندھ، دکن، دوآبہ، گنگا جمنا کا تذکرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں:

"بعض اصحاب کا یہ دعویٰ کہ اس کی ابتداء سندھ اور دکن سے ہوئی، وہ ایک حد تک غلط نہیں ہو سکتا:" ص ۳

لیکن چند صفحات کے بعد ان دونوں مقامات پر اسلامی اثرات کے نفوذ اور ہند مسلم آبادی

کے ملاپ سے جنم لینے والی لسانی صورت حال کے تجزیہ کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

"جو دعویٰ اردو کے دکن سے پیدا ہونے کا کیا جاتا ہے وہ بڑی حد تک صحیح ہو سکتا ہے مگر جو امور سندھ سے اردو کی ابتدا ہونے کے مانع ہیں وہی امور یہاں بھی مانع آتے ہیں اس لیے ہم دکن کو بھی اردو کا مولد قرار نہیں دے سکتے۔"[۳۸]

نصیر الدین ہاشمی جس الجھن کا شکار نظر آتے ہیں اس کو سمجھنا اتنا مشکل نہیں۔ انہیں یہ احساس ہے کہ شمال یا دہلی سے آنے والے باشندے اپنے ساتھ ایک زبان (جو یقیناً اردو تھی) لے کر آئے تھے وہ خود بھی اس کا اعتراف کرتے ہیں کہ "مسلمان فاتحین پنجاب سے لے کر دہلی تک آباد ہو گئے۔ اس زمانے میں یہاں جدید ہند و آریائی دور کی پراکرت زبان بولی جاتی تھی۔ اس دیسی زبان میں غیر ملکیوں کی زبان کی آمیزش ہونے لگی اور اس امتزاج سے اردو پیدا ہوئی۔" (ص: ۲۰) اور یہی اردو محمد تغلق کی بدولت دکن میں پہنچی تو" اس جدید زبان کا یہاں خیر مقدم ہوا اور عام طور سے ہر شخص اسی کو بولنے لگا اور کام کاج میں بھی آنے لگی۔" (ص: ۲۱) واضح رہے کہ نصیر الدین ہاشمی نے یہ نہیں کہا کہ دکن اردو کی جنم بھومی ہے بلکہ وہ تو لسانی صورتِ حال کا تجزیہ کر کے یہ کہتے ہیں:

"ہم دکن کو بھی اردو کا مولد نہیں قرار دے سکتے۔" (ص: ۱۹)

عام طور سے یہ باور کیا جاتا ہے کہ نصیر الدین ہاشمی نے سب سے پہلے دکن میں اردو کی نشو و نما کی طرف توجہ دلائی لیکن ایسا نہیں کیونکہ ان سے کہیں پہلے نصیر حسین خیال ۱۹۱۴ء میں مطبوعہ "داستانِ اردو" میں اس امر کی طرف توجہ دلا چکے تھے۔ انہوں نے یہ لکھتے ہوئے کہ "دکن اپنی زبان کا متلاشی تھا"[۳۹] دکن میں اردو کے حوالے سے وہی تاریخی شواہد پیش کیے جن کا حوالہ دیا جا چکا ہے اور اس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا:

"اردو کی ہزار سالہ تاریخ اب آپ کے پیشِ نظر ہے اور اس کے ملاحظہ کے بعد خیال کیا

جاتا ہوگا کہ جس زبان کو بابر نے منہ لگایا اور جو شاہجہاں کی چہیتی کہلائی اس کا جوڑا دہلی کے لال قلعہ ہی میں قطع ہوا ہوگا۔ ہونا تو یہی چاہیئے تھا لیکن ایسا ہوا نہیں اور اس کے بر خلاف اس کا جامہ دکن اور وہاں کے معمولی گھر میں تیار ہوا۔ فارسی وہاں مٹ چکی تھی اور ملکی زبان دکھنی اس کی جگہ لے چکی تھی۔ اظہار جذبات کی ضرورت جس وقت عام اور ناگزیر ہوئی اس وقت اسی نئی اعلیٰ دکھنی اردو سے وہ ضرورت پوری کی گئی اور اس طرح اس ایجاد نے جنوب کو شمال پر فوقیت دے کر افضلیت کا تاج دکھنی اور دکھن کے سر پر رکھ دیا ہے۔[40]

اور آخر میں مسعود حسین رضوی ادیب کے "دکن میں اردو" پر تبصرہ سے ایک اقتباس:

بخوبی روشن ہو جاتا ہے کہ مؤلف نے اس کی تالیف میں کس قدر محنت کی ہے۔ اور کس قدر مفید معلومات کو یکجا کر دیا ہے۔ اب میں چند نقائص کی طرف قابل مؤلف کو متوجہ کرنا چاہتا ہوں کہ وہ موجود نہ ہوتے تو کتاب کی وقعت اور بھی بڑھ جاتی۔ سب سے بڑی کمی یہ ہے کہ مؤلف نے بعض نہایت اہم مباحث پر مطلق بحث نہیں کی۔ اردو زبان کی تاریخ میں یہ بات نہایت تعجب خیز ہے کہ جو زبان دہلی اور نواح دہلی میں بولی جاتی تھی؛ وہ بندیاچل کے پہاڑی سلسلے کو پار کر کے دکن کے دور دراز سلسلے میں کیونکر رائج ہو گئی۔ مولف نے مقدمہ کی ابتدا میں صرف اتنا لکھا...... اس عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ جن مسلمان فاتحوں نے شمال اور مغرب کی طرف سے آ کر شمالی ہند میں اردو کی بناء قائم کی تھی۔ انہی نے دکن میں بھی اردو کی بنیاد ڈالی مگر تاریخ اس بیان کی تصدیق نہیں کرتی زبان اور انشا پردازی کے تدریجی ارتقا سے بھی بحث نہیں کی گئی۔"[41]

اس اقتباس کا مطلب نصیر الدین ہاشمی کی سعی کو ناشکور بنانا نہیں بلکہ صرف اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے کہ شیرانی کی مانند ہاشمی نظریہ ساز نہیں تھے انہوں نے ایک سچے محقق کی مانند شواہد کی عدم دستیابی کی بنا پر کوئی غلط دعویٰ نہیں کیا لیکن لطیفہ یہ ہے کہ لسانیات کی سبھی کتب میں "دکن میں اردو" کا اس انداز سے تذکرہ کیا جاتا ہے گویا ہاشمی نے قطعی طور پر

دکن کے اردو کا مولد ہونے کا دعویٰ کر دیا تھا۔ اس کے باوجود بھی کتاب کی اہمیت ہرگز کم نہیں ہوتی کیونکہ حافظ محمود شیرانی سے بھی پہلے نصیرالدین ہاشمی نے ایک مخصوص علاقے سے متعلق لسانی مواد یکجا کر دیا بلکہ اس پیشرو کتاب کے نتیجے میں پھر ایسی کتابیں سامنے آنے لگیں جن میں اردو زبان کا تعلق کسی خاص علاقے سے ظاہر کیا گیا تھا۔

ریگستان میں نخلستان

جہاں تک سندھ کا تعلق ہے تو ڈاکٹر مہر عبدالحق کے بموجب "وادی سندھ ہند سے الگ ملک تھا۔"[۴۲] وہ اس ضمن میں مزید رقمطراز ہیں کہ "سندھ کے حدود مختلف زمانوں میں مختلف رہے ہیں یعنی سندھ کے حاکموں کا قبضہ جہاں تک رہا سب سندھ کہا جاتا تھا۔ راجہ داہر جو سندھ کا آخری ہندو راجہ تھا، اس کے عہد میں جب عربوں نے حملہ کیا تو سندھ کی حدیں یہ تھیں۔ شمال میں دریائے جہلم کا منبع جس میں کشمیر کے نشیبی اضلاع شامل تھے اور کوہ کابل کا سلسلہ اس کی حد بندی کرتا تھا۔ پھر شمال مغرب تک دریائے ہلمند پہ جاکر وہ ختم ہوتا اور جنوب مغرب میں ایران اور سندھ کی سرحد اس مقام پہ تھی جہاں ساحل کے سامنے مکران کا جزیرہ منور واقع ہے جنوب کی طرف بحرِ عرب اور جنوب مشرق میں خلیج کچھ مشرق راجپوتانہ اور جیسلمیر کی سرحدیں آکر ملتی تھیں۔ غرض اس وقت تمام شمال مغربی صوبہ پنجاب کا علاقہ افغانستان کا وہ علاقہ جو دریائے ہلمند تک ہے سارا بلوچستان موجودہ سندھ، کچھ جودھ پور کی سرحد تک کا نام صوبہ سندھ تھا۔"[۴۳] "۳۷۵ھ کے جغرافیہ لکھنے والوں نے سندھ اور اس کے ملحقہ ممالک کو ایک اقلیم قرار دیا ہے اور اس کا نام اقلیم سندھ رکھا ہے۔"[۴۴]

سندھ کی اپنی تہذیبی اور لسانی اہمیت ہے اس میں موہنجو داڑو کی صورت میں سمیریوں اور دراوڑیوں کی تہذیب کے آثار پائے جاتے ہیں۔ اس خطے کے بابل نینوا وغیرہ کے ساتھ تجارتی روابط بھی تھے۔ جب دراوڑوں نے آریاؤں سے شکست کھائی تو ان کے بعض گروہ سندھ

آئے جو گوہ بلوچستان لبا کیں اور تمدن کی بنیاد رکھی۔ مکرانی لوگ اور براہوی زبان ان ہی
کی یادگار ہیں۔

عرب سندھ تعلقات

عرب سندھ تعلقات خاصے قدیم عرصے سے استوار نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سید سلیمان ندوی

لکھتے ہیں: "ایران کے بادشاہوں کا بلوچستان اور سندھ پر تسلط رہا۔ لہٰذا سندھ کے بعض جنگجو قبیلوں کے
لوگ ایرانی فوج میں شامل تھے۔ ان جنگجو قبیلوں میں سے دو کا ذکر عربوں نے کیا ہے اور
وہ جاٹ (زط) اور میڈ ہیں۔ یہ دونوں سندھ کی مشہور قومیں تھیں۔" وہ مزید لکھتے ہیں:
"عبداللہ بن مسعود صحابی نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ایک خاص شکل و صورت
کے لوگوں کو دیکھا تھا جن کی نسبت انہوں نے بتایا کہ ان کا چہرہ جاٹوں کی طرح تھا۔ ایران
کی شکست کے بعد یہ جاٹ عربوں کے ساتھ مل گئے۔ حضرت علی نے جنگ جمل کے موقع پر
بصرہ کا خزانہ انہیں جاٹوں کی نگرانی میں چھوڑا تھا۔ امیر معاویہ نے ان کو رومیوں کے مقابلہ
کے لیے شام کے ساحلی شہروں میں لے جا کر بسایا۔ ولید بن عبدالملک نے اپنے زمانے میں
ان کو انطاکیہ میں لے جا کر آباد کیا۔" مولانا ندوی نے تو یہاں تک بھی لکھا۔ "مہابھارت
میں جب کوروؤں نے لاکھ کا گھر بنا کر پانڈوؤں کو اس کے اندر جلا کر پھونک دینا چاہا تو
ودر جی نے یدھشٹر کو عربی زبان میں بتایا اور یدھشٹر جی نے اسی عربی زبان میں ان کو
جواب دیا۔ اگر یہ بیان صحیح ہے تو عربوں اور ہندوؤں کا رشتہ کتنا پرانا ثابت ہوتا ہے؟"[45]
ہندوستان سے عربوں کی دلچسپی کے بارے میں گذشتہ سطور میں مفصل لکھا گیا لیکن وہ جنوب
کے حوالے سے تھا۔ جہاں تک شمال کا تعلق ہے تو یہ مسلم ہے کہ درہ خیبر کے مقابلے میں سندھ
[illegible] سوم ثابت ہوا۔ اس ضمن میں ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں: "حضرت عمرؓ ہی کے زمانے

میں ہندوستان کے خشکی کے راستوں کی تحقیق و دریافت کی گئی اور بہت سی معلومات [illegible]
گئیں جن سے بالآخر آٹھویں صدی میں محمد بن قاسم کی فتح سندھ میں راہنمائی ہوئی۔[۱۵۹]

جبکہ نصیر حسین خان خیال کے الفاظ میں "عرب ایران سے فرصت پا کر اپنے ہمسایہ ملک [illegible]
طرف بڑھے۔ فتح نہاوند (۲۱ھ) سے اٹھارہ برس بعد ہوائے باغ ہند سر میں سمائی
(۳۸ھ خلافت علی مرتضیٰؓ) یعنی دروازہ ہند کھولا گیا اور پھر کابل (۴۱ھ/۶۶۱ء) پہنچ کر [illegible]
اتر آئے اور وہاں ڈیرے ڈال دیئے۔ شمال و مغرب کے پہاڑ اس ہلچل سے گونج اٹھے [illegible]
ان کی ایک جماعت دریائے سندھ عبور کر کے راجپوتانہ کے ریگستان میں گھس آئی۔ محمد علافی [illegible]
عرب نژاد بھی اسی زمانے میں اپنے جیش سے علیحدہ ہو کر اپنے رفقاء سمیت ادھر آیا اور
ہندی بن کر اس نے راجہ داہر (اخیر فرمانروائے سندھ جس نے قاسم کے ہاتھ سے شکست کھائی)
سے دوستانہ تعلقات قائم کر لیے۔ ان دو پرانی قوموں اور زبانوں (ہندی و عربی) کا ملاپ
قدرتاً قائم ہو رہا تھا کہ محمد بن قاسم (۹۱ھ/۷۱۱ء) کی کمک نے اس رشتے کو مضبوط و محکم
کر دیا۔"[۱۶۰]

محمد بن قاسم سندھ میں تین برس رہا۔ معاصر شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ غیر متعصب
اور رواداری حکمران ثابت ہوا۔ مقامی آبادی اس سے کس قدر متاثر تھی اس کا اندازہ اس
بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ اس کی رخصت اور المناک موت کے بعد اہلِ سندھ نے اسے
اوتار مان کر اس کا بت بنا کر پوجا شروع کر دی۔ مولف "داستان اردو" نے چچ نامہ اور
تاریخ میر معصوم کے حوالے سے مندرجہ بالا کے علاوہ یہ بھی لکھا ہے کہ "راجہ داہر کی رانی اروڑ
محمد بن قاسم کے عقد نکاح میں آئی۔ حاکم دیبل کی بیٹیاں حجاج (امیرِ وقت) کے پاس بھیجی گئیں
اور قلعہ راور (الور) کے سر ہونے پر علاوہ تیس ہزار لشکری قیدیوں کے تین ہندی شہزادیاں اور
راجہ داہر کی سگی بھانجی حبیبہ بھی عراق لائی گئیں اور حبیبہ کا نکاح عبداللہ بن عباس سے ہوا اور
پھر اسی راج کی دو اور شہزادیاں (سوریا دیبی اور دیپرمل دیبی) خلیفۂ وقت کے محل میں

عربوں کی کثیر تعداد سندھ میں آباد ہو چکی تھی ظاہر ہے ایک ایسا وقت بھی آ گیا ہوگا
یوں میں مزید شادیوں کی گنجائش نہ رہی ہوگی اور یوں مقامی آبادی سے مناکحت کا
شروع ہوا ہوگا۔ ادھر روزمرہ کے روابط، تجارت و کاروبار اور تبلیغ ان سب امور نے
عربوں اور سندھیوں کے تعلقات کے فروغ سے تمدن تبدیل کیا ہوگا وہاں مقامی بولی اور
ے لسانی صورتِ حال بھی متغیر ہوئی ہوگی۔ مزید براں جو تیس ہزار قیدی لشکری اور
بھیجے گئیں آخر ان کی زبان نے بھی تو عربی پر کچھ نہ کچھ اثرات ڈالے ہوں گے۔

یورپی حکمرانوں کے برعکس مسلمان فاتحین کی یہ خوبی رہی ہے کہ وہ جس خطے میں بھی بطور
فاتح داخل ہوئے وہاں کی تہذیب و تمدن اور زبان و مذہب کو نیست و نابود کرنے کے برعکس
بلکہ یہ کہ انہیں فروغ دینے کے طریقے بہم پہنچاتے رہے بلکہ ان میں اپنی تہذیب و تمدن
کے بہترین عناصر کے امتزاج اور عربی زبان کی آمیزش سے مشترک تہذیب و تمدن اور زبان کی
بنیادیں بھی استوار کر دیتے جس میں دونوں کے بہترین خصائص نمایاں نظر آتے۔ اس ضمن میں
ایران، مصر، اندلس اور ہندوستان میں جنم لینے والے تہذیبی اور لسانی امتزاج کو بطور مثال پیش
کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ سندھ میں بھی مسلمانوں کے زیر اثر امتزاجی عمل کا آغاز ہو جاتا ہے۔ محمد بن
قاسم نے مذہبی رواداری، تحمل اور غیر متعصبانہ لائحہ عمل کی جو بنیاد رکھی وہ اس کے بعد بھی جاری
رہا اس حد تک کہ جب ابن حوقل اس کے بعد یہاں کی سیر کو آتا اور ہندو مسلمانوں کے رشتہ
اتحاد کو خوشی مگر حیرت کے ساتھ دیکھتا اور کہتا ہے کہ ان دو قوموں (ہندو مسلمان) کے لباس
زبان، معاشرت اور ان کی رفتار و گفتار میں فرق و امتیاز مشکل ہے۔ دونوں ایک ہی زبان بولتے
ہیں۔ سندھ اور دیگر اضلاع میں عربی اور ہندی بولی جاتی اور ملتان میں ملتانی و فارسی عام ہے۔"[49]

سندھ: اردو کا پہلا گہوارہ

یہی وہ شواہد ہیں جن کی بنا پر سید سلیمان ندوی نے "نقوش سلیمانی" میں یہ دعویٰ کیا:
"سندھ کی وادی ہماری متحدہ زبان کا پہلا گہوارہ تھی۔" [50]

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی آمد کے وقت سندھ میں جو زبان مقامی طور پر بولی جا
رہی تھی وہ کیا تھی؟ اس کا جواب ڈاکٹر مہر عبدالحق کے بموجب: "ایسی اپ بھرنش ہے جو
کی یا تو شاخ ہے یا اس سے متاثر ہوئی ہے۔ کشمیری، سندھی اور کوہستانی سب دردی زبانیں ہیں
ملتانی اور سندھی (جسے لہندہ) کہا جاتا ہے دردی بنیادوں پر استوار ہیں۔" [51]

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے بھی "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں اسی خیال کا اظہار کیا ہے
کہ "براچڈ اپ بھرنش جو سندھ میں رائج تھی، موجودہ سندھی اسی سے نکلی ہے۔" [52] کیونکہ ان کے
بقول "سندھ کو پرانے زمانے میں براچڈ دیس کہا جاتا تھا۔" [53]

شریف الدین اصلاحی نے نبی بخش خان بلوچ کے حوالے سے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا
ہے کہ "سندھ کا تاریخی رشتہ سنسکرت سے پہلے کی کسی مقبول عام پروٹو پراکرت سے ملتا ہے" [54]
سید شبیر علی کاظمی نے بھی اپنی کتاب "پراچین اردو" میں اس مسئلے پر بحث کی ہے۔ انہوں
نے ڈاکٹر ممتاز حسین پٹھان (مولف: تاریخ سندھ) کے حوالے سے لکھا ہے کہ "عربوں کی آمد سے قبل
سندھ میں بولی جانے والی زبان پراکرت کی اپ بھرنش تھی اور اس کی اپنی صوتی خصوصیات تھیں
یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ ابھیرول (ابھیروں) کی زبان تھی۔ اس کو سندھیا بھاشا کہتے تھے، لیکن
الیف ایڈ گرائن نے اس کو سندھا بھاشا کہا ہے اور سندھا کے معنی علامتی یا مفصدی بتائے ہیں،
مگر اس وقت کے شاعر اس زبان کو عام طور پر دیش بھاشا ہی کہتے تھے۔" (ص: ٦) شبیر
علی کاظمی نے مزید لکھا ہے: "سنسکرت زبان میں سیاند، سندھیا اور سندھا الفاظ ملتے ہیں۔ سیاند
کے معنی رقیق شے، پگھلنے اور پھیلنے والی شے، ٹپکنے والا رس وغیرہ کے آتے ہیں۔ سندھیا کے معنی

جوڑنا، یکجا کرنا اور منظم کرنا بیان کیے گئے ہیں۔ سندھا سوتیات میں الفاظ کے میل کو کہتے ہیں۔ ایک لفظ انہی الفاظ سے ملتا جلتا سندھیا اور بھی ہے جس کے معنی میں سندھا کے معنی بھی پوشیدہ ہیں اور پو پھٹنے سے بھی مراد لی جاتی ہے۔ اب یہ امر فیصلہ طلب ہے کہ ان قدیم زبانوں کے لیے یہ نام آیا سوتیات کی بناء پر رکھے گئے تھے یا جغرافیائی نسبت کا خیال تھا یا شاعرانہ پیرایہ بیان اختیار کیا گیا تھا۔" (ص: ۶۰-۶۱)

مولانا سید سلیمان ندوی نے عرب ہند ملاپ کی وجوہات گنواتے ہوئے ان تاریخی شواہد کو جمع کیا ہے جن سے دونوں کے لسانی روابط اور پھر عربی فارسی اور سندھ کی زبان کے امتزاج کا آغاز ہوا اور یہ نتیجہ اخذ کیا:

"مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچتے ہیں اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولیٰ اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔"

انہوں نے اپنے ایک اور مقالہ بعنوان "اردو کیوں کر پیدا ہوئی؟" میں بھی انہی شواہد کو دہراتے ہوئے یہی نتیجہ اخذ کیا:

"ہر صوبے کی مقامی بولیوں میں مسلمانوں کی زبان کے الفاظ کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی مسلمانوں اور ہندوؤں کا یہ میل جول، سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھہ تک سندھ میں اور پھر ....." (ص: ۲۵۹)

اس ضمن میں پیر حسام الدین راشدی کے ایک مقالہ بعنوان "اردو زبان کا اصلی مولد سندھ" (مطبوعہ اردو کراچی اپریل ۱۹۵۱ء) کا مطالعہ بھی سودمند ثابت ہو سکتا ہے۔

یہ نظریہ کیونکہ شیرانی کی مانند مستحکم لسانی شواہد کی اساس پر استوار نہ تھا اس لیے اسے درست تسلیم کرنے میں بیشتر ماہرین کو تامل رہا ہے جبکہ پنڈت کیفی نے تو اسے سندھ کا قضیہ قرار دیتے ہوئے دو ٹوک الفاظ میں تردید کر دی:

"اگرچہ مسلمانوں کا دخل و عمل پنجاب اور اٹک پار سے داخلے سے پہلے سندھ میں ہوا مگر مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط سے کوئی نئی زبان پیدا نہیں ہوئی۔"[۵۴]

دائرہ کی تکمیل

یہ ہیں وہ تین اہم نظریے جن کی رو سے اردو کا آغاز کسی خاص علاقے سے مشروط قرار پاتا ہے۔ ان تینوں نظریات کا تقابلی مطالعہ کرنے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ صرف حافظ محمود شیرانی ہی صحیح معنوں میں ایک ایسا نظریہ پیش کرنے میں کامیاب رہے جو ابتدا میں متنازعہ ہونے کے باوجود بھی آنے والے ماہرین کے لیے مرکز توجہ بنا رہا۔ نصیر الدین ہاشمی نے جیسا کہ واضح کیا گیا خود اپنے ہی نظریے کو دو ٹوک الفاظ میں درست تسلیم نہیں کیا۔ اسی طرح سید سلمان ندوی پر بھی متعدد اعتراضات کیے گئے ہیں بلکہ شریف الدین اصلاحی کے بقول تو اس کی تغلیط خود سید صاحب کے اپنے ایک مضمون سے ہوئی ہے۔"[۵۶] (یہ مضمون ہے "اردو کیونکر پیدا ہوئی؟")

ادھر ڈاکٹر مسعود حسین خان نے بھی مختلف زبانوں کے لسانی ڈھانچوں کے تجزیہ کے بعد یہی نتیجہ اخذ کیا:

"لہندا اور سندھی دونوں دوآبہ کی زبانوں سے بالکل مختلف ہیں اس لیے اردو کے آغاز کا سلسلہ ان زبانوں سے نہیں ملایا جا سکتا۔ گو مسلمان اول اول انہی زبانوں کے علاقوں میں داخل ہوئے۔"[۵۵]

لیکن ڈاکٹر جمیل جالبی نے ان کے برعکس یہ لکھا ہے:

"جیسے سندھ کے عمر کوٹ میں پیدا ہونے والا بچہ آگے چل کر شہنشاہ ہند اکبر اعظم کے نام سے مشہور ہوا اسی طرح سندھ و ملتان میں پروان چڑھنے والی یہ زبان پنجاب اور ترک افغانوں کی توانائی کو جذب کر کے صدیوں بعد دہلی پہنچی

اور وہاں کی بولیوں سے نیا رنگ و نور لے کر جلد ہی مسلمانوں کی فتوحات کے
ساتھ سارے برِ اعظم کی مشترک زبان بن گئی اور اب بارہ سو سال بعد پھر اپنے
وطنِ مالوف واپس آ کر دائرے کو مکمل کرتی ہے جو محمد بن قاسم کی فتح سندھ
(۹۲ھ، ۷۱۲ء) کے فوراً بعد سے بننا شروع ہوا تھا۔" ۵۵

مختلف تہذیبوں کی باہم اثر پذیری متنوع تمدنی اقدار کی آمیزش اور مختلف لسانی دھاروں
(ا)ب اور پھر ان سے جنم لینے والی نئی صورت حال کا تجزیہ آسان نہیں ہوتا یعنی دو ٹوک
...ز میں کسی فرد یا مملکت کی تاریخ پیدائش اور موت کی مانند درست تاریخ دے دی جائے
...ز یا اثرات غیر مرئی طریقوں سے اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان اثرات کی قبولیت اور پھر ان
...ے نتائج کی ظہور پذیری طویل زمانے پر محیط ہوتی ہے۔ اس ضمن میں یہ امر بھی قابل توجہ
...ہے کہ ان اثرات کے دوران جن میں افراد کو شعوری طور سے خود بھی یہ احساس نہیں ہوتا کہ ہم
...ذہبی، تمدنی یا لسانی تغیرات کی کراس کرنٹس کے زیر اثر متغیر ہیں۔ حتیٰ کہ کئی نسلوں کے
...ور جب یہ تغیرات عمارات، ملبوسات، طرزِ بود و ماند کی صورت میں ٹھوس روپ اختیار کر
...ے ہیں تب کہیں جا کر ماضی سے جداگانہ ہونے کا احساس ہوتا ہے۔ زبان کا مسئلہ اور بھی پیچیدہ
...ہے کہ یہ معاملہ حرف و صوت کا ہوتا ہے اور جب تک یہ ضبط تحریر میں نہ آئے اس وقت
...ک لسانی شواہد کی شہادت مرتب نہیں ہوتی۔ تحریر کے بعد زبان کے اصل حسن کا اظہار تخلیقات
...صورت میں ہوتا ہے جس سے زبان کے ذخیرہ الفاظ میں تبدیلیوں کی داستان ترتیب پاتی
...ہے... زبان کے آغاز و ارتقاء جیسے موضوعات پر تحقیقات کرنے والے ماہرین لسانیات
...مشکلات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کیونکہ قدیم لسانی شواہد مخطوطات اور بیاضوں کی صورت
...میں ملتے ہیں۔ شیرانی کو دیگر محققین پر جو فوقیت حاصل ہوئی تو اس کا سبب محققانہ صلاحیتوں
...کے ساتھ ساتھ ان کا نادر ذخیرہ مخطوطات بھی تھا۔ آج بھی ہماری لسانی اور ادبی تحقیقات کا
...مخطوطات ہی پر نظر آتا ہے جس کے طفیل لاتعداد گمنام مصنفین، شعراء، کتابیں اور دواوین

تاریخ ادب کا حصہ بن گئے۔

اردو کہاں کہاں؟

شیرانی اور ہاشمی کی تحقیقات کے اثرات ہمہ گیر ثابت ہوئے اور اب اردو کو کسی خاص صوبے خطّے بلکہ شہر تک سے منسوب کرنے کا جو رجحان ملتا ہے وہ انہی بزرگوں کے تتبع [illegible] ہے یہی نہیں بلکہ اب تو یہ رجحان اصنافِ ادب پر بھی حاوی نظر آتا ہے۔ مندرجہ ذیل کتابوں سے کسی حد تک یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو کا ناطہ کن کن علاقوں سے جوڑا گیا ہے:

مدراس میں اردو	از نصیر الدین ہاشمی	حیدر آباد دکن	۱۹۳۸ء
مشرقی بنگال میں اردو	از اقبال عظیم	ڈھاکہ	۱۹۵۴ء
بنگال میں اردو	از وفا راشدی	حیدر آباد	۱۹۵۵ء
بلوچستان میں اردو	از ڈاکٹر انعام الحق کوثر	لاہور	۱۹۶۸ء
	طبع دوم	اسلام آباد	۱۹۸۶ء
سندھ میں اردو شاعری	از ڈاکٹر نبی بخش بلوچ	حیدر آباد	۱۹۷۰ء
سندھ میں اردو شاعری کا ارتقاء	از سید معراج نیر	لاہور	۱۹۷۲ء
ملتان میں اردو شاعری	از ڈاکٹر طاہر تونسوی	لاہور	۱۹۷۲ء
		طبع دوم	۱۹۸۵ء
کشمیر میں اردو	از حبیب کیفوی	لاہور	۱۹۷۹ء
سندھ میں اردو	از ڈاکٹر شاہدہ بیگم	کراچی	۱۹۸۰ء
سلہٹ میں اردو	از عبد الجلیل بسمل	کراچی	۱۹۸۱ء
اردو سندھی کے لسانی روابط	از شریف الدین اصلاحی طبع دوم	اسلام آباد	۱۹۸۶ء
ریاست میسور میں اردو	از ڈاکٹر آمنہ خاتون / محمد نان		

یہ تو صرف چند معروف کتابیں ہیں اگر اس ضمن میں سید فرت حسین کے مقالے "ہندوستان کی یونیورسٹیوں میں اردو تحقیق" کا مطالعہ کیا جائے تو پی ایچ. ڈی کے لیے قلمبند کیے گئے متعدد ایسے مقالات مل جاتے ہیں جن میں کسی خاص خطے کے حوالے سے اردو زبان اور ادب کا مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ (ان میں سے بعض مقالات مکمل ہو کر مطبوعہ یا غیر مطبوعہ صورت میں آ گئے ہیں جبکہ بعض زیر تکمیل ہیں)

دکنی اردو اور اس کی نشوونما	از عزیز اللہ بیگ	علی گڑھ یونیورسٹی
میسور میں اردو کی نشوونما	از ڈاکٹر حبیب النساء بیگم	دہلی یونیورسٹی
اودھ میں اردو	از ڈاکٹر محمد حسن	لکھنؤ یونیورسٹی
رام پور کی ادبی خدمات (۱۸۳۰ء تا ۱۹۳۰ء)	از وقار احمد	" "
اودھ میں اردو ادب کے ارتقاء کا سماجی اور تہذیبی پس منظر (۱۷۶۰ء تا ۱۸۵۶ء)	از سید عبدالباری	" "
بہار میں اردو زبان کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تک	از ڈاکٹر اختر اورینوی ڈی لٹ	پٹنہ یونیورسٹی
اردو ادب کی ترقی میں بھوپال کا حصہ	از ڈاکٹر سلیم احمد رضوی	آگرہ یونیورسٹی
بمبئی میں اردو	" ڈاکٹر میمونہ دلوی	بمبئی یونیورسٹی
اردو اور فارسی ادب میں برہان پور کا حصہ	از شیخ فرید	ناگپور یونیورسٹی
گذشتہ صدی میں راجستھان میں اردو کی ترقی میں غیر مسلموں کا حصہ	از ڈاکٹر اے ایف عثمانی	راجستھان یونیورسٹی
راجستھان کے اردو ادب کی تاریخ	از ڈاکٹر سید ثاقب رضوی	اودے پور یونیورسٹی
اودھ میں اردو شاعری کے ارتقاء میں عورت کا اثر	از ڈاکٹر زہرہ یاسمین	لکھنؤ یونیورسٹی

انیسویں صدی عیسوی میں لکھنؤ میں طنز و مزاح کا ارتقاء	از محمد نزہت پاشا	لکھنؤ یونیورسٹی
پنجاب میں اردو شاعری کا ارتقاء	از ڈاکٹر امرت لال عشرت	بنارس ہندو یونیورسٹی
الہ آباد میں اردو شاعری کا ارتقاء ۱۸۵۷ء تک	از رضیہ نقوی	الہ آباد یونیورسٹی
بہار میں اردو شاعری کا ارتقاء (۱۸۵۷ء سے ۱۹۱۴ء تک)	از ڈاکٹر کلیم احمد عاجز	پٹنہ یونیورسٹی
کرناٹک میں اردو ادب کا ارتقا	از خالد سعید	گلبرگہ یونیورسٹی
ریاست ٹونک میں شعری و ادبی روایات	از ڈاکٹر مس فیروز	راجستھان یونیورسٹی
دربھنگہ میں اردو کا ارتقاء	از عبدالظہیر انشاد	ایل این متھلا یونیورسٹی
پوربندر میں اردو ادب کا ارتقاء	از فاران شکوہ یزدانی	،، ،، ،،
تامل ناڈو میں اردو زبان ادب کا ارتقاء	از مظہر قلندر	مدراس یونیورسٹی
تامل ناڈو میں اردو زبان میں ادب کا ارتقاء	از شوکت جہاں	،، ۸۹ء

اس سلسلہ میں ان کتب کا نام بھی لیا جا سکتا ہے :

میسور میں اردو	از محمد سعید عبدالخالق	
دبستان گولکنڈہ ادب کلچر	ڈاکٹر محمد علی اثر	حیدر آباد ۱۹۸۱ء
دکن میں ریختی کا ارتقاء	از بدیع حسینی	حیدر آباد
مدراس میں اردو ادب کی نشوونما	از ڈاکٹر محمد افضل الدین اقبال	،، ۱۹۶۹ء

آغاز: زبانوں سے تعلق کے نظریات

"ہر کہ آمد ...."

اردو زبان کے آغاز اور ابتدائی نشوونما کے ضمن میں ان تین اہم محققین کے علاوہ کچھ ایسے ماہرین لسانیات بھی ملتے ہیں جنہوں نے کسی خاص خطے کو اردو کا مولد قرار دینے کے برعکس صرفی اصولوں اور نحوی قواعد کو اساس بنا کر دیگر زبانوں کے ساتھ اردو کی لسانی مشابہت تلاش کرتے ہوئے اس کے آغاز کا سراغ لگانے کی سعی کی۔ لہذا ان لسانی محققین کے نظریات کو اردو کو کسی خاص خطے سے منسوب قرار دینے کے خلاف ردعمل کے نظریات قرار دیا جا سکتا ہے۔ ان ماہرین میں ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر مسعود حسن خان اور ڈاکٹر سہیل بخاری کی کتابیں قابل ذکر ہیں۔ یہ نظریات درست ہیں یا غلط اس کا تعین لسانی محققین کا کام ہے۔ تاہم اتنا ہے کہ انہوں نے جدید ترین تحقیقات اور لسانی تصورات سے خصوصی استفادہ کیا۔ یہی نہیں بلکہ زبان کے آغاز اور نشوونما کے سلسلے میں بھی قابل قدر لسانی مواد جمع کر لیا۔ لہذا نظریات کی بنا پر نہیں تو کم از کم فراہمیٔ مواد کے باعث ہی ان کا کام قابل توجہ قرار پاتا ہے۔

ویسے ایک بات ہے کہ جدید لسانی محققین سے بھی کہیں پہلے مولانا محمد حسین آزاد نے "آب حیات" میں زبان کے آغاز کے بارے میں جو تصور پیش کیا تھا وہ زبان کو کسی خاص علاقے سے منسوب کرنے کے برعکس کسی دوسری زبان سے تعلق قائم کرنے کی اولین کوشش قرار پاتا ہے۔

یوں دیکھیں تو نظریہ کی تردید کے باوجود بھی لسانی نظریہ سازوں میں مولانا محمد حسین آزاد کو پیش رو جیسی حیثیت حاصل ہو جاتی ہے۔

"برج بھاشا"

مولانا آزاد نے آبِ حیات میں "زبان اردو کی تاریخ" کا آغاز اس پُریقین اسلوب میں کیا:

"اتنا تو ہر شخص جانتا ہے کہ ہماری زبان اردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے اور برج بھاشا خاص ہندوستانی زبان ہے لیکن وہ ایسی زبان نہیں کہ دنیا کے پردے پر ہندوستان کے ساتھ آئی ہو۔ اس کی عمر آٹھ سو برس سے زیادہ نہیں ہے اور برج کا سبزہ زار اس کا وطن ہے۔"[60]

اگرچہ ماہرین لسانیات کی اکثریت نے مولانا آزاد کے اس نظریہ کو درست تسلیم نہیں کیا تاہم حکیم سید شمس اللہ قادری نے "اردوئے قدیم" میں اس خیال کا اظہار کیا ہے: "اردو کا منبع اور مخرج برج بھاشا ہے" وہ اس ضمن میں رقمطراز ہیں "زمانہ حال کی تاریخی اور لسانی تحقیقات سے یہ امر ثابت ہو گیا ہے کہ زبان اردو کا منبع و مخرج برج بھاشا ہے اور اس کی تائید اس بات سے ہوتی ہے کہ تیرہ، چودہ، پندرہ اور اسی قبیل کے الفاظ جو اردو میں مستعمل ہیں وار دچی نے انہیں اپنی گرامر میں بجنسہٖ بیان کیا ہے"[61] "مسلمان فاتحوں سے جب ہندوؤں کا میل جول ہوا تو برج بھاشا میں تغیر شروع ہوا جو روز بروز بڑھتا گیا اور ایک عرصے کے بعد زبان کی اصل ہیئت بدل گئی جس کے باعث ایک جدید زبان کا ظہور ہوا اور یہ جدید زبان سلاطین مغلیہ کے دور میں زبان اردو کے نام سے موسوم ہوئی۔"[62]

لسانی مباحث میں برج اور برج بھاشا کا اکثر ذکر آتا رہتا ہے آخر یہ برج اور برج بھاشا کیا چیز ہے؟ اس ضمن میں قدر بلگرامی کی تالیف "قواعد العروض" سے یہ معلومات ملتی ہیں:

"برج بھاشا بہ کسر اول و سکون رائے مہملہ و جیم تازی سنسکرت میں اس کی اصل ورج بھاشا ہے۔ ورج بکسر واو بہ معنی انبوہ و خلط و شمول بھاشا بہ فتح موحدہ مع ہائے مخلوط و شین معجم

...ن شنیدہ یعنی آواز گفتگو، برج اصطلاحاً ہندوستان میں ایک مغربی احاطہ کا نام جو چوراسی ...ں کے گرد میں ہے۔ اس میں کئی بن شامل ہیں جیسے برندا بن، متھرا، گوکل وغیرہ۔ اسی برج ...ں برج بھاشا کہتے ہیں۔[62] ایک کوس دو میل سے کچھ زیادہ ہوتا ہے اور چوراسی کوس کے گرد ...صحیح نہیں ہے بلکہ چاروں طرف چوراسی چوراسی کوس ہے۔ اس طرح تقریباً ایک سو ستر ...ں ہوتے ہیں۔"[63]

جہاں تک اس بحث کا تعلق ہے رام بابو سکسینہ نے "تاریخ ادب اردو" میں اس خیال اظہار کیا:

"زبان اردو کی صرف و نحو، محاورات اور کثرت سے ہندی الفاظ کا اس میں استعمال ہونا اس بات کی بیّن دلیل ہے کہ اس کی ابتدا ہندی سے ہوئی اور یہ محض اتفاق تھا کہ وہ ہندوستان کی زبانِ عام بن گئی۔"[64]

سکسینہ نے آزاد کی تردید کرتے ہوئے یہ لکھا:

"برج بھاشا کو اردو کا ماخذ قرار دینا جو کہ مغربی ہندی کی ایک شاخ ہے اور جیسا کہ مولانا محمد حسین آزاد نے بھی سمجھا ہے، صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے کہ برج بھاشا جو متھرا اور اس کے جوانب میں بولی جاتی تھی وہ اس بھاشا سے جو اطراف دہلی میں بولی جاتی تھی، بہت مشابہت رکھتی ہے مگر پراکرت کی ایک علیحدہ شاخ ہے اور یہی شاخ یعنی دلی بھاشا ہمارے خیال میں اردو کی اصل سمجھی جا سکتی ہے ... اردو کا اصل ماخذ وہ زبان ہے جو دلی اور میرٹھ کے اطراف میں بولی جاتی تھی جس کو مغربی ہندی کی ایک شاخ سمجھنا چاہیے اور مغربی ہندی اپنی جگہ پر شورسینی پراکرت سے پیدا ہوئی۔"[65]

دلی، میرٹھ اور متھرا میں زیادہ فاصلہ نہیں لیکن دیکھ لیجیے یہاں کی زبانیں اپنے اپنے طور پر اردو کا ماخذ قرار دی جا رہی ہیں۔

ڈاکٹر سہیل بخاری نے بھی "اردو کا روپ" میں مولانا آزاد کی تردید کی ہے۔
(ص ۶۱ تا ۶۵)

ھریانی

ڈاکٹر مسعود حسین خان نے "مقدمہ تاریخ زبان اردو" میں اردو کے برج بھاشا، پنجاب، دکن اور سندھ سے تعلق کو مسترد کر دیا۔ انہوں نے مختلف زبانوں اور بولیوں کے تقابلی مطالعے کے بعد اردو کا تعلق ہریانی کے ساتھ جوڑا۔ ان کے استدلال کی اساس یہ ہے:

"شہر دہلی کے جغرافیائی محلِ وقوع پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ یہ شہر برج بھاشا، ہریانی، کھڑی بولی اور میواتی (راجستھان کی ایک بولی) کے سنگم پر واقع ہے۔ راجپوتوں کی دلی ڈلی یا اپ بھرنش ادبیات کی "ڈھلی" ہریانہ کے علاقہ میں تھی جس سے کھڑی بولی کی بہ نسبت میواتی زیادہ قریب تھی۔ شاہجہان کی دہلی (خسرو کا اندرپت، اندرپرست) کئی میل ہٹ کر شمال میں بسائی گئی تھی۔ جس کی آبادی آگرہ کے نو وارد برج بولنے والوں کی تھی پنجابی مغربی ہندی کی بولیوں میں چونکہ ہریانی سے قدیم تر ہے اس لیے اردو اور دکنی سے مماثلت رکھتی ہے۔ بعد کو مغلوں کے عہد میں برج بھاشا اور کھڑی بولی کے اثرات اس پر غالب آجاتے ہیں اور اردو کا پنجابی پن زائل ہونا شروع ہوتا ہے لب ولہجہ بدلتا ہے۔" (ص: ۹۲) "دہلی میں بولیوں کی آنکھ مچولی کی داستان تفصیل سے بیان کرنا ناممکن ہے۔ اس لیے کہ اس عہد کا تحریری مواد تقریباً مفقود ہے۔۔۔۔ اردو کی ابتدا کے سلسلے میں نئے نظریے کی تشکیل اس طور پر کی جا سکتی ہے کہ ہم نواحِ دہلی کی تمام بولیوں کا تقابلی مطالعہ کریں اور دکنی زبان کی خصوصیات کو پنجابی کی بجائے ان میں پہچاننے کی کوشش کریں۔ ایسا کرتے وقت ان بولیوں کے جدید روپ ہی پیشِ نظر نہ رہیں بلکہ ان قدیم نمونوں کا بھی جائزہ لیں جو دستیاب ہیں۔ مذکورہ بالا تقابلی مطالعے کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ قدیم اردو کی تشکیل براہِ راست ہریانی کے

زیر اثر ہوتی ہے۔ اس پر رفتہ رفتہ کھڑی بولی کے اثرات پڑتے ہیں اور جب پندرھویں صدی میں آگرہ دارالسلطنت بن جاتا ہے اور کرشن بھگتی کی تحریک کے ساتھ برج بھاشا عام مقبول ہو جاتی ہے تو سلاطین دہلی کے عہد کی تشکیل شدہ زبان کی نوک پلک برجی محاورے کے ذریعے درست ہوتی ہے۔" (ص: ۱۸۳)

قدیم ویدک بولی

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لیے لکھے گئے تحقیقی مقالہ "اردو زبان کی تاریخ" میں اردو کے آغاز کے بارے میں جو نظریہ تشکیل دیا اس کی اساس یہ خیال ہے:

"کسی زبان کے متعلق یہ فیصلہ کرنے کے لیے کہ اس کا ماخذ کیا ہے ضروری ہے کہ اس زبان کا لسانی تجزیہ کیا جائے اور اس کے صرفی نحوی اصول اور صوتی تبدیلیوں کی ارتقائی و تقابلی تاریخ پر نظر رہے۔ اس سلسلے میں صرفی و نحوی قاعدوں اور صوتی تبدیلیوں کو زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ ہندو پاکستان کی زبانوں کے رشتے ان کی امتیازی صفات اور ان کی خصوصیات کا علم انہی چیزوں سے ہوتا ہے۔ اس لیے میں نے اس مقالے میں گرامر اور صوتی تبدیلیوں سے بحث کی ہے اور اردو کے صوتی نظام کو نظر انداز کر دیا ہے۔" (ص ۸۵، ۸۶) چنانچہ اسی انداز پر انہوں نے ہندوستان کی زبانوں اور بولیوں کا صرفی نحوی مطالعہ کیا اور اپنے نتائج کی روشنی میں ماضی کے ماہرین سے یوں اختلاف کیا:

"ایک زمانے تک اردو کو برج بھاشا کی ہی ایک شاخ بتایا گیا۔ یہ غلط فہمی دور ہو جانے پر برج کی بہن بتایا جا رہا ہے اور شورسینی اپ بھرنش اور پراکرت سے اس کا رشتہ جوڑا جا رہا ہے.... اردو کی صرفی و نحوی خصوصیات پر ایک نظر ڈالنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو کا ماخذ شورسینی پراکرت یا اپ بھرنش نہیں۔" (ص: ۸۳، ۸۴)

ڈاکٹر شوکت سبزواری کا اپنا تصور یہ ہے:

"اردو ہندوستانی یا کھڑی قدیم ویدک بولیوں میں سے ایک بولی ہے جو ترقی کر
کرتے یا یوں کہیئے کہ ادلتے بدلتے پاس پڑوس کی بولیوں کو کچھ دیتے اور کچھ ان سے لیتے
اس حالت کو پہنچی جسے ہم آج دیکھتے ہیں۔ قیاس کیا جاتا ہے کہ یہ میرٹھ اور ان کے نواح میں
بولی جاتی تھی۔" ۶۲

ڈاکٹر شوکت سبزواری اپنا استدلال جاری رکھتے ہوئے لکھتے ہیں: "پالی اس کی ترقی یافتہ
ادبی اور معیاری شکل ہے اور اردو اور پالی دونوں کا منبع ایک ہے۔ پالی ادب، فن اور
فلسفہ کی زبان ہے اور ہندوستانی روزانہ بول چال لین دین اور کاروبار کی پالی اعلیٰ درجہ
کو پاکر ٹھہر گئی لیکن ہندوستانی عوام کی زبان ہونے کی وجہ سے اور بازار ہاٹ میں بولے
جانے کے باعث برابر ترشتی ترشاتی اور چھلتی چھلاتی رہی۔" (ص: ۸۷)

ڈاکٹر شوکت سبزواری نے اپنی ایک اور کتاب "اردو لسانیات" میں بھی اسی خیال کا
اعادہ کیا:

"بارہویں صدی عیسوی کے آخر میں اردو دہلی اور اس کے نواحی علاقے میرٹھ میں بولی
جا رہی تھی۔ محمد غوری کے انتقال کے بعد ۱۲۰۶ء میں قطب الدین ایبک دہلی کے تخت پر بیٹھا
میرا خیال ہے اس سے پہلے اردو ابھر کر برج قنوجی، بندیلی وغیرہ بولیوں سے امتیاز حاصل
کر کے پختہ اور آزاد بول چال کی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ اس امتیاز کے بعد اردو کو
اہلِ علم نے کھڑی بولی کے نام سے یاد کیا۔ اس کی ہمسر بولیاں پڑی کہلائیں۔" (ص ۸)

مہاراشٹری

ڈاکٹر سہیل بخاری نے مولانا محمد حسین آزاد، حافظ محمود شیرانی، سید سلیمان ندوی اور ڈاکٹر شوکت
سبزواری کے تصورات مسترد کرنے کے بعد اپنا جو تصور پیش کیا۔ اس کی رو سے اردو "مہاراشٹری
جینے کی بولی" ثابت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے "اردو کی کہانی"، "اردو کا روپ" اور

بعض مقالات میں جو طرزِ استدلال روا رکھا اس کی رو سے نہ تو اردو کا مخصوص خطوں سے تعلق بنتا ہے اور نہ ہی مسلمانوں کی آمد سے نئی زبان کا کینڈا تیار ہوتا ہے۔ ان کی دانست میں اردو کے آغاز اور تشکیل کا ان سے کوئی تعلق نہیں ان کے بقول اردو کی بولی کے جنم پر جس جس نے جو کچھ کہا ہے اس کی جانچ پرکھ اور چھان پھٹک کر کے یہی سمجھ میں آتا ہے کہ اردو ہی نہیں، ہندوستان کی سبھی بولیاں جو آج کل بولی جا رہی ہیں، آریوں کے ہندوستان آنے سے پہلے بھی بولی جاتی تھیں۔ آریوں کے آتے وقت بھی اور جب سے اب تک برابر بولی جا رہی ہیں۔ ان میں سے کوئی سی بھی بولی کبھی گھڑی دو گھڑی کے لیے بھی نہیں رکی ہے اور جب سے اب تک ان کی آوازوں اسلوں اور ڈھانچوں میں کوئی بل آیا ہے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ ان کی بولیاں بدلتی رہی ہوں یا لپیوں کی ریت میں فرق پڑ گیا ہو اور یہ بات ان کا کھوج لگانے سے کھل سکتی ہے۔ میں اردو کے لیے ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ بولی بھی اتنی پرانی ہے جتنی ہندوستان کی دوسری بولیاں۔ یہ مسلمانوں کے ہندوستان میں آنے سے پہلے دیوناگری (دیوناگر کی) لیپی میں لکھی جاتی تھی اور ان کے آتے پیچھے ان کی لائی ہوئی فارسی یا (عربی) لیپی میں لکھی جانے لگی۔ جس سے ہمارے عالموں کو یہ دھوکا ہو گیا کہ اردو ہندوستان میں مسلمانوں کے آنے پر جنمی ہے۔[67]

ڈاکٹر سہیل بخاری اپنے استدلال کو اس کی منطقی انتہا پر لے جاتے ہوئے لکھتے ہیں:

"رگ وید ہندوستان کی قدیم ترین اور آریوں کی وہ پہلی کتاب ہے جو ہم تک پہنچی ہے چنانچہ اس میں اردو الفاظ کی موجودگی یہ ثابت کر رہی ہے کہ ہماری زبان ویدک کال سے بھی پہلے سے اس علاقے میں بھاشا کے طور پر کام آ رہی ہے۔ ان الفاظ سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ ہماری بول چال کی آوازوں سے ہزاروں سال سے آج تک زیر و زبر پیش کا بھی فرق نہیں آیا ہے اور اسی طرح کے ماخذ اور اشتقاق سے متعلق اب تک کی تمام غلط فہمیاں اور تمام نظریات از خود باطل ہو جاتے ہیں۔"[68]

اسی استدلال کی بنا پر انھوں نے مروج لسانی نظریات مسترد کر کے یہ نتیجہ اخذ کیا:

"اردو کی جنم بھومی مشرق میں اڑیسہ اور جنوب میں تلنگانہ سے محدود ہیں۔ میرے نزدیک
اصل میں اردو کا گھر یہی ہے۔"

انہوں نے "اردو کا روپ" میں لکھا:

"اردو بولی نہ پشاچی جتھے میں گنی جا سکتی ہے نہ شورسینی نہ ماگدھی میں نہ اردھ
میں نہ مہاراشٹری جتھے کی بولی ہے۔" (ص ۸۷)

اور پھر انہوں نے لسانی شواہد پیش کر کے (ص ۷۸۔۸۰) اسے ثابت کیا ہے۔
اپنے ایک اور مقالے "مسئلہ آغاز اردو" میں بھی انہوں نے یہی کچھ لکھا اور اپنے
دلائل سے یہ نتیجہ اخذ کیا:

"اردو زبان نہ شورسینی سے نکلی ہے نہ پالی سے بلکہ اس کا ماخذ مہاراشٹری پراکرت ہے
اس پراکرت کے نقوش میں نے رگ وید میں بھی دیکھے ہیں۔ اردو کی اصل مرز یوم کے متعلق
اب تک جو کچھ کہا گیا ہے وہ بھی یکسر غلط ہے۔ مہاراشٹر پراکرت ملک مہاراشٹر میں بولی جاتی
تھی اور اسی ملک مہاراشٹر کے مشرقی علاقے میں پیدا ہوئی اور مرہٹی کی سگی بہن ہے۔"[۹۹]

دراوڑی

اور آخری نظریہ عین الحق فرید کوٹی کا ہے جن کے بموجب اردو کا ماخذ دراوڑی اور منڈا
زبانیں ہیں۔ اب ہمارے ہاں اور یورپ میں برصغیر کی تہذیبی اور لسانی میراث میں دراوڑی
اور منڈا قبائل کے اثرات کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ رشید اختر ندوی لکھتے ہیں:
"مسٹر اداونس نے مشہور پروفیسر وان اکسڈٹ کا یہ خیال بڑے وثوق کے ساتھ نقل کیا کہ اولیں
پاکستان کے سب سے پہلے آبادکار وہ سیاہ فام لوگ تھے جو برفانی عہد میں افریقہ ملیشیا سے
یہاں پہنچے اور پاکستان کی سب سے پہلی آبادیاں ان لوگوں کی تھیں جو کول ہیری یا منڈا زبان
بولتے تھے۔"[۱۰۰]

ماہر لسانیات کا اس پر اتفاق ہے کہ بلوچستان کے ایک حصے میں بولی جانے والی براہوی زبان دراصل دراوڑی زبان کی باقیات میں سے ہے۔ بلکہ رشید اختر ندوی کے بموجب تو سندھ میں بولی جانے والی موجودہ سندھی اور اس سے ملحقہ پنجابی زبان بھی ڈراویڈن یا تورانی الاصل ہے اور وہ زبان جو مہنٹر نے موہنجو ڈیرو اور وادیٔ ژوب اور بعض دوسرے مقامات سے برآمد ہونے والی مہروں پر کندہ پائی ہے ان سب کی اصل الاصل تھی۔ یہ ساری زبانیں کسی ایسی زبان سے نکلی ہیں جسے بولنے والے تورانی الاصل یا ڈراویڈن کم سے کم پانچ ہزار سال قبل مسیح میں وادی سندھ اور بلوچستان میں داخل ہوئے اور جنہیں بعد میں آنے والے آرین نے اپنا رقیب بنا لیا۔"[42]

دراوڑی سے براہوی کے تعلق پر بھی خصوصی تحقیق ہوئی ہے۔ چنانچہ انور رومان کے مضمون بعنوان "براہوی کا ایک گیت" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۱۸۴۴ء میں ایک جرمن عالم لیسن نے اس نظریہ کا اظہار کیا تھا کہ براہوی دراوڑ السنہ سے مشابہت رکھتی ہے۔ لیسن کے بعد کم و بیش بیس یورپی فضلاء اس زبان پر کام کر چکے ہیں۔ جن میں سے آٹھ علماء نے تو اس زبان کی ماہیت اور ساخت ہی کو موضوع مطالعہ بنایا ہے۔ یہ علماء ریونڈ رابرٹ، کالڈویل، ڈاکٹر ارنسٹ ٹرمپ، ڈاکٹر ہبو ڈور ڈوکا، پروفیسر جان ڈیوی، ڈاکٹر جی اے گریئرسن، سر ڈینے برے ڈاکٹر ایم بی ایمنو اور ڈاکٹر عبدالرحمٰن بار کر ہیں۔ ان آٹھ علماء کی تحقیقات نے یہ ثابت کر دیا کہ براہوی دراوڑ السنہ سے مشابہت ہی نہیں رکھتی بلکہ یہ ان ہی کی ہم اصل ہے اس لیے کہ بلحاظ گرامر روزمرہ براہوی زبان اپنی کم و بیش دو زبانی دخیل لغت کے باوجود خالص دراوڑی زبان ہے۔"[43]

یہ وہ تناظر ہے جس میں عین الحق فرید کوٹی نے متعدد غیر ملکی ماہرین سے لسانی شواہد حاصل کر کے پنجابی، سندھی، دراوڑی اور اردو کے مشترک الفاظ کی فہرست مرتب کی اور "اردو زبان قدیم تاریخ" میں اس خیال کا اظہار کیا:

"جب ہم اردو زبان کی صرف و نحو کا پنجابی اور برج بھاشا کی صرف و نحو سے مواز
کرتے ہیں تو یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ جہاں اردو اور پنجابی کے درمیان گہرا رشتہ
ہے وہاں اس کے برج بھاشا کی اختلافات کی خلیج وسیع ہے۔" (ص: ۸۰) "واضح رہے
کہ اردو زبان کا صرف و نحو کے لحاظ سے فارسی اور سنسکرت سے نہ صرف فروعی بلکہ اصولی
اور بنیادی طور پر اختلاف ہے۔ یہ بات کسی طرح ذہن میں نہیں آتی کہ ایک زبان کی شاخ اس
سے اتنی مختلف ہو۔ دنیا کی زبانوں کی تاریخوں میں ہمیں ایسی کوئی مثال نظر نہیں آتی" (ص: ۹۱)
"اردو اور سنسکرت میں کافی حد تک لغوی اشتراک موجود ہے لیکن اس سے یہ یکطرفہ فیصلہ دے
دینا کسی طرح جائز نہیں کہ یہ تمام کا تمام سرمایہ الفاظ سنسکرت ہی نے اردو کو دیا ہے، بلکہ
معاملہ اس کے برعکس بھی تو ہو سکتا ہے یعنی خود سنسکرت نے یہ الفاظ اردو ہی کی پیشرو
زبانوں سے اخذ کیے ہوں۔" (ص: ۲۳۲) "جب یہ امر پایہ ثبوت تک پہنچ جاتا ہے کہ اردو
زبان کا سرچشمہ نہ تو سنسکرت ہے نہ فارسی تو صدیوں پرانے مفروضہ کا فلک بوس محل آن واحد
میں زمین پر آ رہتا ہے۔" (ص: ۹۳) "جب ہم اردو زبان کے لغوی سرمائے اور صرف و نحو
کا موازنہ برصغیر کی موجودہ زبانوں سے کرتے ہیں تو جو زبان اس کے سب سے زیادہ نزدیک
نظر آتی ہے وہ پنجابی ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا کہ صرف و نحو کے لحاظ سے پنجابی کے
علاوہ کوئی دوسری زبان اردو سے گہری مطابقت نہیں رکھتی۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ اردو زبان
کی بنیادیں وادی سندھ ہی میں استوار ہوئیں اور اس کا سلسلہ نسب پنجابی اب بھرنش اور
مقامی پراکرت سے ہوتا ہوا قدیم ہڑپائی عہد سے جا ملتا ہے جو کہ آریاؤں کی آمد سے قبل وادئ
سندھ میں مروج تھی۔" (ص: ۹۴) "آریاؤں کی آمد کے وقت وادئ سندھ میں دراوڑی قبائل
کو بالادستی حاصل تھی۔ منڈا قبائل برصغیر کے قدیم ترین باشندے ہیں اور دراوڑوں کی آمد
سے قبل یہاں آباد تھے۔" (ص: ۹۶) "وادی سندھ کی ہڑپائی تہذیب کی پیشرو آمری نال تہذیب
منڈا قبائل کی مرہون منت تھی اور آج سے کوئی چھ ہزار برس قبل یا اس سے بھی پہلے یہاں منڈا

گروہ کی زبانوں کا چلن تھا۔" (ص: ۱۲۵) "آریاؤں کی آمد سے قبل وادیٔ سندھ میں دراوڑ اور منڈا اقوام کا دور دورہ تھا اور ہڑپا اور موہنجوداڑو کی گلیوں اور بازاروں میں انہی گروہوں سے تعلق رکھنے والی زبانیں بولی جاتی تھیں۔" (ص: ۱۷۱) عین الحق فریدکوٹی کے استدلال کی رو سے دراوڑی زبان ہی اردو اور اس کے ساتھ پنجابی کی بھی ماخذ ہے۔ محمد مجیب نے بھی سنسکرت پہ دراوڑی کے اثرات تسلیم کرتے ہوئے لکھا ہے، "سنسکرت ابجد کے دندانی حروف (ٹ ڈ وغیرہ) اور کسی ہند جرمانی زبان میں نہیں ملتے دراوڑی زبانوں میں البتہ پائے جاتے ہیں اور یہ سنسکرت میں دراوڑی اثرات کی بدولت شامل کیے گئے ہوں۔ سنسکرت کے بہت سے الفاظ کا مادہ آریائی نہیں معلوم ہوتا ان کا ماخذ دراوڑی زبانیں ہوں گی۔"[۴۴]

عین الحق فریدکوٹی نے اپنے ایک مقالے "پالی، ٹیکسلا یونیورسٹی میں تعلیم کی زبان میں" یہ لکھا ہے، "پالی اور پنجابی میں گہرا لسانی اشتراک موجود ہے۔"[۴۵] انہوں نے اپنے استدلال کی روشنی میں سنسکرت کے مقابلے میں پنجابی اور پالی کے مشترک الفاظ بھی پیش کیے جن میں سے چند درج ذیل ہیں:

سنسکرت	پنجابی	پالی
نرت	ناچ	ناچ
ستیہ	سچ	سچ
کرم	کم	کم
سوترہ (دھاگہ)	سوت	سوت
سرپ (سانپ)	سَپ	سپ

عمارتِ نو ساخت

ان تمام نظریات کے مجموعی مطالعہ سے یہ بات بطور خاص نمایاں ہو جاتی ہے کہ دوسری دہائی

(شیرانی ہاشمی) اور تیسری دہائی (ندوی) کے محققین تاریخی حالات کے تناظر میں اردو کو
خطے سے مشروط قرار دیتے تھے جبکہ ان کے بعد آنے والوں نے صرفی و نحوی قواعد کی
میں لسانی اشتراک اور لفظوں کی ساخت کو اساس بنا کر نظریات کی عمارت استوار کی جس
میں ہریانی، مہاراشٹری، دراوڑی اور منڈا زبانیں اردو کا ماخذ قرار پا رہی ہیں۔ اردو کی
کی تلاش بھی کچھ دریائے نیل کے منبع کے کھوج کا منظر پیش کرتی ہے۔ یہ معلوم سے نامعلوم
تک کا سفر ہے۔ ہمارے محققین ماضی بعید میں دور تک کا سفر کر کے اس مقام تک پہنچ چکے ہیں
جہاں تاریخ دھندلکوں میں گڈمڈ ہو جاتی ہے اور ماضی تاریک گپھا میں۔

حقیقت کیا ہے، شاید کلی حقیقت کہیں بھی نہ ملے لیکن جزوی صداقت سب کے پاس ہے
بادی النظر میں دلائل سب کے درست معلوم ہوتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ یہ تمام دلائل اور ان سے جنم
لینے والے نظریات ایک گلدستہ کی صورت اختیار کر لیتے ہیں جن کا انفرادی کے برعکس مجموعی تاثر
ہوتا ہے:

اب ایک اہم سوال!

اس کے بعد لسانی تحقیقات کس نہج کی ہوں گی اور ان کا رُخ کدھر ہو گا۔ ہمارے یہ محققین
اپنی محنت اور اپج سے لسانیات کی جتنی خدمت کر سکتے تھے کر چکے۔ اب ضرورت ایسے ماہر کی محسوس
ہوتی ہے جو ان تمام محققین کے جمع کردہ منتشر اور بظاہر متناقض لسانی شواہد، مختلف زبانوں کے
بارے میں فراہم کیے گئے مواد اور لاتعداد بولیوں کے بارے میں جمع کی گئی معلومات کی اس کثرت
میں وحدت پیدا کر کے ایسا جامع اور عظیم نظریہ پیش کر سکے جو سب نظریات پر استوار ہونے کے
باوجود اپنے نتائج میں ان سے ممتاز اور منفرد بھی ثابت ہو:

کون ہوتا ہے حریفِ مے مرد افگن عشق

حواشی

۱۔ رشید اختر ندوی "ارضِ پاکستان کی تاریخ" ص: ۵۹۔

۲۔ ایضاً ص: ۶۱ / ۶۰

۳۔ بحوالہ "اردو زبان کی قدیم تاریخ" ص: ۱۰۴ تا ۱۱۵۔

۴۔ ایضاً ص: ۹۶۔۹۷۔

۵۔ "ارضِ پاکستان کی تاریخ" ص: ۱۷

۶۔ "تاریخ تمدنِ ہند" ص: ۲۴

۷۔ ڈاکٹر محمد باقر "اردو قدیم دکن اور پنجاب میں" ص: ۲۵

۸۔ ایضاً ص: ۲۸

۹۔ ڈاکٹر شوکت سبزواری "اردو زبان کا ارتقاء" صفحہ: ب

۱۰۔ ایضاً صفحہ: ج

۱۱۔ "تاریخ ادب اردو" جلد اول، ص: ۵۹۸

۱۲۔ مقالہ مشمولہ "اردو میں اصول تحقیق" جلد دوم، مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش ص: ۲۲۴

۱۳۔ "آج کل" اردو تحقیق نمبر دہلی اگست ۱۹۶۷ء

۱۴۔ "اردو میں اصول تحقیق" جلد اول ص: ۳۰۰

۱۵۔ "عابد علی عابد" "انتقاد" ص: 115

۱۶۔ ایضاً ص: ۱۱۷

۱۷۔ "کیفیہ" ص: ۵۷

۱۸۔ ایضاً ص: ۵۷

۱۹۔ "کیفیہ" ص: ۵۹

۲۰۔ مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو محمد اکرام چغتائی کا مقالہ "پنجاب میں اردو،" مزید تحقیق، نقوش
فنون سالنامہ و غالب نمبر شمارہ ۱۵، ۱۹۶۹ء

۲۱۔ "تنقیدات عبدالحق" ص: ۱۳۲

۲۲۔ ایضاً ص: ۱۳۱

۲۳۔ ایضاً ص: ۱۳۱

۲۴۔ ملاحظہ کیجئے بحث بعنوان "اردو اور اہل زبان۔" شرکار: شیر پنجاب اور اہل زبان۔ مطبوعہ
ادبی معرکہ نمبر ۲، ستمبر ۱۹۸۱ء

۲۵۔ نصیرالدین ہاشمی "دکن میں اردو" ص: ۹

۲۶۔ "تمدن عرب" ص: ۸۶

۲۷۔ ایضاً ص: ۵۰۳۔

۲۸۔ سید سلمان ندوی، "عرب و ہند کے تعلقات" ص: ۲۸

۲۹۔ ڈاکٹر سید محمود "متحدہ ہندوستانی قومیت" ص: ۶۵

۳۰۔ ایضاً ص: ۶۶

۳۱۔ "اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب" ص: ۱۵۶

۳۲۔ "مقالات شیرانی" ص: ۱۷۹

۳۳۔ "دکن میں اردو" ص: ۲۱

۳۴۔ "مقالات شیرانی" ص: ۱۷۹

۳۵۔ "دکن میں اردو" ص: ۲۲

۳۶۔ "اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب" ص: ۲۶۱

۳۷۔ "دکن میں اردو" ص: ۱۶

۳۸. "دکن میں اردو" ص: ۱۹

۳۹. نواب نصیر حسین خان خیال، "داستان اردو" ص: ۶۹۔ خیال کے بارے میں مزید معلومات کے لیے پروفیسر کلیم سہسرامی کا مقالہ ملاحظہ ہو "ادیب الملک نواب نصیر حسین خیال کی آپ بیتی" مطبوعہ قومی زبان کراچی جولائی ۱۹۸۸ء

۴۰. ایضاً ص: ۶۸

۴۱. مطبوعہ "الناظر"، لکھنؤ، اکتوبر نومبر ۱۹۲۵ء

۴۲. "ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" ص ۵۷

۴۳. ایضاً ص: ۷۹

۴۴. ایضاً ص: ۲۱

۴۵. "عرب و ہند تعلقات" ص: ۳۵

۴۶. "اسلام کا اثر ہندوستانی تہذیب پر" ص: ۵۷

۴۷. "داستان اردو" ص: ۲۳

۴۸. ایضاً ص: ۲۴

۴۹. ایضاً ص: ۳۷

۵۰. "نقوش سلیمانی" ص: ۳۱

۵۱. "ملتانی زبان اور اس کا اردو سے تعلق" ص: ۸۶

۵۲. "مقدمہ تاریخ زبان اردو" ص: ۳۰

۵۳. ایضاً ص: ۴۴ ۵۴. "اردو سندھی کے لسانی روابط" ص: ۵۸

۵۵. "کیفیہ" ص: ۲۹

۵۶. "اردو سندھی کے لسانی روابط" ص: ۳۹

۵۷. "مقدمہ تاریخ زبان اردو" ص: ۴۴

۵۸۔ "تاریخ ادب اردو" جلد اول ص: ۶۸۰

۵۹۔ مشمولہ "اردو میں اصول تحقیق" جلد ۲ مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش

۶۰۔ مولانا محمد حسین آزاد "آب حیات" طبع پانزدہم ص: ۶

۶۱۔ "دراردچی کی گرامر پراکرت پرکاش کے نام سے مسٹر کاویل نے ۱۸۶۸ء بمقام لندن چھپوائی ہے۔
(حاشیہ مصنف)

۶۲۔ "اردوئے قدیم" طبع دوم ص: ۱۹

۶۳۔ "بحوالہ عبدالقیوم (مرتب: تاریخ ادب اردو) ص: ۲۰۲

۶۴۔ "تاریخ ادب اردو" ص: ۲

۶۵۔ ایضاً ص: ۲

۶۶۔ اس موقع پر ڈاکٹر شوکت سبزواری نے حاشیہ میں دتاتریا کیفی کے مقالے "ہماری زبان اردو" جلد ۱۹۲۲ صفحہ ۶۵۹ کا حوالہ دیا ہے۔ یہ مقالہ "کیفیہ" کا باب اول ہے۔ دلچسپی کی خاطر اس مقالے کے متعلقہ اقتباس درج ہے:

"..... اردو میں اس (کھڑی بولی) کا بیوہار ہونے لگا۔ جہاں جہاں مسلمان پھیلتے گئے اس بھاشا کو اپنے ساتھ لیتے گئے (حوالہ ہندی بھاشا کا وکاس مصنفہ شام سندر داس جی سیکرٹری ناگری پرچارنی سبھا بنارس ص ۹۶) اسی کتاب میں کھڑی بولی کا میدان میرٹھ اور اس کے گرد اگرد کا وسیع علاقہ بتایا گیا ہے اور اس بولی کا پہلا شاعر امیر خسرو کو مانا ہے۔ یہ بولی شورسینی پراکرت کی ایک اپ بھاشا تھی۔ اسی سے بعد کی ہندی بنی ("کیفیہ") ص: ۳۰، ۳۱

۶۷۔ "اردو کا روپ" ص: ۷۷

۶۸۔ "اردو کی زبان کا آغاز" نقوش سالنامہ ۱۹۶۲ء

۶۹۔ مشمولہ "تنقیدی مقالات" جلد اول مرتبہ میرزا ادیب۔

۷۰۔ اس ضمن میں ملاحظہ ہو خلیل صدیقی کا سلسلہ مقالات "دراوڑی زبانوں کی اضافی اور مفعول علامتیں"

صحیفہ اپریل تا جولائی ۱۹۷۰ء

"ارضِ پاکستان کی تاریخ" ص: ۷۱

ایضاً ص: ۹۹

"صحیفہ" لاہور، اپریل ۱۹۶۸ء

"تاریخِ تمدن ہند" ص: ۴۵

"ماہِ نو" لاہور اگست ۱۹۸۰ء

۴۔ اصلاحِ زبان کی تحریکیں

"گلشن گلشن"

سیر کو آنے والے خوش مذاق حضرات گلشن کے حسن کی تعریف تو کرتے ہیں مگر شاید ہی شعوری طور سے کبھی یہ سوچا ہو کہ مخملیں گھاس کیاریوں کی ترتیب، سایہ فگن اشجار، بل کھاتی ہوئی روشوں کا نکھار اور رنگوں کا سنگھار یہ سب کیسے ممکن ہوا۔ جس وقت خوش ذوق حضرات سیر گلشن کا مزہ لے رہے ہوتے ہیں اس وقت باغبان لاتعداد پیشرو باغبانوں کی مانند کسی کونے میں سبزۂ بیگانہ کے بارے میں سوچ رہا ہوتا ہے۔

باغ کسی ایک باغبان کی محنت کا ثمر نہیں ہوتا بلکہ اس کی مٹی نے لاتعداد باغبانوں کا پسینہ جذب کیا ہوتا ہے اور باغ کی نشوونما کے لیے یہ پسینہ پانی جتنا ہی ضروری ہے۔ یہی نہیں بلکہ ہر باغبان یہ بھی جانتا ہے کہ تزئینِ چمن کے لیے جس طرح ترتیبِ گل لازم ہے، اسی طرح غیر ضروری پودوں، خودرو جھاڑیوں، ناپسندیدہ گھاس اور آکاس بیل وغیرہ سے باغ کو بچانا بھی ضروری ہوتا ہے ورنہ حسنِ ترتیب مجروح ہو جائے گا اور باغ کی زمین کی توانائی، پھولوں کی کوملتا اور سبزہ کی چمک کملا جائے گی۔ اسی لیے جہاں تخم پاشی، قلمکاری اور پیوند کاری سے باغ کو آسمان کے بدلتے رنگوں کا آئینہ بنایا جاتا ہے وہاں مرجھائے پھولوں، سوکھی شاخوں، مجروح بیلوں، زخمی کونپلوں اور مردہ گھاس سے باغ کو پاک و صاف رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ اور یہاں بھی وہی حیاتیات والا اصول کارفرما نظر آتا ہے کہ بدتر کے مقابلے میں بہتر اور ناتواں کے مقابلے میں

ذوق کو پھلنا پھولنا ہے۔ یہی اصول جمالیات میں بدصورتی پر خوبصورتی کی ترجیح کا باعث بنتا ہے۔ جب یہ تخلیقی عمل سے آمیز ہو جائے تو صورت یہ ہو جاتی ہے:

ہے جُستجو کہ خوب سے خوب تر کہاں
اب دیکھیے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں

کچھ یہی حال زبان کا بھی ہے۔ زبان کے لیے گلشن استعارہ ہی سہی، لیکن یہ زبان اور حُسنِ زبان کے لیے موثر ہے۔

زبان کسی دھرتی (ملک، وطن جو نام بھی دے لیں) سے متعلق ہوتی ہے۔ یہ حقیقت کتنی قدیم اور واضح ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ دھرتی ماتا (مدر ارتھ) کی مانند مادری زبان بولا جاتا ہے۔ افراد زبان کے سارف بھی ہوتے ہیں اور وارث بھی۔ وہ نہ صرف اپنی زبان اگلی نسل کو منتقل کرتے ہیں بلکہ بیرون ملک جانے پر بھی اپنی زبان کی حفاظت کرتے ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مسلمانوں کی زبانوں اور مقامی زبانوں کے ملاپ کا سوال ہی نہ پیدا ہوتا۔

حیاتیات کا معروف کلیہ ہے کہ دو نسلوں، خاندانوں یا علاقوں کے مرد اور عورت کے ملاپ سے جنم لینے والی اولاد والدین کے بہترین نسلی خصائص کی حامل ہوتی ہے۔ اسی لیے جن خاندانوں میں باہمی شادیاں ہوتی ہیں ان کی اولادیں نسبتاً کمزور ہوتی ہیں۔ بلکہ ان کے قد، اعضا، صورت میں بھی یکسانیت نظر آتی ہے۔ اس کلیہ کو وسیع بنیادوں پر دیکھئے تو سپین میں آج بھی عرب خون کے اثرات دیکھے جا سکتے ہیں۔ امریکہ میں حبشی غلام بن کر آئے لیکن سفید اور سیاہ فام کے ملاپ نے جس "MALATUE" کو جنم دیا وہ رنگ اور شکل کے اعتبار سے بہتر تھا۔ یہی ریڈ انڈین کی صورت میں ہوا۔ اسی طرح امریکی باپوں سے جنم لینے والی جاپانی اولاد کے قد لمبے، بال سنہری، ناک کھڑی اور رنگت میں سفیدی شامل ہو گئی۔

حیاتیات کے اس اصول کا اگر زبانوں پر بھی اطلاق کیا جائے تو کم و بیش یہی نتائج مرتب ہوتے ہیں یعنی دو زبانوں کے ملاپ سے جنم لینے والی زبان دونوں کی ارفع لسانی خصوصیات کی

حامل ہو گی۔ سنسکرت کے مردہ ہونے کی بھی یہی وجہ تھی کہ اسے نئے الفاظ کی غذا نہ ملی اور تازہ لہجوں کے ذائقے سے ناآشنا رہی۔ جس کے نتیجے میں وہ ایک طرح کی "لسانی فاقہ کشی" کی شکار ہو کر پنڈتوں کی پوتھیوں میں دفن ہو کر رہ گئی۔

لفظ کی توانائی:

الفاظ افراد نہ سہی لیکن افراد کے مقابلے میں الفاظ طویل عمر ضرور رکھتے ہیں، فرد سو سال جیا تو بہت جیا لیکن لفظ کے لیے سو یا ہزار برس کی عمر زیادہ نہیں بشرطیکہ وہ عوام کی زبان پر رہے اور تخلیقی مقاصد کے ذریعے بروئے کار لائی جانے والی توانائی کا حامل ہو۔

لفظ کی توانائی اس کے استعمال بلکہ متنوع استعمالات سے مشروط ہے اور اس کا تخلیقی استعمال حیاتِ ابدی کا ضامن۔ جس طرح انسانی جسم زندہ خلیوں سے تشکیل پاتا ہے۔ الفاظ بھی اسی طرح زبان میں زندہ خلیوں جیسا کردار ادا کرتے ہیں مگر ذرا سے فرق کے ساتھ، خلیہ دیگر خلیوں سے پیوستگی پر مجبور رہے جبکہ لفظ انفرادی تشخص کا حامل اور پھول کی مانند جداگانہ رنگ و بو رکھتا ہے۔ چند پھول اکٹھے ہوں تو گلدستہ بنتا ہے۔ لاتعداد پھول اکٹھے ہوں تو گلشن ترتیب پاتا ہے۔ اسی طرح چند الفاظ اکٹھے ہوں تو جملے اور فقرے کی مالا تیار ہوتی ہے جبکہ لاتعداد الفاظ ملتے ہیں تو زبان معرضِ وجود میں آتی ہے۔ یوں دیکھیں تو زبان کی وحدت دراصل الفاظ کی کثرت کی مرہونِ منت ہوتی ہے اور ان ہی الفاظ سے زبان نامیاتی وحدت کی صورت اختیار کرتی ہے کہ ہر جزو لفظ کی صورت میں اپنی انفرادیت بحال رکھتے ہوئے زبان کے وسیع کل کی تشکیل کرتا ہے۔

تخلیقی عمل کے پرزم میں سے گزر کر زبان ہفت رنگ ہو جاتی ہے، تو لفظ اس محدّب شیشے میں تبدیل ہو جاتا ہے جو خیال کی شعاع کو ایک نقطے پر مرکوز کر دیتا ہے۔ اسی لیے زبانیں تخلیقات سے حیاتِ ابدی پاتی ہیں۔ لمحہ موجود میں زبان ماضی کے عظیم تخلیقی ورثے کی امین بن کر مستقبل کے تخلیقی امکانات کے لیے راہنما بھی ثابت ہوتی ہے اور اسی لیے زبان کو صاف ستھرا

رکھا جاتا ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے باغ کو جھاڑ جھنکاڑ سے اور مکان کو کوڑا کرکٹ سے پاک رکھتے ہیں۔

"خوب سے خوب تر کی جستجو":

اصلاحِ زبان کی کوششوں کے مطالعے سے پیشتر یہ امر واضح رہے کہ اصلاح کا عمل اس وقت شروع ہوتا ہے جب زبان صورت پذیری کے ابتدائی دور سے نکل کر ترقی کے ایک خاص معیار تک پہنچ چکی ہو۔ یہ معیار کیا ہوگا اس کی پیمائش مقداری یا عددی صورت میں ممکن نہیں کیونکہ اس کا تعلق زبان بولنے والی قوم کے تخلیقی اور جمالیاتی معیاروں سے ہوتا ہے۔

زبان جب بن رہی ہو تو شاید اس عہد کی آبادی کو یہ شعور بھی نہ ہو کہ اس وقت کوئی زبان بننے کے عمل سے گزر رہی ہے۔ اسے یہ یوں سمجھیے کہ کیا اکبر کے عہد کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ احساس ہوگا کہ ہماری باہمی ضروریات لین دین اور میل ملاپ کے نتیجے میں ایک ایسی زبان صورت پذیر ہو رہی ہے جو مستقبل میں اس خطّے کی تخلیقی وراثت کی امین ثابت ہوگی۔ اور دنیا کی بڑی زبانوں میں شمار ہوگی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اصلاح زبان کے لیے زبان میں اتنی نشوونما اور ترقی لازم ہے کہ وہ تخلیقی مقاصد کے لیے بروئے کار لائی جا سکے۔ جب تخلیقات کا عمل شروع ہو جائے تو پھر صاحبِ ذوق تخلیق کاروں پر اس امر کا انحصار ہوتا ہے کہ وہ کب اور کیسے اصلاحی عمل کا آغاز کرتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ یہ عمل انفرادی نوعیت کا ہو یا اجتماعی روپ میں اظہار پائے۔ اصلاح زبان کے سلسلے میں ہمیں شاعری میں "تلمذ" کی روایت کو بھی پیش نظر رکھنا ہوگا۔ کیونکہ زبان و بیان کی اصلاح کی یہی واحد صورت تھی۔ یہ اصلاح بھی دو پہلو اختیار کر سکتی تھی، ایک تو یہ کہ شاعر خود اپنے ذوقِ جمال اور معیارِ لسان کی روشنی میں کچھ الفاظ کو غیر فصیح غیر شاعرانہ اور تخلیقی ابلاغ میں بدنمائی کا باعث سمجھ کر ان کا استعمال پسند نہیں کرتا اور اپنے تلامذہ کے لیے انہیں متروک قرار دے دیتا ہے۔ چنانچہ اگر ایک طرف کلام میں اصلاح سے ایسے الفاظ خارج

از کلام قرار پائے تو دوسری طرف تلامذہ کو ان سے احتراز کرنے کی تلقین بھی کی جاتی تھی۔ اردو میں معروف شعراء کے تلامذہ کے ذریعے سے اصلاح زبان کا عمل زیادہ نمایاں نظر آتا ہے ویسے ایک بات ہے کہ ہمارے ہاں شاعرانہ تلمذ کی جو روایت ملتی ہے وہ ایران سے قطع نظر شاید اور کہیں نہ ملے گی۔ مشرق میں استاد یا گرو کا مرتبہ ماں باپ سے بھی زیادہ سمجھا جاتا رہا ہے اور شاعری میں تلمذ کی روایت اور اس کی اہمیت اسی سے متعین ہوتی ہے۔ اس حد تک کہ استاد شاعر کی مقبولیت کا تعین بعض اوقات اس سے بھی کیا جاتا ہے کہ اس کے تلامذہ کی تعداد کتنی تھی اور پھر ان میں سے خود کتنے شاگرد استاد ثابت ہوئے۔ یوں تو اردو کے ہر بڑے شاعر کے شاگرد ہوئے ہیں لیکن جن اساتذہ کی شہرت میں ان کے شاگردوں کی ناموری بھی شامل ہے ان میں مظہر جان جاناں، حاتم، سودا، مصحفی، ناسخ، آتش، غالب، داغ وغیرہ خصوصی شہرت کے حامل ہیں۔

انسانی طبع بلکہ انا استاد شاگرد کے تعلقات میں بھی اپنے رنگ دکھاتی رہی ہے۔ اس لیے بعض شاگرد تمام عمر استاد کے تابعدار رہے، جبکہ بعض اڑنے کے قابل ہوئے تو پر پرزے نکال کر "باغی" ہو جاتے ہیں۔ بعض اوقات انا پسند شاگرد یہ سمجھتا (کبھی درست اور کبھی غلط) کہ استاد کی یہ اصلاح غلط ہے اور اس سے شعر خراب ہو گیا۔ وہ اس اصلاح کو تسلیم نہ کرتا استاد کے خلاف ہو جاتا۔ کبھی یہ بھی ہوا کہ شاگرد کی شہرت استاد کو کھٹکتی اور یوں وہ مارے حسد کے شاگرد کے خلاف ہو جاتا۔

الغرض تخلیق کاروں کی نفسیات کے مطالعے کے لحاظ سے اردو شاعری میں تلمذ کی روایات کا مطالعہ خاصا دلچسپ ہے۔ سعادت خان ناصر لکھنوی کا تذکرہ "خوش معرکہ زیبا" (ترتیب و مقدمہ: مشفق خواجہ) تو صرف استادی شاگردی کے نقطۂ نظر سے ہی لکھا گیا ہے۔

اچھوت الفاظ:

جو الفاظ غیر فصیح قرار دے کر ٹکسال باہر کیے گئے تخلیقی مقاصد کے لیے اچھوت سمجھے جانے والے ان الفاظ کو اصطلاح میں "متروک الفاظ" کہتے ہیں۔ یہ کیا ہیں؟

آرزو لکھنوی کی ایک چھوٹی سی کتاب ہے "نظام اردو" اس میں انہوں نے متروکات کی تین قسمیں بتائی ہیں:

۱۔ لفظ غلط ہو۔

۲۔ غیر مانوس ہو۔

۳۔ زائد ہو۔

ان کے بموجب:

"ان میں سے بعض کا ترک ضروری ہے اور بعض کا ترک اولیٰ ہے۔"[۱]

حسرت موہانی کی "نکات سخن" میں بھی متروکات پر مفصل بحث (ص: ۹ تا ۶۴) کی گئی ہے۔ انہوں نے متروکات سے وابستہ تمام مباحث کو یوں سمیٹا ہے۔ "متروکات قدیم" (ص: ۹) "متروکات مردود" یعنی وہ متروکات جو شعرائے عہد متوسط کے کلام میں پائے جاتے ہیں" (ص: ۲۲) "متروکات جائز یعنی شعرائے دور آخر و عہد حاضر کے وہ متروکات جن کے ترک کو راقم جائز سمجھتا ہے" (ص: ۳۱) "متروکات بے جا یعنی شعرائے دور آخر و عہد حاضر کے وہ متروکات جن کے ترک کرنے کی راقم حروف کے نزدیک کوئی وجہ معلوم نہیں ہوتی۔" (ص: ۴۴) "قابل ترک یعنی وہ الفاظ جو اس وقت تک مستعمل ہیں اور جائز سمجھے جاتے ہیں لیکن راقم حروف کے نزدیک جن کا ترک اولیٰ ہے۔" (ص: ۵۰) حسرت نے اپنے موقف کی تائید میں اساتذہ اور معروف شعراء کے بر محل اشعار بھی پیش کیے ہیں۔ اور اس موضوع کا بہت ہی عمدہ تجزیاتی مطالعہ کیا ہے۔

خورشید لکھنوی نے رسالہ "افادات" (اشاعت اول نومبر ۱۸۹۰ء) میں اس موضوع پر بحث

کرتے ہوئے یوں لکھا ہے:

"مخفی نہ رہے کہ متروکات کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جن کا ترک میرے نزدیک ضروری ہے
دوسرے وہ جن کا ترک ضروری نہیں۔ ہاں بہتر ہے ترک اون کا اِلّا ایک شرط کے ساتھ اور
شرط یہ ہے کہ زبان بگڑ نہ جائے یعنی اگر اُون کے ترک کے سبب سے زبان بگڑ جائے اور
وہ مزا کلام میں نہ رہے، جو بغیر ترک رہتا ہے تو وہ اونہیں ترک نہ کرے کیونکہ بہت دیکھا ہے
ایسا کہ بعض اساتذہ نے پابندی جو کی تو رنگ ہی ان کے کلام کا اوس کی پابندی سے بدل گیا اور
مذاق ہی دوسرا ہو گیا۔ پس جو خوف اون کے ترک میں ایسا ہو تو پھر بہتر ہے کہ ترک نہ کرے۔
اس لیے کہ جس قدر متروکات ہیں وہ غلط تو یقینی نہیں۔ خصوصاً وہ متروکات کہ جو اکثر اساتذۂ حال
کے کلام میں بھی ہیں۔"[2]

خورشید لکھنوی کی آخری بات قابلِ توجہ ہے کہ شعر میں کسی لفظ کے ترک کرنے کا یہ مطلب
نہیں کہ اس لفظ کی گردن مار دی گئی اور اسے زبان کی قلمرو سے جلا وطن کر دیا۔ متروک ذاتی چیز
ہے اس لیے داخلی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی وقت میں ایک شاعر جو لفظ ترک کرتا ہے
دوسرے اس کے استعمال میں قباحت محسوس نہیں کرتے۔ بس یوں سمجھ لیجیے کہ متروکات کے باعث
کچھ الفاظ کا گویا حقہ پانی بند کر دیا جاتا ہے لیکن صرف شعراء کے لیے۔ عوام انہیں استعمال کر سکتے
ہیں بلکہ کرتے رہتے ہیں۔ عوام زبان کا استعمال غیر تخلیقی مقاصد کے لیے کرتے ہیں اس لیے یہ
ذوق اور جمالیاتی حس کا معاملہ نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بھی ہوتا ہے کہ تخلیقی زبان کے معیار کو ملحوظ
رکھتے ہوئے تعلیم یافتہ اور صاحبِ ذوق حضرات عام بول چال میں بھی اگر ان الفاظ کا استعمال
بند کر دیں تو پھر یہ لفظ گویا ممنوع ہو جاتا ہے۔ جیسے میر و سودا کے زمانے میں ٹک، کبھو، کسو
ایدھر، ادھر، آنیاں، جانیاں وغیرہ شاعرانہ ٹکسال میں تھے لیکن جب غزل میں یہ متروک قرار
پائے تو بعد میں عام زبان سے بھی خارج ہو گئے اور اب صرف زبان کے آثارِ قدیمہ میں شمار
ہوتے ہیں۔

"تلقینِ ترک" :

سوال یہ ہے کہ کیا اساتذۂ فن کے ذوق اور لفظ کی جمالیات سے ہٹ کر بھی کوئی ایسا معیار ہے جس سے متروکات کا جواز مل سکے۔

اس سوال کے جواب کے لیے ۱۱۱۲ھ تک پیچھے جانا ہوگا۔ جب سعد اللہ گلشن نے ولی کو یہ تلقین کی :

"زبان دکھنی را گذاشتہ و ریختہ را موافق اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد موضوع بکند۔"

دیکھا جائے تو یہ "تلقینِ ترک" تھی۔

ولی دو مرتبہ دہلی آئے تھے۔ پہلی مرتبہ ۱۷۰۰ء میں، دوسری مرتبہ ۱۷۲۰ء میں[۲]۔ اس مرتبہ ان کا دیوان ساتھ تھا اور غزلوں نے بہت مقبولیت حاصل کی۔ ولی سے متاثر ہو کر اس عہد کے بزرگ فارسی گو شعرا مرزا مظہر جان جاناں، شاہ مبارک، غلام مصطفیٰ یکرنگ، اشرف الدین مضمون، آبرو، ناجی نے بھی اردو کے اسلوب میں غزل کہنی شروع کی۔ آج ولی کی اہمیت اس بنا پر ہے کہ وہ دکنی اور شمالی ہند میں غزل کی سطح پر تخلیقی رابطے کا ذریعہ بنتے ہیں۔ واضح رہے کہ خود ولی کے پیچھے بھی ایک صدی پر محیط دکنی کی تخلیقی روایات تھیں۔ دکنی میں مقامی بولیوں کے الفاظ بکثرت موجود تھے۔ جب کہ دربار داری کی بنا پر دہلی میں فارسی کا چلن عام تھا۔ اس لیے اس عہد کے شعرا جب ولی کی طرف دیکھتے تو دکھنی کی صورت میں انہیں متعدد نامانوس الفاظ محاورات اور تراکیب نظر آتیں۔ لیکن ان کے ذوق کو دیکھتے تو وہ فارسی کی شعری اور لسانی روایات سے تشکیل پاتا تھا۔

عوام کی زبان کیونکہ سادہ اور عام فہم ہوتی ہے اور تخلیقی زبان کے برعکس اس کا لہجہ عام بول چال پر مبنی ہوتا ہے اس لیے اس عہد کی زبان خاصی ہندی آمیز تھی۔ اور ظاہر ہے کہ جب فارسی کا معیارِ فصاحت شعری پیمانہ بنے گا تو پہلی زد ہندی پر ہی پڑنی تھی اور یہی ہوا۔ جُوں جُوں

غزل اردوئے معلیٰ شاہجہان آباد کے سانچے میں ڈھلتی گئی اس سے ہندی الفاظ بھی خارج ہو گئے۔ کمال یہ ہے کہ ان متروک الفاظ میں سے بیشتر آج بھی زندہ ہیں۔ بلکہ گیتوں کی کوملتا کے ضامن بھی ہیں۔ وحیدالدین سلیم کے الفاظ ہیں:

"شاعری کے پہلے اور دوسرے دور میں ہندی الفاظ کثرت سے مستعمل تھے۔ تیسرے دور میں ان کی جگہ فارسی اور عربی الفاظ رواج پا گئے تھے۔ لیکن اس دور میں بھی بہت سے ہندی الفاظ رائج تھے، جو چوتھے دور میں متروک ہوئے اور رفتہ رفتہ زبان فارسی، عربی آمیز ہوتی گئی۔ مثلاً تیسرے دور میں شام کی جگہ سانجھ، محبوب کی جگہ سجن، شہر کی جگہ نگر، جدائی کی جگہ برہا، ذرا کی جگہ ٹک، چہرہ کی جگہ مکھ، خوشبو کی جگہ باس، قول کی جگہ بچن، دنیا کی جگہ جگ، ہوا کی جگہ باد یا پون وغیرہ الفاظ مستعمل تھے۔ اس دور میں بہت سے الفاظ زبانوں پر جاری تھے۔ جن کی شکل چوتھے دور میں بدل گئی۔ مثلاً اس زمانے میں مٹی کی جگہ ماٹی، لگائی کی جگہ لاگا، سٹھنا کی جگہ پاٹھنا، کیچڑ کی جگہ کیچ، جگر کی جگہ جاگہہ، لہو کی جگہ لوہو، گھسنا کی جگہ گھسنا (بالفتح) ڈبویا کی جگہ ڈوبایا وغیرہ بولتے تھے۔"[۱۵]

اس ضمن میں ایک اور امر بھی توجہ طلب ہے کہ خود دہلی کے گلی کوچوں میں مفرس اردو کے برعکس وہ زبان بولی جاتی تھی جس کا نمونہ اب "باغ و بہار" کی نثر کی صورت میں محفوظ رہ گیا ہے۔ اور جسے شعوری کاوش سے انشاء نے "رانی کیتکی کی کہانی" میں اپنایا یعنی عربی فارسی سے پاک بھاشا مولانا وحیدالدین سلیم نے اپنے مقالے "عہد میر کی زبان" میں میر کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ "لکھنو میں ایک موقع پر انہوں نے لوگوں سے کہا تھا کہ خاقانی، سعدی اور حافظ کا کلام سمجھنے کے لیے فارسی زبان کی فرہنگیں درکار ہیں۔ مگر میرا کلام کوئی شخص نہیں سمجھ سکتا جب تک وہ اس زبان سے واقف نہ ہو جو دہلی کی جامع مسجد کی سیڑھیوں پر بولی جاتی ہے۔ فی الحقیقت میر صاحب نے محاورے کے سامنے اس کی مطلق پروا نہیں کی کہ جن زبانوں سے الفاظ اردو زبان میں آئے ان میں اصلی شکل ایسے الفاظ کی کیا تھی۔ مثلاً وہ

سہم کو سہت، پلید کو پلیت، دستخط کو دسخط، شتاب کو شتابی، اضطراب کو انسطرابی، قرآن کو قران، امیری کو امرائی، خیالی کو خال (بروزنِ حال)، نزدیک کو نزیک باندھ گئے ہیں۔"
میر کے ہاں جو بعض اوقات اس انداز کے اسلوب کے اشعار مل جاتے ہیں تو یہ اس لیے تاکہ بقول ان کے "گفتگو پہ مجھے عوام سے ہے۔"

ہونا تھا مجلس آرا اگر غیر کا تو مجھ کو
مانند شمع مجلس کاہے کو تیں جلایا

خونِ جگر جو بہنے لاگا پلکوں ہی پہ رہنے لاگا

ہر ذرہ خاک تیری گلی کا ہے بے قرار
یاں کون سا ستم زدہ ماٹی میں رُل گیا

سودا کے ہاں بھی اس انداز کی مثالیں مل جاتی ہیں:

وے صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے کو آنکھیں ترستیاں ہیں

ہائے ہوں گی دل پہ برہا کی ساعتیں گھڑیاں
یہ انکھیاں کیوں میرے جی کے گلے کی ہار ہو پڑیاں

سودا غزل چمن میں تو ایسی ہی کہہ کے لا
گل پھاڑیں سن کے جیب کو دیں بلبلاں صدا

جب کہ میر حسن نے "سحر البیان" میں لکھا:

ادھر سے ادھر آتیاں جاتیاں
پھریں اپنے جوبن کو دکھلاتیاں

اُردو کے دورِ اوّل کے غزل گو شعراء اردو کو کیا اہمیت دیتے ہیں اور ریختہ اور فارسی سے کیا کیا تلازمات وابستہ تھے۔ اس کا اندازہ ناجی اور مضمون کے ان اشعار سے ہو جاتا ہے:

ہیں یکے تسخیر ناجی ریختہ میں سیم تن
گرچہ نذر حاصل کریں ہیں یار پڑھ کر فارسی
کہا طفلاں کی خاطر ریختہ کو
وگرنہ شعر کہتا فارسی کا !

جہاں تک اصلاح زبان میں اولیت کا تعلق ہے تو بلا شبہ خان آرزو اساسی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ ان کی لغت "نوادر الالفاظ" کا تذکرہ مناسب موقع پر کیا جائے گا۔ خان آرزو لسانیات کا بہت گہرا شعور رکھتے تھے۔ انہیں اشتقاقات سے بھی دلچسپی تھی اور الفاظ کی بدلتی صورتوں اور معنی میں تدریجی تبدیلیوں کے عمل سے بھی آگاہ تھے۔ جس کا ثبوت "مثمر" سے بھی مل جاتا ہے اور بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

"انہوں نے ہندوستانی زبان کی لسانی تحریک کی بنیاد رکھی۔ ہندوستانی فیلالوجی کے ابتدائی قواعد واضح کیے اور زبانوں کی مماثلت دیکھ کر ان کے توافق اور وحدت کا راز معلوم کیا۔"[۲۶] ....."ایرانی اور ہندوستانی زبانوں کی اصولی وحدت کا انکشاف سب سے پہلے خان آرزو نے کیا ہے۔ چنانچہ انہوں نے اپنی اکثر کتابوں میں اس بات پر بڑے فخر کا اظہار کیا ہے اور سراج اللغات، چراغ ہدایت، شرح سکندر نامہ، مثمر، نوادر الفاظ، غرض جہاں کہیں بھی انہیں اظہار کا موقع ملا ہے انہوں نے اپنی یکتائی کا اعلان کیا ہے۔"[۲۷]

اس گہرے لسانی شعور کو مدنظر رکھ کر جب اصلاحِ زبان کے بارے میں خان آرزو کی سعی کا مطالعہ کریں تو واضح ہو جاتا ہے کہ یہ کام انہی کو زیب دیتا تھا کہ وہ اس کے اہل تھے وہ زبان کی باریکیوں کا گہرا ادراک بھی رکھتے تھے۔ جہاں تک اصلاح زبان کے بارے میں ان کی سعی کا تعلق ہے تو ڈاکٹر سید عبداللہ کے بموجب:

دہلی کے عوام ایک مخلوط قسم کی زبان بولتے تھے جس کو بانگڑو کے نام

ے یاد کیا جاتا ہے۔ اس میں ہریانی الفاظ اور قصباتی محاورے کی خاص آمیزش
تھی۔ خان آرزو نے اصلاح زبان کے سلسلے میں سب سے پہلے انہی الفاظ کی
فصاحت اور عدم فصاحت کی طرف توجہ کی اور یہ کہنا شاید غلط نہ ہوگا کہ اردو
کے ابتدائی لہجہ اور تلفظ کو متعین کرنے اور ٹکسال اردو کو مشتہر کرنے میں انہوں
نے ایک موسس اور واضع اول کا کام کیا۔ اصلاح زبان کی باقی سب کوششیں
اس کے بعد کی ہیں۔" ۵۴

"مصری کی ڈلیاں":

اصلاح زبان کے نقطۂ نظر سے جب قدیم دور کو دیکھا جائے تو محسوس ہوتا ہے کہ اس عہد
کے شعراء کے سامنے بحیثیت مجموعی تین اسالیب تھے۔ غزل کا دکھنی اسلوب، نستعلیق فارسی
کا انداز اور دہلی کی گلیوں کی عوامی زبان کا لب و لہجہ۔ اب یہ ظاہر ہے کہ زبان کو فصیح بنانے
کے لیے نہ دکنی اسلوب کام آسکتا تھا نہ عوامی لب و لہجہ۔ اس لیے فارسی کا معیارِ فصاحت ہی
مدد بن سکتا تھا اور ایسا ہی ہوا۔ جب قائم بول طعنہ زن ہوا:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

تو یہ اسی لسانی طرزِ احساس کی بنا پر تھا جس کی آبیاری فارسی کی شعری روایات نے
کی تھی، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ جہاں تک دکنی غزل بلکہ تمام دکنی شاعری کا تعلق ہے تو وہ
شمال میں مروّج شاعری سے بلحاظِ خیال و طرزِ ادا بہتر بھی ہے اور پُرلطف بھی۔ اس ضمن میں یہ
بات واضح رہے کہ متروکات کا عمل ترکِ لفظ سے عبارت ہے نہ کہ ترکِ خیال سے۔ لہٰذا جب
دہلی کے شعراء کو یہ احساس ہوا کہ اب غزل کی زبان صاف کرنی چاہیئے تو وہی الفاظ متروک قرار
پائے جن کی جڑیں ہندی یا دکن میں پیوست تھیں اور ان ہی کو متروک قرار دیا گیا کہ معیارِ فصاحت

فارسی تھا۔ اس ضمن میں مولانا محمد حسین آزاد لکھتے ہیں: "ان کی اصلاح نے بہت سے الفاظ ولی کے عہد سے نکال ڈالے مگر پھر بھی ہبلارے اور گھیرے گھیرے اور مرے ہے، بجائے مرتا ہے، اور دوانہ بجائے دیوانہ اور میاں اور جان کا لفظ بجائے معشوق موجود ہے۔ متاخرین اس کی جگہ جان جاں، یا جاناں یا یار یا دوست یا دلبر وغیرہ وغیرہ بولنے لگے۔ مگر موہن اور وام میں نہ رہا بجھ رہا اور بل گیا یعنی جل گیا یعنی صدقے گیا اور من بجائے دل بھی ہے۔" [9]

یہ انہوں نے "دوسرا دور" کی تمہید میں لکھا تھا۔ جب کہ تیسرا دور کی تمہید میں وہ یوں گویا ہیں: "ہمارے زبان دانوں کا قول ہے کہ ساٹھ برس کے بعد ہر زبان میں ایک واضح فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ طبقہ سوم کے اشخاص جو حقیقت میں عمارت اردو کے معمار ہیں انہوں نے بہت سے الفاظ پرانے سمجھ کر چھوڑ دیئے اور بہت سی فارسی کی ترکیبیں جو مصری کی ڈلیوں کی طرح دودو کے ساتھ منہ میں آتی تھیں۔ انہیں گھلایا۔ پھر بھی بہ نسبت حال کے بہت سی باتیں ان کے کلام میں ایسی تھیں کہ اب متروک ہیں۔" [10]

یہ بات وہ میر و سودا کے دور کے بارے میں کہہ رہے ہیں؛

بات وہی رہی کہ معیار فصاحت فارسی کی شعری روایات ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ فارسی میں یہ لوگ خود اہلِ زبان کے پایہ کی زبان نہ لکھ سکتے تھے۔ اور نہ ہی فارسی والوں نے اہلِ ہند کو استثنائی مثالوں سے قطع نظر اس معاملہ میں کبھی تسلیم کیا۔ اردو شعر کا نصاب تعلیم فارسی تھا لہٰذا ان کے شعری مذاق اور تنقیدی حس کی تکمیل میں شعوری یا غیر شعوری طور پر فارسی بنیادی کردار ادا کرتی تھی۔ شاید اسی لیے ڈاکٹر سید مبارک علی نقش بندی نے مرزا مظہر جان جاناں کی اصلاح زبان کے سلسلے میں کی گئی کوششوں میں سرِ فہرست یہ امر رکھا کہ انہوں نے ہندی الفاظ پہ فارسی الفاظ کو ترجیح دی ۔لہٰذا ولی کے زمانے کے بہت سے الفاظ اور بندشوں سے زبان پاک کی گئی ۲۔ فارسی الفاظ اور ۳۔ محاورات سے زبان اردو کو مالا مال کیا۔" [11]

اصلاح زبان کے سلسلے میں یہ امر ملحوظ رہے کہ اگرچہ اردو عوام پسند ہو چکی تھی لیکن تخلیقی

ادب میں ابھی کچا پن تھا۔ اسی لیے اصلاح زبان کا عمل طویل عرصہ پر پھیلا نظر آتا ہے۔ چنانچہ مرزا مظہر جان جاں اور حاتم[21] سے لے کر ناسخ تک عہد بہ عہد اصلاحِ زبان کی کاوشوں کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے اور صرف متروکات سے ہی زبان کے بارے میں بدلتے تخلیقی شعور کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

اس عہد کے شعراء کے لیے زبان اور اصلاح زبان کی کتنی اہمیت تھی اس کا عشرت لکھنوی کے اس بیان سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔" میر تقی میر کا جب انتقال ہونے لگا تو انہوں نے اپنے صاحبزادہ میر کلو عرش کو کہا کہ تم جانتے ہو کہ ہمارے پاس دولت دنیا میں سے تو کوئی چیز نہیں ہے جس پر ہمیں فخر و ناز ہو۔ اگر ہوتی بھی تو قابل فخر نہ ہوتی۔ ہاں کچھ زبان اردو کے متعلق علم سینہ ایسا ہے جو ہمیں با شودہ ماموں سراج الدین خان آرزو ..... نے عطا کیا ہے۔ اور اسی کے بدولت ہم کو ہمیشہ ناز و استغنا رہا۔ میں نے ان کو تمہارے واسطے ایک کتاب کی صورت میں لکھ دیا ہے۔ اس کتاب کا نام " اصول اردو" ہے۔ زبان کی حفاظت کے لیے یہ قواعد کافی ہیں۔ ان اصولوں پر گامزن رہو گے تو اردو ایک دن بام ترقی پہ پہنچے گی۔ اور وصیت کرتا ہوں کہ اس کتاب کو بہت حفاظت سے رکھنا۔ مجھے تمنا تھی کہ خدا مجھے پوتا عطا کرتا وہ اب تک پوری نہیں ہوئی۔ شاید میرے بعد خدا تم کو بیٹا مرحمت کرے تو اسے تعلیم دینا اور یہی کتاب یاد کرا دینا اور اس کے مطالب سمجھا دینا اور اگر کوئی اولاد نرینہ نہ ہو تو کسی اہل شاگرد کو یہ امانت تفویض کر دینا۔"[22]

عرش کے بیٹا نہ ہوا۔ انہوں نے یہ کتاب شیخ محمد جان شاد پیر و میر کو دے دی نہ جانے اس کتاب کا کیا بنا؟

جب دہلی کے بعد محفل شعر لکھنو میں آراستہ ہوئی تو وہاں کے نفاست پسند افراد نے زبان کی طرف بھی توجہ کی۔ ویسے بھی لکھنو کے نفاست پسند افراد کھانے پینے لباس اور آداب محفل میں جدتیں اور لطافتیں پیدا کر رہے تھے وہ زبان کی طرف کیوں نہ متوجہ ہوتے۔ مصحفی اور آتش کی

انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ تلامذہ ناسخ کی صورت میں متروکات کا عمل ایک لسانی رجحان کی صورت اختیار کرجاتا ہے یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک چلتا رہا۔

سقوط دہلی کے بعد زندگی نے جو چلن اختیار کیا اس میں متروکات سے اصلاح زبان کی ضرورت نہ رہی۔ اب فارسی مثالی نمونہ نہیں تھی بلکہ اردو کے مقابل انگریزی تھی۔ جس کے الفاظ سرسید اور ان کے رفقاء نثر میں اور اکبر الہ آبادی شاعری میں استعمال کررہے تھے۔ اور ملازموں والی "گلابی اردو" عام ہورہی تھی۔ حتیٰ کہ قیام پاکستان کے بعد شاہجہان آباد کی اردوئے معلیٰ پنجابی شرنارتھیوں کی بناء پر دہلی اور لکھنؤ میں اردوئے محلہ ہو کر رہ گئی۔

"الفاظ کا حقہ پانی بند":

اساسی صورت میں متروکات منفی عمل تھا۔ یعنی ایک خاص لفظ کا استعمال ممنوع قرار دے دیا گیا۔ اجتماعی رویہ یا عوامی ناپسند کی بناء پر ایسا نہیں ہوتا تھا بلکہ یہ ایک استادِ سخن کی ذاتی ناپسندیدگی کی بات ہوتی تھی جس کے نتیجہ میں زبان سے الفاظ تو خارج ہوجاتے مگر ان کی جگہ لینے والے نئے الفاظ وضع نہ کیے جاتے۔ اور یہ ہو بھی کیسے سکتا تھا۔ ایک لفظ صدیوں کے سفر کے بعد کسی خاص عہد تک پہنچتا ہے لیکن اس لفظ کو متروک قرار دینے کا مطلب اس عہد سے قطع تعلق کرنے کے مترادف ہوتا ہے۔ اساتذہ نے سجن، ساجن، سجنی، موہن، بت وغیرہ متروک قرار دے کر ان کی جگہ محبوب، دلبر اور صنم وغیرہ استعمال کیے لیکن غزل کی محفل سے نامراد عاشق کی مانند ان الفاظ کو نکال دینے سے یہ الفاظ ختم نہیں ہوگئے بلکہ گیتوں میں آج بھی موجود ہیں اور ان میں جو ایک خاص طرح کی کوملتا ملتی ہے اسے خود پر حرام کرکے غزل نے اپنا ہی نقصان کیا۔ اسی لیے متروکات کو غیر مشروط طور پر درست نہیں کہا جاسکتا۔ اس منفی رویہ سے بعض اوقات وہ مثبت چیز (فصاحت) بھی حاصل نہیں ہو پاتی جس کی توقع میں الفاظ کا یوں حقہ پانی بند کیا جاتا رہا۔

متروکات کے منفی رویہ کے باعث الفاظ تو زبان سے خارج کر دیئے جاتے ہیں لیکن ان کے عوض زبان کو کیا ملتا ہے؟ کچھ نہیں۔ ناسخ نے سینکڑوں الفاظ متروک قرار دے دیئے تاکہ زبان فصیح رہے لیکن خارج کردہ الفاظ کے عوض ناسخ زبان میں ایک بھی نئے لفظ کا اضافہ نہ کر سکا۔ اس سے بہتر تو انشا ہی رہا کہ جدت پسندی ہی کی خاطر سہی بعض انگریزی اور بھاشا الفاظ غزلوں میں استعمال کر گیا۔

شاعر دندان ساز نہیں کہ وہ دانت نکالے اور پھر نیا دانت بنا کر اس کی جگہ فٹ کرے اسی طرح شاعر سے نیا لفظ ایجاد کرنے کی بھی توقع نہیں کی جا سکتی۔ (نئے الفاظ تو علمی تصورات کی اصطلاحات، ایجادات اور اشیاء کے ناموں کی صورت میں زبان میں داخل ہوتے ہیں) لیکن اعلیٰ تر تخلیقی صلاحیتوں کے حامل شعراء ترکیب سازی سے یقیناً زبان کو عمومی طور پر اور تخلیقی اسلوب کو خصوصی طور پر مالا مال کر سکتے ہیں۔ غالباً ولی نے پہلی مرتبہ ترکیب سازی سے اپنی غزل کو مروج دکنی رنگ سے ممتاز کیا۔ اس ضمن میں اور شعراء کا نام بھی لیا جا سکتا ہے۔ غالب اور اقبال نے ترکیب سازی میں خصوصی مقام حاصل کیا۔ اس حد تک کہ ان کے اسلوب میں ترکیب سازی کا اہم عنصر کے طور پر مطالعہ کیا جاتا ہے۔ یوں دیکھیں تو متروکات کے برعکس اگر کوئی مثبت عمل نظر آتا ہے تو وہ ترکیب سازی کا ہے۔ ولی کو شیخ سعداللہ گلشن نے جو یہ مشورہ دیا تھا:

"ایں ہمہ مضامین فارسی کہ بے کار افتادہ اندر ریختہ خود بکار ببر از تو کجا خواہد گرفت۔"

اس مشورہ کا نتیجہ یہ نکلا کہ متقدمین (بالخصوص) اور متاخرین (بعض اوقات) فارسی اساتذہ کے اشعار کے اردو تراجم کر ڈالتے تھے۔ اس سلسلے میں فارسی ترکیبوں کے تراجم بھی کیے گئے۔ یہ عمل زبان کے تخلیقی امکانات میں اضافے کا باعث ہوا۔ اس ضمن میں میر اور ان کے معاصرین کی سعی قابلِ ذکر ہے۔

مولانا آزاد نے "آبِ حیات" اور وحیدالدین سلیم نے اپنے مقالہ "عہدِ میر کی زبان" میں اس

سخن میں مفصل لکھا ہے۔

متروکات کا عمل یکطرفہ تھا۔ یعنی اس کے مباحث صرف شاعری تک محدود ہیں۔ نثر کے بارے میں کبھی یہ بحث نہ چھیڑی۔ وجہ ظاہر ہے۔ زبان کا تمام تر حسن شعر کی صورت میں ہی محفوظ ہے۔ بالخصوص غزل جیسی صنف جس میں بڑے سے بڑا خیال، تخیل کے لہر در لہر سلسلے جذباتی نزاکت اور پیچیدہ تصورات کو گنتی کے الفاظ کی مدد سے صرف دو مصرعوں میں ڈھالنا ہوتا ہے۔ اس لیے اساتذہ شعر نے اگر لفظ کا سومنات بنا لیا تو اس پر تعجب نہ ہونا چاہیے۔ شعر میں لفظوں کی مالا پرو دی جاتی ہے۔ اس کا انتخاب جذبات و احساسات سے ہوتا ہے۔ جبکہ تمام خوبیوں کے باوجود بھی نثر قدرے بے مہار سی نظر آتی ہے۔ لیکن غزل میں برعکس ہے کہ یہاں تو آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے۔ بقول پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی:

"شروع شروع میں جو لفظ یا ترکیبیں متروک قرار دی گئیں۔ ان کی بنیاد اس اصول پر ہوگی کہ ریختہ یا اردو زبان کا ذاتی تشخص اور اپنی جگہ اس کی ایک مستقل ہستی قائم کی جائے پھر لطافت اور تغزیت ترنم اور سلاست کا نظریہ ترک کا معیار ٹھہرا ہوگا۔ متقدمین اور متوسطین غالباً اسی اصول پہ کاربند رہے ہوں گے۔ ہاں کہیں یہ بھی ہوا کہ اردو کی دنیا میں اپنی ایک خود مختار حیثیت تسلیم کرانے کی غرض سے زبان کی گردن پہ ترک کی کند چھری رہیت۔ کہ ایک امر مابہ الامتیاز قائم کیا گیا۔ بس یہیں سے اردو میں بدعت کی بنیاد بنی۔"[14]

متروکات سے وابستہ تمام تخلیقی مضمرات اور لسانی امکانات ملحوظ رکھنے پہ اصلاح زبان کا یہ طریقہ خاصہ مصنوعی معلوم ہوتا ہے۔ لفظ کی زندگی عوامی استعمال سے مشروط ہے اگر عوام کی زبان کسی لفظ کو ترک کرنے پہ مائل نہیں تو اساتذہ شعر اسے کیوں متروک قرار دیں وہ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتے ہیں کہ اسے خود استعمال نہ کریں مگر دوسروں (خواہ وہ شاگرد ہی کیوں نہ ہوں) کے استعمال پہ قدغن عائد نہیں کرنی چاہیے۔ آرزو لکھنوی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

"متروکات کی بے اصول فہرستوں میں ایسے الفاظ بھی پائے جاتے ہیں جن میں بعض کا ترک مخل فصاحت اور بعض کا ترک مضر زبان ہے۔"[۱۵] اس ضمن میں انہوں نے یہ اصول بھی بیان کیے ہیں۔" ۱۔ وہ الفاظ جن کا بدل نہیں کسی طرح قابل ترک نہیں۔ ۲۔ جس لفظ کی قائم مقامی دوسرا لفظ نہ کر سکے وہ بھی قابل ترک نہیں۔ ۳۔ ہر طبقے کی زبان کے خاص الفاظ کا استعمال یوں درست نہیں مگر نقلِ قول کے وقت ان کا استعمال قبیح کیا کہ بلیغ ہے۔ میر:

یوں پکارے ہیں مجھے کوچۂ جاناں والے

اِدھر آبے ابے او چاک گریباں والے

مصرعہ ثانی نقل ہے قول ہے ان بازاریوں کا جن کی بیہودگی کا ایک مہذب عاشق کو شکوہ ہے۔" (ص: ۵۹-۵۷)

تخلیقی اُلجھن:

پنڈت کیفی لکھتے ہیں:

"مرزا غالب کا دیوان تیسری بار ۱۲۷۸ھ میں چھپا۔ اس کے خاتمے کی عبارت میں مرزا صاحب لکھتے ہیں:

"ایک لفظ سو بار چھاپا گیا ہے۔ کہاں تک بدلتا۔ ناچار جابجا یوں ہی چھوڑ دیا گیا۔ یعنی کبھو میں یہ نہیں کہتا کہ یہ لفظ صحیح نہیں ہے البتہ یہ فصیح نہیں ہے۔ تلفظ کی رعایت سے اگر لکھا جائے تو عیب نہیں ورنہ فصیح بلکہ افصح ہے۔"[۱۶]

اگرچہ قطعی طور سے اس امر کا تعین ممکن نہیں کہ میر و سودا اور ان کے معاصرین کے ہاں کسو کب تک استعمال ہوتا رہا لیکن لکھنؤ میں اس کا متروک ہونا ثابت ہے۔ حسرت موہانی نے "نکات سخن" میں اس ضمن میں یہ لکھا ہے۔" یہ دونوں لفظ یعنی (کسو، کبھو) لکھنؤ میں ناسخ کے عہد سے متروک ہیں۔ دہلی میں غالب و ذوق و مومن تک ان کا استعمال جائز سمجھا جاتا تھا۔ اب وہاں بھی

متروک ہیں۔ حضرت طباطبائی کے نزدیک اب یہ طے ہے کہ قافیہ کے ضرورت سے بھی احتراز
کا باندھنا صحیح نہیں ہے۔ راقم حروف کے خیال میں شعراء اردو کو عام طور پر حضرت نظم کے قول
پر عمل کرنا چاہیئے۔ البتہ شاذ مواقع پر کہنہ مشق اساتذہ کے بلبے مرزا غالب کی پیروی بھی قابل
اعتراض نہیں ہے۔[17]

جہاں تک کسو کے نثر میں استعمال کا تعلق ہے تو میر امن کے ہاں اس کا استعمال ملتا ہے۔
جنہوں نے "گنج خوبی" کے دیباچہ میں یہ لکھا:

"اگرچہ فکر سخن کہنے کی ساری عمر نہیں کی۔ ہاں مگر خود بخود جو مضمون دل میں
آیا تو اوسے باندھ ڈالا نہ کسو کا استاد نہ کسی کا شاگرد۔ بیت:

نہ شاعر ہوں میں اور نہ شاعر کا بھائی
فقط میں نے کی اپنی طبع آزمائی"[18]

متروکات کے ضمن میں فصاحت کی اصطلاح متعدد مرتبہ استعمال ہوئی ہے۔ فصاحت کی
تعریف کیفی نے یوں کی ہے:

"فصاحت کلام کا وہ وصف ہے جو قاری یا سامع کے ذہن کو متکلم
یا متکلم کے ذہن کے قریب ترین کر دیتا ہے۔"[19]

یہ مختصر ترین تعریف خاصی جامع ہے۔ علم بیان کی کتابوں میں اس پر بہت کچھ لکھا گیا
ہے۔ اس کے خصائص اور معنی بیان کرنے میں بڑی محنت سے کام لیا گیا مگر یہ سب ہمارے موضوع
سے خارج ہے۔ ہمیں صرف یہ ذہن نشین رکھنا ہوگا کہ صدیوں سے فصاحت معیارِ شعر رہی ہے۔ واضح
رہے کہ فصاحت کوئی ٹھوس چیز نہیں نہ ہی اس میں ریاضی جیسی قطعیت پائی جاتی ہے۔ اگرچہ
اساتذہ نے اس کے اوامر و نہی گنوائے لیکن اپنی اصل میں جمالیاتی حس کی مانند یہ بھی ذوقی
اور وجدانی ہے۔ اسی لیے اساسی طور پر باطنی فصاحت کے معیار کی برقراری کے لیے ہی درحقیقت
متروکات کے عمل کا آغاز ہوا جو اپنی اساس میں منفی سہی مگر اساتذہ شعر کے لیے اس بنا

یہ ضروری تھا کہ فصاحت کے تقاضے ہر صورت میں پورے ہونے چاہئیں اور اسی میں متروکات کا جواز مضمر ہے۔ لیکن صرف اس حد تک کہ متروکات تخلیقی مقاصد کے تابع ہوں۔ جب یہ حصول مقصد کے بجائے بذات خود ہی مقصد قرار پا جائیں اور صنم خانہ الفاظ میں ان کا بت متمکن کر دیا جائے تو پھر نتیجہ ظاہر ہے اور اسی سے تخلیق کار کی اس الجھن کا آغاز ہوتا ہے جس کا اشارہ غالب کے خط میں ملتا ہے کہ کیا درست الفاظ کو محض اس لیے استعمال نہ کیا جائے کہ یہ اب متروک ہے۔

شاعری میں کمال فن یا قادر الکلامی کا اظہار اس سے نہیں ہوتا کہ شاعر نے کون کون سے الفاظ نہیں استعمال کیے بلکہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے زیادہ سے زیادہ تعداد میں نئے الفاظ باندھے (نظیر اور انیس کی مثال)، اس نے مروج اسلوب سے انحراف کر کے اپنے لیے نیا انداز سخن پیدا کیا (ولی)، اس نے نئی نئی تراکیب وضع کیں (غالب اور اقبال) اور تشبیہات و استعارات میں کیا کیا جدتیں پیدا کیں (میر انیس، غالب) یا پھر قدیم الفاظ سے نئے تلازمات وابستہ کر کے معنی کی نئی جہت پیدا کی (فیض)، شاعر کا ایک کمال اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے عام مفہوم میں غیر شاعرانہ، فصیح، غریب یا شعری لغت سے خارج الفاظ کو کس خوب صورتی سے استعمال کیا جیسے تحقیق جیسے لفظ کو رنگین نے استعمال کیا:

ذرا گھر کو رنگیں کے تحقیق کر لو!

یہاں سے ہے کے پیسے ڈولی کہارو

خود ناسخ نے آلات جیسا لفظ استعمال کیا اور ساتھ ہی انگریزی لفظ فریم بھی:

خدا کے کام کچھ آلات پر نہیں موقوف

ابوالبشر ہوئے بے مادر و پدر پیدا

ترے رخسارِ تاباں کا کبھی جو عکس پڑتا ہے

فریم آئینے کی بنتی ہے ہالا ماہِ کامل کا

انشا نے جارج سوم کے غسل صحت کی تعریف کے موقع پر تقریباً پونے دو سو اشعار کا جو

قصیدہ کہا اس میں انہوں نے انگریزی کے متعدد الفاظ استعمال کیے ہیں اس مشہور قصیدہ کا مطلع
درج ہے :

بگھیاں نور کی تیار کرائے بوئے سمن
کہ ہوا کھانے کو نکلیں گے جوانانِ چمن

انہوں نے جو انگریزی الفاظ استعمال کیے ہیں ان میں سے کچھ درج ہیں:
پوڈر، کوچ ، بوتل، گلاس (گیلاس) ، پلٹن، آرگن ، الیکٹرسٹی ، لندن ، لارڈ ، ڈیڑہ ،
جنرل، فائر (فیر)

اسم بامسمّٰی: ناسخ

اگرچہ ہر عہد کے اساتذہ سخن اپنے لسانی شعور کے مطابق مختلف الفاظ کو متروک قرار دیتے
رہے ہیں مگر اس ضمن میں اساتذۂ لکھنؤ مصحفیؔ، آتشؔ اور ان کے بعد ناسخؔ نے خصوصی شہرت
حاصل کی۔ لکھنؤ اس عہد میں مرکز تہذیب وتمدن تھا اور دردؔ کی استثنائی مثال سے قطع نظر نامور
شعراء لکھنؤ آچکے تھے ، میرؔ، سوداؔ اور مصحفیؔ نے لکھنؤ کی بزم سخن کو نیا رنگ دیا ۔ لکھنؤ کے جدت
پسندوں نے بھی ہر معاملے میں حسن لطافت اور نزاکت کو ملحوظ رکھا تو شاعری کیسے متاثر نہ ہوتی۔
دہلی کے شعرا دل کی بات کرتے اور انداز بیان میں سادگی ملحوظ رکھتے ۔ تزئین اسلوب کے لیے
تشبیہ، استعارہ تھا مگر یہ صرف طرز ادا کی آرائش کو تھا، مقصود بالذات نہ بنا تھا جبکہ لکھنؤ میں اس
کے برعکس خیال پر لفظ کو بدلے پر طرز ادا کو ترجیح دی گئی جس کے باعث شاعری لفظ پرستی
میں تبدیل ہوگئی۔ میرؔ اور آتشؔ کے ان اشعار سے دہلی اور لکھنؤ کے شعری رویے کو سمجھا جا سکتا ہے:

ہم کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب ہم نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

بے سوزِ دل کنھوں نے کہا ریختہ تو کیا
گفتہ ٔ خام پیشِ عزیزاں سند نہیں

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشؔ مرصّع ساز کا

میر اور درد کے ہاں سادہ بیانی سے جادو جگایا جانا، سادہ تشبیہ اور سامنے کے استعارے اسلوب کا وصف خاص تھے۔ بالعموم طویل ردیفوں سے پرہیز کرتے اور چھوٹی بحروں کو ترجیح دیتے۔ میر نے اگر طویل بحر استعمال کی تو ترنم اس میں نیا مزہ پیدا کر دیتا ہے لیکن لکھنو میں اس کے برعکس ہوا۔ پر شکوہ الفاظ اور زیادہ نئے قوافی بلکہ کوشش کرتے کہ ہر لفظ کا قافیہ بندھ جائے گویا صورت حال نواب سید محمد خاں رند کے بقول یہ تھی۔

کہہ لیے رند نے سب قافیے کوئی نہ چھٹا
انگریزی مگر اک قافیہ فنسٹر تو ہے

ناسخ نے بھی اس انداز کے دو شعر کہے:

معنی قل ھو اللہ احد کے ہیں عیاں ناسخ
برائے قافیہ رکھا ہے میں نے م احمد کا

گریہ ہے تر سا بچوں کے غم میں ناسخ جوشِ اشک
کیا تعجب غرق ہو جائے جو لندن آب میں

اظہار فن یا قادر الکلامی کے لیے مشکل بحروں اور سنگلاخ زمینوں میں غزل دو غزلہ اور سہ غزلہ تک کہا جاتا تھا۔ جیسے ناسخ نے ایک غزل کے مقطع میں گریز کے طور پر سہ غزلہ پیوست کرنے کے لیے مقطعوں میں یہ انداز اختیار کیا:

اور لکھنی جنوں انگیز اب غزل
داغ سودا کے رکھے روشن دل دیوانہ شمع

اور لکھتا ہوں شبِ تاریک فرقت میں غزل
ہے میری آتش زبانی پیرِ خلوت خانہ شمع!

ناسخ اس فن کے امام سمجھے جاتے ہیں اور اگر اس نے سنگلاخ زمین میں جی لڑا دیا تو یہ عصری تقاضوں کے عین مطابق تھا:

جی لڑا دیتا ہے کیسی ہی زمیں ہو سنگلاخ
خامہ تیشہ ہے تو ناسخ کوہ کن سے کم نہیں

کہے جو طویل اس کو سزاوار ہے ناسخ
جس بحر میں اس زلف کا مضمون باندھا ہے

اس زمیں میں ناسخ اب منانہ پڑھیے چند شعر
ہے بغل میں شیشۂ مے، ہاتھ میں پیمانہ ہے

جوشش معنوں سے طوفان زا ہوئی ناسخ یہ بحر
کشتیٔ طبع رواں کو ہم نے اب لنگر کیا

اس شاعرانہ رویے کی تشکیل میں تہذیبی اور تمدنی امور بھی کار فرما تھے۔ دہلی آگرہ اور شاہجہان آباد میں جس تمدن نے مغلوں کے زیرِ اثر فروغ پایا تھا وہ لکھنو میں چراغ کی آخری بھڑک تھا۔ اہلِ لکھنو کو یہ احساس نہ تھا کہ مستقبل نے انہیں کیا کچھ دکھانا ہے۔ وہاں تو امن خوشحالی اور قدر دانی کی فضا میں اہلِ لکھنو شاعری کے ساتھ ساتھ دیگر امورِ زیست میں بھی جدت واختراع سے اپنی نفاست پسندی کا ثبوت دینے کے لیے سعی کناں تھے۔ لکھنو مرکزِ علم وادب تھا تو مشاعرہ تخلیقی سرگرمیوں کا مرکز۔ مقبول اساتذہ اپنے شاگردوں کے جھرمٹ میں یوں بیٹھتے جیسے ستاروں کی محفل میں چاند۔ ادبی چپقلشیں بزبان غزل اظہار پاتیں، اعتراضات ہوتے۔ سند دی جاتی۔ اور اچھے شعر پہ باذوق سامعین داد دینے میں بخل سے کام نہ لیتے۔ یہی وہ فضا تھی جس میں ناسخ نے متروکات کی صورت میں اصلاحِ زبان کی تحریک شروع کی۔ اہلِ لکھنو کو اپنے باکمال ہونے کا

احساس تھا۔ لہٰذا انہوں نے جہاں اپنے ہنر کا اظہار کیا وہاں ہر معاملے میں دہلی سے خود کو برتر اور افضل ثابت کرنا بھی قرار پایا۔ ان کی اجتماعی نرگسیت کا یہ تقاضا تھا کہ شعر و فن کے آئینہ میں اپنے تخلیقی خد و خال کے نظارہ سے خوش ہوں۔ ادھر دہلی کی قدیم اور عظیم روایات ان میں جس طرح کا احساس کمتری پیدا کرتی ہوں گی اس سے عہدہ برائی کے لیے وہ خود کو اہل دہلی سے ہر معاملے میں برتر، منفرد اور ممتاز سمجھنے پر مجبور تھے۔ یوں دیکھیں تو اہل لکھنؤ کی تخلیقی مساعی ایک طویل تعلّی کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔ واضح رہے کہ تعلّی بالعموم مقطع ہی میں کی جاتی ہے۔ "دلی کا دبستان شاعری" (از ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی)، "لکھنو کا دبستان شاعری" (از ڈاکٹر ابواللیث صدیقی) کے مطالعے سے یہ اندازہ ہو جاتا ہے کہ کس طرح لکھنو میں دہلی کے اتداد بر محل الفاظ محض اس لیے متروک قرار پائے کہ وہ اساتذہ دہلی کے ہاں عام تھے اسی طرح میرامن کا خود کو "دلی کا روڑا" کہنا رجب علی بیگ سرور کو کیوں برا لگا۔ اتنا کہ اس کے جواب میں "فسانہ عجائب" لکھ کر دیباچہ میں "قصیدہ در مدح لکھنو" قسم کی تحریر لکھنا پڑی تو اس کا محرک بھی یہی احساس برتری تھا۔ حالانکہ وقار عظیم کے الفاظ میں تو یہ میرامن کی "بے ضرر سی تعلّی" تھی۔

تو یہ ہے وہ ذہنی فضا اور تخلیقی ماحول جس میں شیخ امام ناسخ (وفات ۱۵ اگست ۱۸۳۸ء) نے متروکات کے عمل کا آغاز کیا اور اس کے لیے اپنی بہترین صلاحیتیں وقف کر کے اردو زبان کو صاف کیا۔ محاوروں کی نوک پلک سنواری اور یوں "لکھنویت" کا اثبات کیا۔ اگرچہ بعض جدید محققین جیسے (مولوی عبدالحق، پنڈت کیفی) نے متروکات کے ضمن میں ناسخ کے بے لچک رویہ کو پسند نہیں کیا لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ان کی زندگی میں اس کام کو بہت اہمیت دی گئی اور قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ بقول صفیر بلگرامی:

"غالب سے ایک دن کچھ دہلی اور لکھنو کی زبان کا ذکر آگیا۔ فرمایا میاں اگر مجھ سے پوچھتے ہو تو زبان کو زبان کر دکھایا تو لکھنو نے اور لکھنؤ میں ناسخ:

نے ورنہ بولنے کو کون نہیں بولتا۔ اب جس کا جی چاہے نزاش خراش روز کرلے
مگر میرے نزدیک وہ نزاش خراش کی جگہ ہی نہ چھوڑ گیا۔"[۲۱]

لاتعداد شاگردوں کے علاوہ ناسخ کے اپنے تین دیوان بھی ان کے فنی شعور اور تنقید کے حسنِ استعمال کے گواہ ہیں۔ ناسخ کی تخلیقی شخصیت میں ایک طرح کا تضاد بھی نظر آتا ہے مثلاً وہ یہ کہتا ہے:

شبہ ناسخ نہیں کچھ میرؔ کی استادی کا
آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میرؔ نہیں

مگر اس اعتراف کے ساتھ اسلوبِ میر کے بعض عناصر کو متروک قرار دینے سے بھی نہیں چوکتا اور حکیم نجم الغنی (بحر الفصاحت، لکھنؤ ۱۹۱۷ء) سے یوں داد پاتا ہے:

"انہیں ناسخ کہنا بجا ہے کیونکہ ناہموار طرزِ قدیم کو نسخ کیا۔"

ناسخ نے اصلاحِ زبان کے لیے جو سعی کی آج ہم اس کا صحیح اندازہ نہیں لگا سکتے۔ جس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے اس موضوع پر کوئی باضابطہ کتاب تحریر نہیں کی۔ اگر حاتم کی مانند ناسخ نے بھی کسی دیوان کے مقدمے یا دیباچے میں اپنے لسانی شعور کی وضاحت کرتے ہوئے اس کی روشنی میں فصاحتِ الفاظ اور متروکات کی بحث کی ہوتی تو اس سے جہاں ناسخ کی تنقیدی حس کا اندازہ ہو سکتا تھا وہاں یہ بھی معلوم ہو جاتا کہ کس وجہ سے وہ لفظ کو متروک قرار دے دیتے تھے۔ ان کا سارا انحصار اصلاحِ شعر پر تھا۔ اور ظاہر ہے کہ تمام تلامذہ کے تمام اشعار کی اصلاح اور ان سے وابستہ جملہ امور کا اب سراغ لگانا مشکل ہے ویسے بھی یہ سلسلہ زبانی ہوتا تھا۔ اگر غالب کی مانند ناسخ کے بھی تمام خطوط دستیاب ہوتے تو ان سے ہی متروکات، تذکیر و تانیث، واحد جمع اور اسی نوع کی دیگر معلومات حاصل ہونے کا امکان تھا۔ میں نے اس نقطۂ نظر سے ان کی کلیات کا مطالعہ کیا کہ شاید اس انداز کے کچھ اشعار مل جائیں جن سے ان کی تنقیدی حس اور لسانی شعور کا کچھ اندازہ ہو سکے۔ مگر اس انداز کے اشعار بھی نہ ملے۔ ناسخ سے زیادہ تو آتش کے ہاں ایسے اشعار مل جاتے

جن سے اسلوب اور زبان کے بارے میں ان کا رویہ بآسانی سمجھا جا سکتا ہے۔ ناسخ کے
ان غزل کے روایتی مضامین ملتے ہیں۔ میر کا احترام اور سودا کے حوالے سے کچھ اشعار مل جاتے
ہیں کہیں کہیں بحروں کے بارے میں لکھا ہے اور بس ایسے ہی اشعار مل سکے اگر ان سے کچھ
بات بن جائے تو:

چونک اٹھے خواب لحد سے سن کے سودا یہ غزل
شاعری ہرگز نہیں ناسخ فقط اعجاز ہے

ناسخ یہ وہ غزل ہے جنوں زا کہ سنتے ہی
سودا کفن کو پھاڑ کے نکلے مزار سے

کلامِ غیب ہے ناسخ سنا جو یہ بہ یہ ناسخ
پسند آیا ہے اسے ناسخ کلام استاد کامل کا

کہیے بحر طویل اس کو سزاوار ہے ناسخ
جس بحر میں اس زلف کا مضمون بندھا ہے

کوئی کچھ کہتا ہے دنیا میں کوئی کہتا ہے کچھ
معنیٔ اشعارِ مہمل خواب کی تعبیر ہے

کیا ہوا گر شعرِ ناسخ ہیں عقیدے کے خلاف
آیۂ منسوخ کیا موجود قرآں میں نہیں

معنی ثمر، حروف ورق، صنعتیں ہیں گل
ناسخ ہے کلکِ فکر نہالِ سخن کی شاخ

بس یہی وہ اشعار ہیں جن سے ناسخ کی تنقیدی حس اور لسانی شعور کا اندازہ لگایا جا
سکتا ہے۔ متروکات کے نقطۂ نظر سے مواد کی عدم فراہمی کے باعث اب اس امر کا تعین دلوثوق
سے نہیں ہو سکتا کہ ناسخ نے متروکات سے واقعی زبان کی خدمت کی یا الفاظ کے معاملے میں آمریت

کا ثبوت دیتے رہے اور اصلاح شعر سے معرض وجود میں آنے والا ان کا لسانی رویہ صحت مند تھا یا برعکس، تاہم اتنا ہے کہ ان کے شاگردوں کی فہرست خاصی طویل تھی۔ یہی نہیں بلکہ ان کے شاگردوں کے شاگرد یعنی پوتے اور پڑپوتے شاگردوں تک کے ذریعے سے ان کی اصلاحات کے مثبت (یا منفی) اثرات نظر آتے رہے۔ مولانا حسرت موہانی نے "ارباب سخن" (۱۹۲۱ء) میں ناسخ کے بیالیس شاگردوں کے اسماء درج کیے ہیں۔ ان میں سے گیارہ کے دیوان مطبوعہ ہیں جبکہ صرف چھ کی استثناء سے بقیہ سبھی صاحب دیوان تھے۔ ان کے چند نامور شاگردوں کے نام یہ ہیں: مرزا محمد رضا خاں صاحب، فتح الدولہ برگ، میر اوسط علی رشک، خواجہ محمد وزیر، شیخ امداد علی بحر، محمد علی خاں میسا، مرزا مہدی علی خاں قبول، مرزا مہدی کوثر اور میر کلو عرش۔[۱۱]

ناسخ کے شاگردوں میں سے برقؔ، رشکؔ اور وزیرؔ اور بحرؔ وغیرہ خود بھی اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ چنانچہ برق کے آٹھ، رشک کے ۲۵، وزیر کے ۱۵، اور بحر کے، شاگردوں کا احوال ملتا ہے۔ میر کلو عرش کے ۵، مولوی محمد بخش شہید کے ۵، شیخ امان علی سحر کے ۴، حاتم علی مہر کے، شاگرد تھے۔ ان کے علاوہ بعض شعراء کے ایک ایک دو دو شاگرد بھی تھے۔ پھر برق کے شاگردوں میں میر ضامن علی جلال خاصے نامور تھے۔ خود ان کے ۱۶ شاگرد تھے[۱۲] جن میں سید انوار حسین آرزو لکھنوی جیسے مشہور شاعر بھی شامل ہیں۔

شاگردوں اور پھر شاگردوں کے شاگردوں کی تعداد درج کرنے کا مقصد اس امر کی طرف توجہ دلانا تھا کہ ایک استاد زبان و بیان اور لفظ و معنی کے بارے میں شاگردوں کی صورت میں شعراء کی کئی نسلوں کو متاثر کر سکتا ہے۔ کیفی نے اس ضمن میں دلچسپ بات لکھی ہے: "رشک نے چالیس پینتالیس کے قریب الفاظ متروک قرار دیے تھے۔ جن سے ان کا تیسرا دیوان پاک تھا لیکن وہ دیوان افسوس کہ چھپا نہیں۔ رشک مرحوم ان متروکات کے دفتر کو بہت مخفی رکھتے تھے۔ اور اپنے خاص شاگردوں کے سوا کسی کو مستفید نہیں ہونے دیتے تھے۔"[۱۳]

الفاظ کا گلا گھونٹنا

متروکات کی افادیت کے بارے میں ہمارے ناقدین اور محققین میں خاصا اختلاف پایا جاتا ہے جس کا اندازہ "نقد متروکات" مطبوعہ نقوش ادبی معرکے نمبر ا ستمبر ۱۹۸۱ء کی بحث کے شرکاء کے بیان سے لگایا جا سکتا ہے۔ شرکاء پنڈت برجموہن دتاتریا کیفی، احسن مارہروی اور منوہر لال زتشی متروکات کی افادیت یا عدم افادیت کے بارے میں اختلاف رائے درست ہے کیونکہ بعض الفاظ کے بارے میں واقعی یہ سمجھا نہیں جا سکتا کہ آخر انہیں ترک کرنے کی کیا وجہ تھی؛ کیا محض اہل زبان کے روزوں کی ضد میں؛ یا استادی کے زعم میں یہ متروکات کا عمل لفظ کی جمالیات پر استوار تھا یا محض ایجاد بندہ والی بات تھی۔ اس لیے جب مولوی عبدالحق اس خیال کا اظہار کرتے ہیں تو اس کی معقولیت میں شبہ نہیں ہو سکتا:

بعض اساتذہ نے بعض الفاظ متروک کر دیئے ہیں اور اپنے کلام میں استعمال نہیں کیے ان کے شاگردوں نے بھی ان کی تقلید کی۔ اس طرح متروکات کی تعداد بڑھتی گئی۔ ہماری رائے میں کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ یہ کہے کہ فلاں لفظ آج سے متروک ہے۔ الفاظ کی حالت بھی جاندار کی سی ہے۔ بڑھتے گھٹتے ہیں صورت بدلتے ہیں۔ حیثیت میں فرق آ جاتا ہے۔ بعض نام پیدا کرتے ہیں بعض گمنام ہو جاتے ہیں۔ شریف سے رذیل ہو جاتے ہیں اور بعض ایک مدت کے بعد مر جاتے ہیں۔ لیکن دانستہ گلا گھونٹنے کا حق کسی کو حاصل نہیں ہے۔ تعجب ہے کہ اس کی ابتداء شعراء کی طرف سے ہوئی حالانکہ شاعری کو ان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ اور بعض دفعہ یہ الفاظ کلام میں لطف پیدا کر دیتے ہیں۔ مثلاً یہ (لیکن کے معنی میں) متروک کر دیا جائے۔ کس قدر مختصر اور خوبصورت لفظ ہے۔ ہر لحاظ سے لیکن سے بہتر ہے۔ شاعر اسے بلا تکلف استعمال کر سکتا ہے۔ بھانا بھی متروک ہے حالانکہ اس کی بجائے اردو میں کوئی لفظ نہیں۔ پسند آنا اور پسند کرنا میں اختیار اور ارادہ ظاہر ہوتا ہے اور بھانا وہاں استعمال ہوتا ہے جو کوئی شے بغیر ارادہ

اختیار کے خود بخود دل کو اپیل معلوم ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ پرے[25] کا لفظ بھی متروک ہے مگر جب عرض کیا جاتا ہے کہ اس کی بجائے کیا استعمال کیا جائے تو ارشاد ہوتا ہے کہ اُدھر مگر پرے اور اُدھر کے معنی میں بہت فرق ہے۔ اُدھر سمت کو بتاتا ہے اور پرے بات کا اظہار کرتا ہے۔ مت بھی متروک سمجھا گیا ہے حالانکہ اس کے معنی خاص ہیں۔ نہ یہ کام نہیں دے سکتا۔ نہ افعال کی عام نفی کے لیے ہے اور مت نہیں کے واسطے مخصوص ہے۔ اسی طرح بہت سے لفظ مثلاً خاطر، سو، تو، ناؤ، مند جانا، بھلا (بمعنی اچھا)، کانٹھ وغیرہ وغیرہ متروک قرار دیئے گئے ہیں۔ ان الفاظ کے متروک ہونے کی کوئی اور وجہ معلوم نہیں ہوتی۔ سوائے اس کے کہ لکھنؤ کے بعض شعراء نے ان کا لکھنا ترک کر دیا اور ظاہر ہے کہ یہ کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی۔[26]

پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی نے بھی اس طرزِ عمل پر شدید احتجاج کرتے ہوئے لکھا۔

"جتنی قیدیں نظم لکھنے والوں پر عائد کی گئی ہیں وہ سراسر جابرانہ اور ناجائز ہیں ..... نہ اس سے زبان کی ترقی ہو گی اور نہ تخیلِ شاعرانہ کی توسیع۔ ایسی کاٹ چھانٹ سے زبان جو ہمارے نقاد اور غیر منصف ادیب بنانا چاہتے ہیں، سرسبز نہیں ہو سکتی۔ ہمارا دستور العمل یہ ہونا چاہیئے۔

مصلحت بیں و کار آسان کن

ورنہ خوف ہے کہ اگر اس خرج بحرج اور ترک بترک کی لے یوں ہی بڑھتی گئی تو مرزا غالب کا یہ قول ہمارے حال کی مصداق نہ ہو جائے۔"

مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں[27]

شاید ابتداء میں متروکات کی ضرورت ہو گی کہ زبان تخلیقی اعتبار سے نشو و نما پا رہی تھی لیکن جب زبان ہر طرح کے اظہار و مقاصد پر قادر ہو جائے اور قد آور شخصیات تخلیقی امکانات سنوار چکی ہوں تو متروکات کا عمل زبان کو دیو بانی ہونے کے مترادف ہوتا ہے۔ جس کی تہہ میں یہ نرگسی رویہ ملتا ہے کہ یہ ہماری زبان ہے اور ہم اس کی حرمت کے رکھوالے ہیں۔ لیکن

زندہ زبان کو قواعد و ضوابط کے تالوں میں یوں مقید نہیں کیا جاسکتا۔ زبان تو ہوا کی مانند آزاد ہے۔ جس میں الفاظ پھولوں کی خوشبو کی مانند ہوتے ہیں۔ پھولوں پر گیت گانے والی بلبل کو تو قفس میں ڈالا جاسکتا ہے مگر پھولوں اور ہوا کو نہیں۔

ایہام

ایہام وام الفاظ:

ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اپنی کتاب "اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" میں متعدد لغات اور کتب کے حوالے سے ایہام کی یہ تعریفیں جمع کی ہیں:

"ایہام عربی کا لفظ ہے اور اس کا مطلب نور اللغات میں وہم میں ڈالنا، المنجد میں وہم میں پڑنا یا وہم میں ڈالنا اور فرہنگ آنندراج میں در غلطی انداختن و در شک افگندن بتایا گیا ہے۔ کہ اس صنعت کے استعمال سے پڑھنے والا وہم میں پڑ جاتا ہے یا مفہوم کے سمجھنے میں غلطی میں پڑنے کا احتمال ہے۔ اس لیے اس کا نام ایہام رکھا ہے۔ اب ہم دیکھتے ہیں کہ اس کے اصطلاحی معنی کیا ہیں۔ جامع اللغات میں لکھا ہے۔ "علم عروض کی ایک صنعت، شاعر شعر میں ایسا لفظ لاتا ہے جس کے دو معنی ہوں"۔ مگر یہ تعریف ناقص ہے کیونکہ اس طرح بعض اور صنعتیں صنعت ایہام کے ساتھ شامل ہو جاتی ہیں۔ مثلاً صنعت ایہام تناسب یا صنعت استخدام وغیرہ۔ خواجہ دل محمد نے گلزار معنی میں اس کی تعریف یوں کی ہے۔ "شعر میں ایسا لفظ لانا جس کے دو معنی ہوں۔ ایک معنی اس مقام کے قریب ہوں دوسرے بعید لیکن شاعر معنی بعید مراد لے"۔

نکات الشعراء میر تقی میر (ص ۱۸۰) طبقات الشعراء (ص ۲۴) اور تذکرۂ ریختہ گویاں از گردیزی (ص ۱۵۴) میں بھی یہی تعریف دی گئی ہے۔ حدائق السحر چھٹی صدی ہجری میں لکھی گئی۔ یہ قدیم ترین کتاب ہے جس میں ایہام کی مستند تاریخ ملتی ہے اور جو آج تک رائج ہے۔ اس

تعریف میں لفظ بعید کی بجائے غریب استعمال ہوا ہے اور صنعت ایہام کا ایک اور نام تخییل بتایا گیا ہے:

"این صنعت را تخییل خوانند وچناں بود کہ دبیر یا شاعر در نثر یا در نظم الفاظے بکار برد کہ آں لفظ را دو معنی باشند. یکے قریب و دیگرے غریب وچوں سامع آں لفظ را بشنود خالی خاطرش بمعنی قریب ردد مراد از آں لفظ خود معنی غریب بود۔"

اس کے بعد ساتویں صدی ہجری میں لکھی جانے والی کتاب "المعجم فی معاییر اشعار العجم" میں اس کا مطلب برگمان افگندن اور تعریف دعواط سے ملتی جلتی دی گئی ہے۔

"لفظے ذو معنی بکارد از دیکے قریب ودیکے غریب تا خاطر سامع نخست بمعنی قریب ردد ومراد قائل معنی غریب باشد۔"[28]

حدائق البلاغت میں ایہام کے لیے توریہ کی اصطلاح بھی استعمال کی گئی ہے۔ جس کے لغوی معنی جدا کرنے کے ہیں۔[29] جبکہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے الفاظ میں "ایہام کی نوعیت یہ ہے کہ شاعر پورے شعر یا اس کے جزو سے دو معنی پیدا کرتا ہے۔ یا پھر ایک ذو معنی لفظ کے استعمال سے دو لفظ بہم پہنچاتا ہے۔ یہ دونوں صورتیں صنائع میں داخل ہیں۔ اول الذکر کو ادماج اور آخر الذکر کو ایہام کہتے ہیں۔ ایہام کے معنی یہ ہیں کہ وہ لفظ ذو معنی ہو جس پر شعر کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ اور ان دونوں معنی میں سے ایک معنی قریب ہوں دوسرے بعید۔ اور شعر میں شاعر کی مراد معنی بعید سے ہو قریب سے نہیں۔ یہ بات واضح رہے کہ ایہام میں شعر کا مطلب ایک ہی ہوتا ہے دو نہیں ہوتے۔ وہ لوگ جو ایہام کا رشتہ سنسکرت کے سلیش سے جوڑتے ہیں بھول جاتے ہیں کہ سلیش اور ایہام میں بنیادی فرق یہی ہے کہ سلیش میں ایک شعر کے تین تین چار چار معنی ہوتے ہیں جبکہ ایہام میں صرف ایک معنی ہوتے ہیں۔ جزو سے کی یا شعر پڑھ کر ذہن دونوں معنی کی طرف جاتا ہے۔ لیکن جلد ہی ایک معنی کو تلاش کر لیتا ہے۔"

تلاش کے عمل سے وہ شعر سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ اس دور کے ایہام گویوں نے
لفظوں سے ہی ایہام پیدا کیا ہے۔ دوہے میں جو اپ بھرنش کی قدیم ترین صنف
عام طور پہ یہی صورت ملتی ہے۔ اس کا اثر بھی اس دور کی شاعری نے قبول کیا۔" [20]
جہاں تک سنسکرت کی صنعت سلیش کا تعلق ہے تو مولوی عبدالحق نے اپنے ایک مقالے
"اردو شاعری میں ایہام گوئی" (مطبوعہ ہم قلم کراچی جون ۱۹۶۱ء) میں اس کے بارے میں لکھا:

"سلیش سنسکرت کا لفظ ہے۔ سنسکرت میں اس صنعت کی کئی قسمیں ہیں
مگر ان میں سے خاص دو ہیں۔ بھنگ اور ابھنگ۔ بھنگ میں لفظ سالم رہتا
ہے۔ ابھنگ میں لفظ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے یہ صنعت پیدا ہو جاتی ہے۔ ہندی
میں یہ سنسکرت سے آئی ہے۔"

مندرجہ بالا سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ایہام میں شعر کے دو معنی ہوتے ہیں۔ شعر سنتے
ہی سامع کے ذہن میں قریبی معنی آتے ہیں۔ لیکن ذرا غور کرنے پر ایک اور معنی بھی برآمد
ہوتے ہیں کہ ان تک رسائی کے لیے ذہن پر زور ڈالنا پڑتا ہے۔ تاہم یہ معنی بعید شعر کے
الفاظ میں پنہاں ہوتے ہیں اور معنی قریب سے معنی بعید تک رسائی کے لیے شعر کے الفاظ میں
کا اشارہ پوشیدہ ہوتا ہے۔ مومن کا یہ مشہور شعر ملاحظہ کیجئے:

شب جو مسجد میں جا پھنسے مومن
رات کاٹی خدا خدا کر کے

شعر پڑھتے ہی فوراً یہ معنی ذہن میں آتے ہیں کہ مومن نے تمام رات مسجد میں عبادت
کی۔ لیکن "جا پھنسے" پر غور کرنے سے محسوس ہوتا ہے کہ مسجد میں جانا بخوشی نہ تھا۔ بلکہ کسی
جبر کے تحت مسجد میں جا پھنسے۔ دوسرے مصرعہ میں یہ قرینہ ملتا ہے۔ خدا خدا کرنا محاورہ ہے۔
جس کا مطلب ہے تکلیف میں خدا کو یاد کرنا نہ کہ عبادت میں خدا کی یاد۔ لہٰذا معنیٔ بعید، معنیٔ
قریب کے برعکس ثابت ہوئے اور اسی میں ایہام کا سارا مزہ پوشیدہ ہے۔ ایہامی شعر کی

ذو معنویت شعوری ہوتی ہے۔ اسے اظہار عجز نہ سمجھا جائے نہ ہی اسلوب کی خامی۔ شاعر معنی قریب پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ شعر میں ایسا قرینہ بھی رکھتا ہے کہ ذہین قاری کا ذہن معنی بعید تک پہنچ جاتا ہے۔ ایہام اسلوب پر استوار ہوتا ہے اور یہ لفظوں کا کھیل ہے بلکہ اپنی اساسی صورت میں تو ایہام اچھی خاصی ذہنی مشق کی صورت اختیار کر جاتا ہے۔ قادر الکلام شاعر ذہین قاری کے لیے لفظوں کا دام بچھاتا ہے جو اپنے ذہن رسا سے معنی قریب کے پٹ کھول کر معنی بعید تک رسائی حاصل کرتا ہے۔

معنی قریب اور معنی بعید کی مختلف صورتوں کے بارے میں ملک ڈاکٹر حسن اختر نے یوں لکھا ہے:

ا۔ معنی قریب لفظ کے وہ معنی ہوں گے جو عوام میں عام طور پر مشہور ہوں اور معنی بعید وہ لغوی معنی ہو سکتے ہیں جو کم مشہور ہوں۔

۲۔ اگر کسی لفظ کے حقیقی اور مجازی معنی مراد ہوں تو لغوی یا حقیقی معنی قریب اور مجازی معنی بعید ہوں گے۔

۳۔ اگر معنی اس مقام کے مناسب ہوں تو وہ قریب کے معنی کہلائیں گے۔ لیکن اگر وہ اس مقام کے مناسب نہ ہوں تو وہ معنی بعید ہوں گے۔" [۳۱]

ذو معنی الفاظ سے تفنن کا پہلو پیدا کرنا مزاح کے اساسی عناصر میں سے ہے اور یہ عام گفتگو میں اتنا عام ہے کہ بطور خاص کبھی اس کی طرف توجہ ہی نہیں جاتی۔ لطیفوں، چٹکلوں اور پھبتیوں میں اس سے بطورِ خاص کام لیا جاتا ہے۔ اسی طرح بعض اوقات ڈرامے کے مزاحیہ مکالمات میں بھی یہ انداز اپنایا جاتا ہے۔ ذو معنی سے پہلے مغالطہ پیدا کرنا پھر نیا اور انوکھا مفہوم دینا اس "کھیل" کا متنوع طور عام گفتگو میں مشاہدہ کیا جا سکتا ہے۔ انگریزی میں "PUN" پن اس کی بہت اچھی مثال ہے۔ جو تخلیقی سطح پر "لیمرک" کی اساس بنتا ہے۔ اردو میں ذو معنی کا تخلیقی استعمال ایہام کے فن کی بنیاد مہیا کرتا ہے۔ ہر چند کہ ہر ایہامی شعر کا پر مزاح ہونا ضروری نہیں

لیکن یہ بھی طے ہے کہ اس کی سنجیدگی بھی باعث تفریح ہو سکتی ہے۔ بقول قائم:

بطور ہزل ہے قائم یہ گفتگو ورنہ
تلاش ہے یہ مجھے ہو نہ شعر میں ایہام

ایہام: نفسیاتی تناظر

ایہام کا نفسیاتی مطالعہ کرنے پہ اس انداز سخن کی مقبولیت کی وجہ سمجھنی اتنی دشوار نہیں کیونکہ اس میں زیادہ تر زور جنس پہ ہوتا ہے۔ اگر تحلیل نفسی کے محدب شیشے میں رکھ کر ایہام گو شعراء کے جنسی رویوں کی تحلیل کریں تو فرائڈ کی اصطلاح میں یہ "ORAL EROTISM" ہے جیسے سعادت کا یہ شعر:

دیکھ کر دختر رز زی کا سینہ
جی میں آتا ہے کہ مل مل دیجئے

اس شعر میں تو غیر واضح طور پہ جنسی "PUN" ہے۔ لیکن بسا اوقات ہم جنسیت کے حوالے سے بھی ایہام پیدا کیا گیا۔ اس عہد میں یہ رویہ عام تھا اور بیشتر شعراء نے حسب استطاعت اس کے بارے میں لکھا بھی ہے۔ شعراء کے بعض تذکروں میں بعض حضرات کے ساتھ اس کا یوں تذکرہ کیا جاتا ہے۔ گویا شاعری کے ساتھ ساتھ یہ بھی ان اساتذہ کی ایکسٹرا کوالیفکیشن تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ جنس ہی ایہام کا تخلیقی محرک بنی جنس اس عہد کا عام شاعرانہ چلن تھی اور اس لحاظ سے ایہام میں بھی در آئی۔ لیکن جس طرح غزل میں متنوع مضامین کا اظہار کیا گیا اس طرح ایہام میں بھی موضوعات کا تنوع ملتا ہے بلکہ ذومعنویت کی بنا پر تو یہ تنوع دوگنا ہو جاتا ہے۔ اسے یوں سمجھئے سات اشعار کی عام غزل میں صرف سات مضامین ہی ملیں گے جبکہ سات اشعار کی ایہامی غزل میں چودہ مضامین۔ اس کو کہتے ہیں ایک ٹکٹ میں دو مزے۔

"نیا کھلونا":

ولی کے زیر اثر جب دہلی کے فارسی گو اساتذہ نے منہ کا ذائقہ بدلنے یا تفنن طبع کو اردو غزل کہی تو ان کے سامنے ولی کی غزل کا نمونہ تھا۔ لہذا انہوں نے وہی انداز اپنایا۔ ولی کو اگرچہ بطور خاص ایہام گو شاعر نہیں کہا جا سکتا۔ لیکن اس کی غزل میں ایہام بھی ملتا ہے۔ ولی کا اصل کمال فن ایہام میں نہیں بلکہ جمال پرستی اور اس سے جنم لینے والے پر جمال اسلوب میں ہے۔ مزید برآں ولی کے تخلیقی شعور کے پس منظر میں طویل شعری روایات تھیں۔ دکنی غزل کا سارا جمال ولی کی صورت میں آکر ایک نقطہ پہ مرکوز ہو جاتا ہے۔ اسی لیے عابد علی عابد نے ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ کے کلاسیک کے معیار کو اساس بنا کر صرف ولی کو اردو غزل کا کلاسیک قرار دیا تھا۔

دہلی کے دور اول کے اردو غزل گو شعراء کے لیے تو ایہام نے ایک کھلونے کی شکل اختیار کر لی۔ اس کی ذو معنویت میں تفنن کا جو پہلو تھا وہ مشاعروں میں یقیناً باعث داد ہوگا۔ بہل قلیل عرصہ میں شعرا کی پوری نسل ہی ایہام گو بن گئی۔ لطیفہ یہ ہے کہ خود دکنی غزل گو شعراء نے ایہام سے اتنی رغبت ظاہر نہ کی۔ وہاں جن شعراء کے ہاں ایہام ملتا ہے وہ محض آٹے میں نمک کے برابر ہے۔ بعض دیگر صنعتوں کے مانند ایہام کا بھی بطور ایک صنعت استعمال اور بس۔ یہی وجہ ہے کہ دکن میں غزل کی قدامت کے باوجود ایہام سے وہ خصوصی شغف نظر نہیں آتا جس کا اظہار دہلی کے شعراء نے کیا۔ اس حد تک کہ اس نے تحریک کی صورت اختیار کر لی۔ اس کے برعکس دکن میں تحریک تو کیا دکن میں یہ خصوصی رجحان بھی نہ تھا۔ جبکہ دہلی میں ایہام گوئی کا آغاز غزل گوئی کے آغاز سے منسلک نظر آتا ہے۔

تاریخی لحاظ سے سراج الدین علی آرزو (۱۶۸۷ء تا ۱۷۵۶ء) سے ایہام کا آغاز سمجھا جاتا ہے۔ یہ نجم الدین شاہ مبارک آرزو، شیخ شرف الدین مضمون اور غلام مصطفی یک رنگ کے استاد تھے

ویسے استادی شاگردی تو ایک تکلف تھا کیونکہ یہ تینوں اپنے طور پہ خود اہم شعراء میں شمار ہوتے تھے اور صاحب تلامذہ بھی تھے۔ اگرچہ ڈاکٹر جمیل جالبی کے بقول آرزو نے:
"اردو میں تقریباً ۲۷ اشعار کہے ہیں۔"[۲۳] مگر اس کے باوجود ان کی اہمیت مسلم ہے کہ ایک تو، "آرزو نے اردو شعراء میں اعتماد پیدا کر کے انہیں ریختہ میں بطرزِ فارسی شعر کہنے پہ مائل کیا۔ دوسرے، آرزو نے ایہام گویوں کی بھی رہنمائی کی۔ اور اس دور کے پسندیدہ رنگ سخن میں شعر کہہ کر ان میں بھی اعتماد پیدا کیا۔"[۲۴]

اسی زمانے میں سید محمد شاکر ناجی بھی تھے اور ان کے ساتھ ہی شیخ ظہور الدین حاتم کا نام بھی آتا ہے اور یہی وہ شعراء ہیں جنہوں نے دہلی میں بزمِ شعر جمائی اور اردو غزل کی اساس استوار کر کے ایہام سے خصوصی شغف کا اظہار کیا۔ بقول مضمون:

ہوا ہے جگ میں مضمون شہرہ تیرا
طرح ایہام کی جب سیں نکالی

جبکہ ناجی نے یہ دعویٰ کیا:

ریختہ ناجی کا ہے محکم اساس
بات میری بانیٔ ایہام ہے!

ان اساتذہ کے شاگردوں نے بھی یہی انداز اپنایا اور تھوڑے ہی عرصے میں دہلی کے مشاعرے ایہام سے گونجنے لگے۔

دیگر صنعتوں کی مانند ایہام بھی مصنوعی ہے۔ بنیادی طور پہ یہ محض لفظی قلا بازی ہے۔ لہٰذا لفظی جمناسٹک میں شاعر کے لیے جذبات اور حقیقی احساسات کے اظہار کی گنجائش نہیں رہتی صنعت کبھی کبھار اور از خود موزوں ہو جائے تو شعر کے مزے میں اضافے کا موجب بنتی ہے لیکن جب صنعت برائے صنعت ہو تو اس سے جو مصنوعی اسلوب اور سطحی طرزِ اظہار جنم لیتا ہے وہ شعر کو شعر نہیں رہنے دیتا ہے۔ اسی لیے ایہام کے خلاف ردِ عمل شروع ہوگیا۔

صاف گوئی

اس ردِ عمل کو حاتم کے الفاظ میں "صاف گوئی" [35] کہا جا سکتا ہے اور معنی کے لحاظ
"تازہ گوئی" (عقدِ ثریا، ص ۲۳) اس کے آغاز کا سہرا مرزا مظہر جان جاناں کے سر باندھا جاتا
ہے۔ اگرچہ ابتدا میں انہوں نے بھی ایہامی اشعار کہے مگر جلد ہی بیزار ہو گئے۔ ڈاکٹر سید
مبارک علی نقشبندی نے ان کی اصلاحی کوششوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے "حقیقت بیانی
اور سادہ گوئی پر اردو شاعری کا سنگ بنیاد رکھا۔ اس لیے آپ نقاشِ اول ریختہ کے نام
سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ آپ کی اس مساعیٔ جمیلہ کا اعتراف زیادہ تر بیشتر تذکرہ نگاروں نے
کیا ہے۔ [36] انہوں نے اس ضمن میں قدرت اللہ شوق کے تذکرہ طبقات الشعراء سے یہ رائے بھی
نقل کی ہے:

"میر گویند اول قصیدہ طرز ایہام گوئی را ترک نمودہ ریختہ را در زبان اردوئے
معلیٰ شاہجہان آباد کہ الحال پسند عناصر عوام و خواص گردید مروج ساخت زبدۃ
العارفین، قدوۃ الواصلین، واقفِ رموز جناب اکبر کاشفِ کنوز طریقہ پیغمبر، میرزا
جان جاناں متخلص بہ مظہر مرد است فرشتہ صفت۔"

مرزا مظہر جان جاناں نے دیوان فارسی میں جو دیباچہ لکھا۔ اس سے شعر کے بارے میں ان کا
رویہ پر بھی روشنی پڑتی ہے:

"عہد جوانی میں شورِ عشق کی تحریک پر کہ جو جوانی کے خمیر کا نمک ہے،
نالہ ہائے موزوں کیے تھے۔ اس لیے شاعری میں میرا نام آگیا۔" [37]

مرزا مظہر کا بہت تھوڑا کلام دستیاب ہے اور جو گنتی کے اردو اشعار ہیں ان میں یہ
زندہ شعر بھی شامل ہے:

خدا کے واسطے اس کو نہ ٹوکو
یہی اک شہر میں قاتل رہا ہے

ایہام کے خلاف اگر کوئی شاعر اپنی ذات میں تحریک ثابت ہوا تو یہ شیخ ظہور الدین حاتم (وفات ۱۱۹۷ھ) ہے:

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بس کہ بے تلاش
حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پہ نگاہ

بقول سید محی الدین قادری زور حاتم نے ۱۱۲۸ھ میں شاعری شروع کی۔[۴۸] یہ فرخ سیر کا دور تھا۔ حاتم کے تاریخی نام ظہور کے مطابق تاریخ پیدائش ۱۱۱۱ھ بنتی ہے۔ شاہجہان آباد میں ولادت ہوئی۔ اگرچہ زمانے کی روش کے مطابق حاتم نے بھی ایہام کے اشعار کہے۔ ویسے بھی پُرگو تھے۔ ۱۱۴۴ھ کے لگ بھگ دیوان مرتب ہوگیا۔ اپنے وقت کے مقبول شعراء اور اساتذہ میں شمار ہوتے تھے۔ ان کے نامور شاگردوں میں سودا سرفہرست ہے۔ اس عہد کے لحاظ سے دیکھیں تو معاصرین کے مقابلے میں حاتم کی تنقیدی حس خاصی تیز تھی۔ اور ان کا لسانی شعور صحت مند بنیادوں پر استوار تھا۔ جبھی تو یہ کہا:

کئی دیوان کہہ چکا حاتم!
اب تلک پر زباں نہیں ہے درست

۱۱۴۲ھ میں یہ قطعہ کہا:

کوئی سخن کو میرے لاتا ہی نہیں خاطر میں
واسطہ یہ ہے کہ سب ہیں میرے اشعار غلط
سرِ دیوان پہ حاتم کے بجا ہے کہ لکھو
نسخۂ معتبر خوش خط و بسیار غلط

حاتم کو معاصرین کے مقابلے میں کہیں پہلے اصلاحِ زبان کی ضرورت اور اہمیت اور ایہام کے

نقصانات کا احساس ہوگیا۔ ۱۱۴۰ھ سے قبل پہلا دیوان، ۱۱۶۰ھ میں دوسرا دیوان مکمل کیا۔ دیوان
کی پختہ عمر میں بہت کچھ کہہ چکنے کے بعد انہوں نے اردو شاعری میں اپنی نوعیت کا واحد کارنامہ
جس کی نظیر صرف غالب کے ہاں ملتی ہے۔ یعنی اپنے کلام میں سے کمزور اشعار خارج کرکے
منتخب اشعار پہ مبنی انتخاب مرتب کیا۔ بقول ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار:

"حاتم نے ۱۱۶۸ھ میں (عہد عزیزالدین عالمگیر ثانی) میں دیوان زادہ کی ترتیب
کا بیڑا اٹھایا۔ دیوان قدیم سے غزلیات کا انتخاب کیا۔ زبان و بیان میں بہت سی
تبدیلیاں کیں اور مذاق جدید کی غزلیات کو اس میں شامل کرکے نو مرتبہ مجموعہ کا
نام دیوان زادہ رکھا۔ دیوان زادہ میں اوزان و بحور کے علاوہ ہر غزل کی سرخی
میں سنہ تخلیق اور قسم (طرحی، فرمائشی، جوابی) کا اندراج کرکے حاتم نے اپنی
جدت طبع کا ثبوت دیا۔ ادبی ولسانی نقطۂ نظر سے ان کی یہ جدت قابلِ داد ہے۔
آج اس کے ذریعے ہم اس دور کے ادبی رجحانات اور لسانی تغیرات کو بخوبی سمجھ
سکتے ہیں۔ خود شاہ حاتم نے بھی دیوان زادہ کا دیباچہ لکھ کر ان رجحانات اور
تغیرات کے بارے میں اپنا نقطۂ نظر واضح کر دیا ہے۔ تنقیدی، تحقیقی، لسانی
اعتبار سے یہ نثری دیباچہ بھی حاتم کی تصنیفات میں بہت اہم ہے۔ دیوان زادہ کی
تدوین ۱۱۶۹ھ میں مکمل ہوئی۔"[۳۹]

۱۲۰۷ھ میں وفات پائی۔

حاتم نے خود بھی ایہام ترک کیا اور شاگردوں کو بھی باز رکھا۔ یوں معاصر شاعرانہ رویہ کی
تبدیلی لانے کا باعث بنے۔ حاتم نے کہا تھا:

رختہ کے فن میں ہیں شاگرد حاتم کے بہت

لیکن ان شاگردوں میں سے یہ بہت نامور ہوئے۔ مرزا رفیع سودا، عبدالحئی تاباں، مرزا
سلیمان شکوہ، سعادت یار خاں رنگین اور مرزا عظیم بیگ عظیم۔ ان شاگردوں نے نہ صرف یہ کہ حاتم

کی صاف گوئی کو شعار شعر جانا بلکہ ایہام کے خلاف اپنے ردعمل کا اظہار بھی کیا۔ بقول سودا:

یک رنگ ہوں آتی نہیں ہے خوش مجھے دورنگی

منکر سخن و شعر میں ایہام کا ہوں میں

اگرچہ درد حاتم کے شاگرد نہ تھے لیکن وہ بھی یہ کہتے ہیں:

از بسکہ ہم نے حرف دوئی کا مٹا دیا

اے درد اپنے وقت میں ایہام رہ گیا

اور بقول میر تقی میر:

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میرؔ کے

کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

ہمارے بیشتر ناقدین نے کسی نہ کسی صورت میں ایہام کی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی اسے "اردو شاعری کی ادبی تحریک" قرار دیتے ہیں[۲۹] تو ڈاکٹر ملک حسن اختر نے اپنی کتاب کا نام ہی "اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" رکھا ہے۔ ڈاکٹر محمد حسن اور بعض دیگر ناقدین نے ایہام کے لسانی فوائد بھی گنوائے ہیں۔ کوئی تحریک خواہ کتنی ہی توانا یا مقبول کیوں نہ ہو، ایک وقت آتا ہے کہ جب وہ عصری تقاضوں کے تحت بدلتے تخلیقی معیار کا ساتھ نہیں دے پاتی۔ چنانچہ اس کے خلاف ردعمل شروع ہو جاتا ہے۔ یہی ایہام کے ساتھ بھی ہوا۔ بلکہ ردعمل کا آغاز کرنے والے بھی وہی حضرات تھے جو ابتدا میں خود ہی حامی تھے۔ یعنی آرزو، مظہر اور حاتم ان میں سے اول الذکر دونوں کا اردو کلام تو خیر تبرک ہے لیکن حاتم نے بھرپور ردعمل کا اظہار کیا۔

اگرچہ کسی انداز سخن کے بارے میں قطعی طور سے یہ کہنا ممکن نہیں ہوتا کہ یہ کب ختم ہوا اور ایہام کا بھی یہی حال ہے۔ تاہم حاتم کے ۴۶ء میں لکھے گئے اس شعر:

کہتا ہے صاف و شستہ لب کہ ہے تلاش
حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پہ نگاہ

اور ۱۷۴۸ء کے اس شعر:

ان دنوں سب کو ہوا صاف گوئی کا تلاش
نام کو چرچا نہیں حاتم کہیں ایہام کا

سے یہ استدلال کیا جاسکتا ہے کہ ان برسوں سے ہی ردعمل کا آغاز ہوا ہوگا۔ یہ اتفاق ہے کہ حاتم کی غزلوں پر سن تخلیق درج ہوتا ہے۔ اس لیے صرف حاتم کی حد تک تو قطعیت سے بات کی جاسکتی ہے لیکن دیگر شعرا کے مقابلہ میں ایسا نہیں۔ اب یہ اکیڈمک سی بات ہے کہ ردعمل کس سن میں شروع ہوا۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جب ردِ عمل شروع ہوا تو بھرپور [illegible] ہوا۔ ادھر دہلی کے ادبی افق پہ میرؔ، سوداؔ اور دردؔ جیسے قدآور شعراء کے ظہور نے اس ردعمل میں مزید شدت پیدا کردی۔ اور یوں ایہام بطور تحریک ختم ہوگیا۔ بطور ایک شعری صنعت اب بھی موجود ہے۔

دخیل الفاظ

"غریب رشتے دار":

رئیس کے غریب رشتے دار گھر آئیں تو انہیں گھر سے نکالا نہیں جاتا۔ کھانا وانا بھی پوچھا جاتا ہے۔ تاہم بحیثیت مجموعی ان سے جو سلوک ہوتا ہے اس کو کم از کم حسنِ سلوک تو قرار نہیں دیا جا سکتا۔ کچھ ایسا ہی سلوک زبان کے طہارت پسند مصلحین ان الفاظ سے روا رکھتے ہیں، جنہیں کبھی "غریب الفاظ" کہا جاتا ہے تو کبھی دخیل۔ یعنی دوسری زبانوں کے ایسے الفاظ جو شاملِ زبان ہونے کے باوجود زبان کا حصہ نہیں بن پاتے۔ بنیادی وجہ یہی ہوتی ہے کہ عوام سند قبول نہیں

دیتے اور دوسری یہ کہ تخلیقی اظہار کے لیے پسندیدہ نہیں سمجھے جاتے۔

جب کبھی بھی اصلاحِ زبان کی بات ہوتی ہے تو یہ مسئلہ چھڑ جاتا ہے۔ دیکھا جائے تو یہ مسئلہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی کہ شمالی ہند میں اردو زبان کی تخلیقی عمر۔ دراصل جب فارسی گو بزرگوں نے اردو غزل سے تخلیقی دلچسپی کا اظہار کیا تو دو رجحانات نمایاں ہو گئے۔ ایک فارسی محاورات ضرب الامثال کے تراجم اور دوسرے ہندی زبان کے دکھنی آہنگ کو ختم کرنے کے لیے ہندی الفاظ کا اخراج۔ اس مقصد کے لیے اردو کو مُفرّس اور معرّب بنانا اور اس عمل کو اصلاحِ زبان، زبان کی صفائی اور زبان کا مانجنا جیسے الفاظ سے موسوم کرنا۔ دیکھا جائے تو یہی رویہ شدید صورت اختیار کر کے متروکات کا محرک بنا گویا معیارِ فصاحت زبان سے ہندی الفاظ یا اسی نوع کے مقامی الفاظ کا اخراج اور اردو کو مُفرّس بنانا قرار پایا۔

اصلاحِ زبان کے سلسلے میں خان آرزو کا تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ دیکھیے آج سے تین صدیاں قبل انھوں نے کیا پتے کی بات کہی تھی۔ بقول ڈاکٹر سید عبداللہ:

> "دخیل الفاظ کے تلفظ اور املا کے سلسلے میں ان کی رائے یہ ہے کہ اس معاملے میں لفظ کی وہ صورت (مکتوبی یا ملفوظی) اختیار کی جائے جو اہلِ زبان (عوام اور خواص) دونوں میں رواج پذیر ہو چکی ہو۔ ایسے لفظوں کے لیے اصل زبان کی پیروی ضروری نہیں۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ نئی زبان میں اس کی وہ صورت سامنے رہنی چاہیے جو صرف عوام ہی میں مروج نہ ہو بلکہ عام و خاص سب کے نزدیک مسلّم ہو چکی ہو۔"[۱۱]

آج جب ڈاکٹر مسعود حسین خاں، ڈاکٹر شوکت سبزواری، ڈاکٹر سہیل بخاری جیسے لسانی ماہرین کی کتابیں دیکھتے ہیں تو اندازہ ہو جاتا ہے کہ جسے اردو کہتے ہیں اس نام کی کوئی زبان اپنی انفرادی، غیر آمیز اور خالص حالت میں نہیں ملتی۔ اس کا ابتدائی ذخیرہ الفاظ مثلاً آریائی، سنسکرت، ہندی اور مقامی زبانوں پر مشتمل تھا۔ مسلمان آئے تو اسلام کی بنا پر عربی اور ثقافت کی بنا پر فارسی اور

ترکی الفاظ کا اضافہ ہوگیا۔ مغربی اقوام کی آمد سے انگریزی پرتگالی اور فرانسیسی الفاظ کی شمولیت کا آغاز ہوا۔ انگریز حکمران تھا لہذا انگریزی کا اثر ہونا لازم تھا۔ اب ہم سیاسی اور اقتصادی طور پر امریکہ کے زیر اثر ہیں۔ لہذا اب اردو میں امریکن سلینگ کی شمولیت ہورہی ہے۔ تو نام اردو کہاں ہے؟

گذشتہ چالیس برس میں پاکستان کی دوسری زبانوں یعنی پنجابی، سندھی، پشتو اور بلوچی کے متعدد الفاظ بھی شامل زبان ہو چکے ہیں اور اس عمل میں مزید تیز رفتاری کا امکان ہے تو پھر اصل اردو زبان کہاں ہے؟ یوں دیکھیں تو اردو کا سارا ذخیرۂ الفاظ ہی دخیل یا غریب اور پنڈت کیفی کے بموجب "نیم الفاظ" پر مشتمل ہے۔ دراصل اردو کا یہ مسئلہ نہیں ہونا چاہیئے کہ اس میں کون سا لفظ دخیل ہے۔ کون سا غریب اور کون سا اجنبی۔ یہ بحث اس زبان کے بارے میں کی جاتی ہے جس کا طرۂ امتیاز ہی یہ ہے کہ اس میں ہر زبان کے الفاظ کھپا کر انہیں ان کے لہجے میں ادا کرنے اور املا میں لکھنے کی صلاحیت حاصل ہے۔

اصلاحِ زبان کے نام پر اردو کو مُفرّس اور معرّب بنانا دہلی اور لکھنو کے اہل زبان کی ثقافتی مجبوری تھی۔ اس لیے پہلے دہلی والوں نے خود کو دکن سے ممتاز رکھنے کے لیے اور پھر اہلِ لکھنو نے اہل دلی سے منفرد رکھنے کے لیے اصلاح زبان کی جو سعی کی اسے اب محض لسانیات کی کتابوں تک محدود رہنا چاہیئے۔ اسے اس مثال سے سمجھیئے کہ متروکات کے نام پر اگرچہ لاتعداد الفاظ غیر شاعرانہ قرار پائے۔ مگر اس سعی کی ناکامی اس امر میں مضمر ہے کہ وہ تمام متروکات میر اور سودا جیسے شعراء کے کلام کے سبب آج بھی زندہ ہیں تو کیا اِن الفاظ کے متروک قرار دیئے جانے کی بنا پر وہ اشعار بھی متروک ہو گئے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو پھر متروکات کا عمل ہمہ جہتی کے برعکس یک جہتی ثابت ہوتا ہے۔

آج ہمارے لیے اصلاحِ زبان اس لیے بھی مسئلہ نہ ہونی چاہیئے کہ اب دہلی اور لکھنو کی سند نامعتبر ہے کہ خود دہلی اور لکھنو میں اتنی ہی غلط اردو بولی جارہی ہے جتنی کہ بمبئی، مدراس یا

پاکستان میں اردو کو اب اگر نیا خون مل سکتا ہے تو اسے مُفرّس یا معرّب بنانے
کے بجائے مقامی یعنی صوبائی زبانوں سے نئے، خوب صورت، خوش آہنگ اور پر معنی الفاظ کی شمولیت
سے اردو کی تخلیقی توانائی میں مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ چند برس پیشتر اشفاق احمد اور ان
کے رفقاء نے "اردو کے خوابیدہ الفاظ" کے نام سے ایک چھوٹی سی کتاب مرتب کی۔ جو ان
الفاظ پر مشتمل ہے جو بظاہر سندھی اور پنجابی معلوم ہوتے ہیں لیکن ہیں درحقیقت اُردو کے۔ اشفاق احمد
کے بقول:

"اردو تحریر و تقریر میں تو اب کم استعمال ہوتے ہیں لیکن پاکستان
کی علاقائی زبانوں میں اظہار کا اہم حصّہ ہیں۔ ان الفاظ نے خدا جانے کب اور
کس وجہ سے اپنی حرکی قوت کھو دی کہ انہیں لغت کے اوراق میں روپوش
ہونا پڑا۔ اور ان کی روپوشی کے بعد کوئی انہیں اپنے بیان کی داستان سرائے
میں واپس نہ لا سکا۔ الفاظ خوابیدہ ضرور ہیں متروک نہیں۔ کیونکہ ایک تو علاقائی
زبانوں میں ان کے روزہ استعمال نے زندہ رکھا ہے۔ دوسرے اردو کے
مستعمل محاوروں اور ضرب المثلوں میں گاہے بگاہے ان سے ملاقات ہوتی رہتی
ہے۔ اردو میں ایسے الفاظ کی موجودگی اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ یہ زبان
اپنی گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے ایک وسیع اور ہمہ گیر زبان ہے اور اس میں
اظہارِ بیان، معنی و مطالب کے نازک اور لطیف پہلوؤں کے لیے ہر طرح کا لفظ
موجود ہے۔"

اس لیے آج طہارت پسندی کے نام پر زبان کو مُفرّس اور معرّب بنانے کی ضرورت نہیں
اور پھر اس ضمن میں یہ منطقی تضاد فراموش نہ کیا جائے کہ اب فارسی بھی غیر ملکی زبان ہے۔ جس
قاعدہ کی رو سے انگریزی یا دیگر زبانوں کے الفاظ غریب اور دخیل اور متروک قرار دیئے جاتے
ہیں انہی کی رو سے فارسی کے الفاظ بھی دخیل ہی قرار پاتے ہیں۔ رہی تلفظ کی جمالیات کی بات

تو لفظ کی جمالیات حسنِ استعمال میں مضمر ہے۔ اناڑی شاعر اپنے پھوہڑپن سے خوبصورت سے خوبصورت
صورت لفظ کا حلیہ بگاڑ دے گا جبکہ تخلیقی صلاحیتوں کا حامل شاعر تمام الفاظ بلکہ
لفظ بھی حسنِ استعمال سے حسین بنا دیتا ہے۔ لفظوں کی چھانٹی کا عمل غیر لسانی ہے۔
یہی ہے کہ اب متروک الفاظ، رذیل الفاظ اور غریب الفاظ جیسی اصطلاحات سے
کہ اصلاحِ زبان کے نام پہ ان سب کے استعمال کو متروک قرار دیا جانا چاہیے۔

انشاء اللہ خاں انشاء نے دریائے لطافت میں جو لسانی اصول بنایا تھا اس کی اہمیت
بدن اجاگر ہوتی گئی۔ ناسخ کے لکھنو میں انشاء نے یہ لکھا:

"جو لفظ اردو میں مشہور اور مستعمل ہو گیا، خواہ عربی ہو یا فارسی، ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اپنے اصل کی رو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ بہر حال اردو ہے۔ اگر اصل کے موافق مستعمل ہو تو صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہو تو بھی صحیح۔ اس کا غلط و صحیح ہونا اردو کے استعمال پر منحصر ہے۔ اس لیے کہ جو لفظ اردو کے مزاج کے موافق نہیں ہے۔ خواہ اصل کے لحاظ سے درست کیوں نہ ہو اور جو چیز اردو کے مزاج کے موافق ہے وہ صحیح ہے، خواہ اصل کے لحاظ سے غلط کیوں نہ ہو۔"

ادھر مولانا صلاح الدین احمد نے بھی کچھ ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا:

"زبان اور محبت پہ آج تک کوئی بند باندھا نہیں جا سکتا۔ بس کچھ بنیادی اصولوں اور کیفیتوں کے سوا جو ہماری زبان کے قواعد اور مزاج سے خاص ہیں۔ ہمیں زبان کے فروغ اور توسیع پر ہرگز کوئی قید نہیں لگانی چاہیئے۔ جو اسالیب اور جو الفاظ اور جو تراکیب زندگی کے تقاضوں سے اس میں داخل ہوں گے۔ اگر وہ اس کے کوائف اور اس کے مزاج کے مطابق

ہوں گے تو ان میں سما جائیں گے۔ ورنہ اسی خاموشی سے نکل جائیں گے، جس خاموشی سے وہ اس میں داخل ہوئے ہوں گے۔" [42]

اردو جیسی پر تنوع اور خوش منظر زبان کے لیے اس کو زریں اصول قرار دیا جا سکتا ہے:

تو ہی ناداں چند کلیوں پر قناعت کر گیا

حواشی

۱. آرنگ، سید انور حسین "نظام اردو" ص: ۵۴

۲. خورشید لکھنوی "افادات" ص: ۳۷

۳. بعض ناقدین اُسے درست تسلیم نہیں کرتے۔ کچھ کے نزدیک (ابواللیث صدیقی) وہ صرف ایک مرتبہ ۱۱۱۰ھ میں آئے۔ بعض کے نزدیک وہ خود نہیں آئے بلکہ دیوان آیا۔ اسی طرح بعض محققین شیخ سعداللہ گلشن سے ملاقات کو بھی درست تسلیم نہیں کرتے۔

۴. "افاداتِ سلیم" ص: ۴۹

۵. "افاداتِ سلیم" ص: ۴۸

۶. "مقدمہ نوادر الالفاظ" ص: ۱۵

۷. ایضاً ص: ۲۵

۸. ایضاً ص: ۲۸

۹. "آبِ حیات" ص: ۱۱۲ - ۱۱۱

۱۰. ایضاً ص: ۱۰۳

۱۱۔ "مرزا مظہر جان جاناں" (ان کا عہد اور اردو شاعری) ص : ۱۱۲

۱۲۔ حسرت کے بقول "اساتذہ میں سب سے پہلے شاہ حاتم نے اصلاح زبان کی جانب توجہ دی اور
بعض ناگوار الفاظ کو متروک قرار دیا۔" "نکات سخن" ص : ۹

۱۳۔ "آب بقا" ص : ۱۹۲ (بحوالہ "تلامذۂ میر" ص : ۷۲، ۷۱)

۱۴۔ "منشورات" طبع چہارم ص : ۱۲۶

۱۵۔ "نظام اردو" ص : ۵۹، ۵۷

۱۶۔ "منشورات" ص : ۱۲۷

۱۷۔ "نکات سخن" ص : ۲۸

۱۸۔ بحوالہ مقالہ "باغ و بہار کے قدیم اور نایاب نسخے" از ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری مطبوعہ "صحیفہ لاہور
آزادی نمبر جولائی اگست ۱۹۸۸ء

۱۹۔ "منشورات" ص : ۶۶

۲۰۔ یہ انگریزی لفظ FARE/FAIR تو نہیں ہو سکتے۔ میرے خیال میں FIRE ہے۔ اے
عوامی تلفظ کے مطابق فیر باندھ دیا۔ اس غزل کے دیگر قوافی دَیر اور خَیر ہیں۔

۲۱۔ بحوالہ "کلیات ناسخ" جلد اول مقدمہ یونس جاوید ص : ۴۲
صغیر بلگرامی کے بارے مزید معلومات کے لیے ملاحظہ کیجئے "غالب اور صغیر بلگرامی" از مشفق خواجہ کراچی ۱۹۸۱

۲۲۔ حسرت نے عرش کو ناسخ کا شاگرد لکھا ہے۔ جبکہ معاملہ برعکس تھا۔ یعنی "عرش سے ناسخ استفادہ کرتے
تھے۔ اور عرش کو استاد کہا کرتے تھے۔ اور ان ہی کے صلاح و مشورے سے ناسخ زبان میں ترمیم و
تنسیخ کرتے تھے۔ ناسخ کے بعض شاگردوں نے مشہور ہی نہیں کیا بلکہ "سراپا سخن" کے مؤلف سید محسن علی
محسن نے اپنے اس تذکرہ میں عرش کو ناسخ کا شاگرد لکھ دیا۔" (آب بقا ص : ۲۷) "اس پر دونوں
میں ٹھن گئی۔ ملاحظہ کیجئے "تلامذۂ میر" از امداد صابری ص : ۶۹

۲۳ "نگار پاکستان" کراچی جولائی ۸۸ ۱۹ء

۲۴. "منشورات" ص: ۱۲۸

۲۵. کیا میر کے اس شعر کا جواب ممکن ہے؛

گلشن میں آگ لگ رہی تھی رنگ گل سے میر

بلبل پکاری دیکھ کر، صاحب پرے پرے (حاشیہ از راقم)

۲۶. "تنقیدات عبدالحق" ص: ۱۹۶، ۱۹۷

۲۷. "منشورات" ص: ۱۴۳

۲۸. "اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" ص: ۱۲۲

۲۹. خدیجہ شجاعت علی، ترجمہ سہل "حدائق البلاغت" ص ۸۹

۳۰. "تاریخ ادب اردو" جلد دوم، حصہ اوّل ص: ۱۹۲

۳۱. "اردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" ص: ۱۲۵

۳۲. "تاریخ ادب، اردو" جلد دوم حصہ اوّل ص: ۱۴۸

۳۳. ایضاً ص: ۱۵۴

۳۴. ایضاً ص: ۱۶۳

۳۵. ؎ ان دنوں سب کو ہوا ہے صاف گوئی کا تلاش

نام کو چرچا نہیں حاتم کہیں ایہام کا

۳۶. "مرزا مظہر جان جاناں (ان کا عہد اور شاعری)" ص: ۱۱۶

۳۷. ایضاً ص: ۱۳۳

۳۸. "سرگذشتِ حاتم" ص: ۲۲

۳۹. "دیوان زادہ" ص: ۱۷، ۱۸

۴۰. تاریخ ادب "اردو جلد دوم حصہ اول ص: ۱۹۰

۴۱۔ "نوادرالالفاظ" مقدمہ ص: ۳۷

۴۲۔ "اوراق" شمارہ نمبر۳ نومبر ۱۹۶۸ء

اسی شمارے میں "اردو میں انگریزی الفاظ کی آمیزش کا مسئلہ" پہ بحث شائع کی گئی۔ محرک بحث مشتاق قمر، شرکائے بحث ڈاکٹر عبادت بریلوی، ڈاکٹر عبدالسلام خورشید، جمیل ملک، سلیم اختر، انور سدید، ناصر شہزاد اور جمیل آذر۔ بحث کا تعارف: ڈاکٹر وزیر آغا۔

۵۔ اُردُو رسمُ الخط

انسانی ذہن کی یہ عجب خوبی (یا خامی) ہے کہ وہ مجرّد کا بصورت مجرّد تصور نہیں کر سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ مجرّد کو پیکر عطا کرنے کے لیے سعی کناں رہتا ہے۔ اس حد تک کہ حقیقت کو بھی لباسِ مجاز میں دیکھنے کی تمنا کرتا ہے اور مشاہدۂ حق کی گفتگو بادہ و ساغر کے حوالے سے ہوتی ہے۔ انسانی ذہن کی اس خاصیت نے اساطیر کی صورت میں مذاہب کے اولین روپ سے انسانیت کو روشناس کرایا اور دیوی دیوتاؤں کے پیکر میں انسانی تخیل کے لطیف ترین گوشوں کے ساتھ ساتھ حواسِ خمسہ کو بھی تسکین پہنچائی۔ مجرّد کی مجرّد روپ میں تفہیم و تحلیل اور اس کی جملہ خصوصیات کا احاطہ کرنا انسانی ذہن کے لیے ہفت خواں طے کرنے کے مترادف رہا ہے۔ ابلاغ کا بھی یہی حال ہے کہ خیالات کے اصوات سے ادا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جو بہت مشکل ہے۔ اسی لیے صوت کو حرف کے پیکر میں مقید کرنے کی کوشش میں اگر ایک طرف الفاظ کے متنوع روپ معرضِ وجود میں آئے تو دوسری طرف مجرّد کی توضیح کے لیے تشبیہات، استعارے اور صنعتیں وضع کی گئیں۔ اس لیے کہ مجرّد تصورات کا اصوات کے مجرّد سلسلوں سے ابلاغ بہت کٹھن ہے۔ حروف اور پھر ان کی باہم پیوستگی سے جنم لینے والے الفاظ درحقیقت اصوات کے لیے وضع کی گئی مختصر ترین علامات کے مربوط سلسلے ہیں فنِ تحریر یا رسم الخط کا بھی یہی محرک ہے کہ انسان مجرّد کو صوری پیکر عطا کرنے کا خواہاں رہتا ہے۔

یہ بے حد اہم تاریخی سوال ہے کہ رسم الخط کیسے وجود میں آگیا۔ اس کی تشکیل کرنے والے مختلف

حروف کی صورت کیسے متعین کی گئی۔ مختلف زبانوں کے رسم الخط میں جو صوری مغائرت تفراق ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ حروف کی تعداد ہر زبان میں کیوں معین نہیں؛ بعض زبانیں دائیں سے بائیں جانب اور بعض بائیں سے دائیں جانب جبکہ بعض اوپر سے نیچے لکھی جاتی ہیں۔ ان کا کیا باعث ہے۔ الغرض حرف، لفظ اور ان سے جنم لینے والے رسم الخط کا مطالعہ اب اتنا وسیع ہے کہ یہ محض لسانیات تک محدود نہیں رہا بلکہ اس میں اساطیر، قدیم تاریخ، علم الانسان اور تہذیب و ثقافت اساسی ماخذ کی صورت اختیار کر چکے ہیں۔ اس حد تک کہ کسی بھی رسم الخط کے آغاز اور تشکیل کا مطالعہ ان کے تناظر کے بغیر ناممکن ہے۔

فن تحریر: دیوتاؤں کی عطا

باب اول میں زبان کی ماہیت پہ بحث کرتے ہوئے ذکر کیا گیا تھا کہ زبانوں کو عطیہ ربانی اور دیوتاؤں کا تحفہ سمجھا جاتا تھا۔ کچھ یہی حال رسم الخط کا بھی ہے۔ دراصل زمانہ قبل تاریخ کے انسان کے لیے بعض نعمتوں کی حقیقت کو سمجھنا بے حد دشوار تھا۔ اس لیے بہ بنائے عقیدت انہیں دیوتاؤں کے کرم دیویوں کی عطا اور آسمانی تحائف قرار دے دیا جاتا تھا۔ جیسے یونانی اساطیر میں پرومیتھیس[1] (PROMETHEUS) کی اسطور ہے جس نے دیوتاؤں سے آگ چرا کر انسان کی بھلائی کی اور اس جرم کی پاداش میں کڑی سزا پائی۔ اسی طرح آلام و مصائب آفات و ابتلا بھی دیوتاؤں دیویوں کے غیض و غضب کا نتیجہ سمجھی جاتی تھیں۔ جیسے صندوق میں بند بیماریاں اور تکالیف پنڈورا کے تجسس کی وجہ سے آزاد ہو کر انسانوں پہ مسلط ہو گئیں۔

رسم الخط کا بھی یہی حال ہے۔ دنیا کی بیشتر قدیم تہذیبوں میں زبانوں کی مانند رسم الخط کی شروعات بھی اساطیری ہیں۔ اس ضمن میں مشرق اور مغرب کی تخصیص نہیں بیشتر ممالک کی اساطیر میں ایسے دیوتا یا دیویاں ملتی ہیں جنہوں نے انسانوں کو لکھنا سکھایا۔ اس اندازِ نظر کی دد

وجوہات ہو سکتی ہیں۔ ایک تو وہی کہ ہر اچھی بُری اور ناقابلِ فہم چیز کا دیوتاؤں سے منسوب کیا جانا۔ دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ قدیم زمانہ میں تعلیم عام نہ تھی اور لکھنا پڑھنا صرف پجاریوں، پروہتوں، کاہنوں، نجومیوں اور شعراء کے ساتھ ساتھ حکمرانوں تک محدود ہوتا تھا۔ جو عام لوگوں کو خاصے پُراسرار اور بعض صورتوں میں محیرالعقول نظر آتے ہوں گے۔ ان کی قوت زباندانی میں مضمر تھی، جس کا اظہار ان کی تقریر اور تحریر سے ہوتا تھا۔ لہٰذا عام لوگوں کا تحریر کو پُراسرار، طلسمی یا متبرک سمجھتے ہوئے اسے دیوتاؤں سے منسوب کرنا قرینِ قیاس ہے۔ اساطیر اور لفظ کا تعلق کتنا گہرا ہے اس کا اندازہ صرف اس مثال سے لگایا جا سکتا ہے کہ اساطیر جس یونانی لفظ MYTHOLOGY کا ترجمہ ہے۔ اس میں MYTHOS کا مطلب منہ سے ادا کیا گیا لفظ یا بات تھی۔

مصری اساطیر میں انسانی دھڑ پہ "IBIS" کا سر رکھنے والے دیوتا[2] "THOTH" نے مصریوں کو ہیروغلافی سکھلائی تھی۔ اس دیوتا کا ایک اور نام "TEHUTI" بھی ملتا ہے۔ عقل اور دانش کا یہ عظیم دیوتا محافظِ کتب اور ستاروں کا حال جاننے والا بھی تھا۔ یہ دیوتاؤں کا کاتب بھی تھا اور بالخصوص "OSIRIS" کے فیصلے بھی قلمبند کرتا تھا۔ جادو اور اس سے وابستہ تمام اسرار بھی اسی دیوتا سے منسوب کیے جاتے۔ تہوت کے ساتھ فنِ تحریر کی دیوی کی حیثیت سے "SELAET" کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ مصری اساطیر میں اس کا مقام یونانی "میوز" سے مماثل سمجھا جا سکتا ہے۔

مصری اساطیر کی قدامت کا تعین ممکن نہیں تاہم اتنا طے ہے کہ یہ کم از کم تین ہزار سال قبل مسیح میں موجود تھیں بابلی اساطیر میں بھی "EA" نام کا دیوتا ملتا ہے جس کا مسکن سمندر اور دلدل تھی۔ اس کی عبادت پرشین گلف کے ساحل پہ آباد "ERIDU" میں کی جاتی تھی اسے قانون اور جیومیٹری کا علم تھا اور اس نے اپنے پیروکاروں کو فنِ تحریر سکھایا۔ اس دیوتا کا بالائی دھڑ باریش مرد کا تھا جبکہ پانی سے تعلق کے اظہار کے لیے زیریں حصہ مچھلی کی دم کا ہوتا تھا۔

قدیم فرانس (GAUL) میں "OGMIOS" دیوتا کو فن تقریر میں مہارت کی بنا پر اگر ایک طرف روم کے دیوتا MERCURY سے مشابہ قرار دیا جاتا ہے تو آئرلینڈ کی اساطیر میں فصاحت و بلاغت اور شاعری کا دیوتا "OGMA" بھی یہی ہے۔ "OGHAM - AL - PHABET" کا موجد بھی یہی تھا جو CELTIC کی ابتدائی صورت تھی۔ ٹیوٹونک (ناروے سویڈن) اساطیر میں آوڈن (ODIN) برتر دیوتا تھا اسے WODEN یا WOTAN کے نام سے بھی پکارا جاتا رہا ہے۔ یہ بے حد دانشمند اور زیرک دیوتا تھا۔ اسے جادو سے بھی واقفیت تھی "RUNES" پر بھی حاوی تھا (قدیم سکنڈے نیویا میں تحریر کی ابتدائی صورت) یہ سب کچھ یوں ممکن ہوا کہ اس نے CAULDRON - ODHRERIR' (اسے آب حیات سے مشابہ سمجھا جا سکتا ہے) سے اپنی تشنگی بجھائی تھی۔ جس کے نتیجے میں وہ مافوق الفطرت علم پر حاوی ہو گیا۔ زیوس کی مانند یہ بھی دیوتاؤں کا دیوتا اور آسمانوں کا مالک تھا۔ اس کے کندھے پر RAVEN بیٹھے رہتے تھے۔ ایک کا نام یادداشت (MUNIN) تھا اور دوسرے کا نام سوچ (HUGIN) تھا۔ یہ سارا دن اڑتے رہتے اور اسے دنیا بھر کی خبریں لا کر دیتے۔ اس نے علم کیسے حاصل کیا (اس کے بارے میں ایک اور اسطور بھی ملتی ہے۔ جس کا مطالعہ خالی از دلچسپی نہیں، حصول علم کے لیے یہ چاہ دانش پر گیا۔ جہاں کا محافظ دانشمند (MIMIR) تھا۔ اور اس سے اپنی تشنگی بجھانے کی درخواست کی۔ جس پر دانشمند محافظ نے معاوضے میں ایک آنکھ طلب کی۔ آوڈن نے یہ شرط مان لی اور ایک آنکھ کی قیمت دے کر "RUNES" کا علم حاصل کر لیا۔ یہ پر اسرار اور طلسمی تحریر تھی جس کے علم سے یہ پر قوت اور پر شکوہ ہوا۔ اتنی مہنگی قیمت ادا کر کے حاصل کیا گیا علم تحریر آوڈن نے انسانوں کو بھی سکھا دیا تاکہ وہ بھی اس دنیا میں محفوظ زندگی بسر کر سکیں۔ اس اسطور کے معنی بہت واضح ہیں۔ یعنی حصول علم آسان نہیں اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قیمت بھی کم ہے۔ جب علم حاصل ہو جائے تو اسے خود تک محدود نہیں رکھنا چاہیے بلکہ بنی نوع انسان کے کام میں لانا چاہیے۔

ہندوستان میں رسم الخط کی ایجاد برہما کی دھرم پتنی سرسوتی سے منسوب ہے جو دانش و
علت زبان اور موسیقی کی سرپرست دیوی ہے۔ واضح رہے کہ قدیم دور میں ایک رسم الخط
براہمی تھا جو براہما کے نام پر ہے۔ چنانچہ دلیپ اندر ناتھ شرما نے اپنی کتاب بھاشا وگیان
کی بھومیکا میں لکھا ہے:

"براہمی کو براہما کی تخلیق یا ایجاد کہا جاتا ہے۔ اور سنسکرت میں بھاشا
کے لیے بھی براہمی کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ کیونکہ زبان کو بھی خدا کی دین کہا
جاتا ہے۔ اس کو برہمنوں کی تخلیق بھی کہا جاتا ہے۔"[؎]

ہندوستان میں رسم الخط کی ایجاد قدیم تاریخ کے دھندلکوں میں گم ہے۔ سنسکرت میں
اس کو دیوناگری (دیوتا کی تحریر) کہا جاتا تھا اور یہ بھی اساطیری تلازمہ ہے۔ البیرونی نے
"کتاب الہند" میں ہندوؤں کے علوم و فنون کے بارے میں لکھتے ہوئے ان کے رسم الخط کے
بارے میں یوں لکھا:

"کہا جاتا ہے کہ ہندوؤں کا رسم الخط مٹ گیا تھا۔ لوگ اسے بھول گئے
تھے اور کوئی اس کی طرف توجہ نہیں دیتا تھا۔ یہاں تک کہ لوگ ان پڑھ ہو گئے
اور اسی سبب سے ان کی جہالت اور علم سے ان کی دوری بڑھتی گئی۔ آخر پر
اسر کے بیٹے بیاس نے الہام الٰہی سے ان کے پچاس حرفوں کو از سر نو ایجاد
کیا۔ حرف کا نام "اکشر" ہے۔"[؎]

رسم الخط کو دیوناگری کہنے کے ضمن میں البیرونی لکھتا ہے کہ "حدود مالوہ میں ایک رسم
خط ہے جس کا نام ناگر ہے۔ یہ خط صورت میں پہلے خط سے مختلف ہے۔ اس کے بعد ایک
دوسرا خط ہے جس کا نام اردھ ناگری ہے یعنی آدھا ناگر۔ اس لیے کہ اس میں دونوں خط مذکورہ
مخلوط ہیں۔ بھاٹیہ اور سندھ کے بعض شہروں میں یہی خط لکھا جاتا ہے۔"[؎] سکھ جس لپی میں لکھتے
ہیں [illegible] گورمکھی (گرو کے مکھ) کہتے ہیں اور یہ بھی مذہبی حوالہ ہے۔

امیر خسرو نے اپنی مثنوی "نہ سپہر" میں اعداد پر بحث کرتے ہوئے صفر کے بارے میں یہ لکھا:

"اس صفر کا موجد "اسا" نام کا ایک برہمن تھا اور اس حقیقت میں کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ اسی کے نام پر اعداد کا نام ہنداسا پڑا تھا۔ جو مخفف ہو کر اہلِ عقل کے نزدیک ہندسہ رہ گیا ہے۔[9]"

چینی زبان کے آغاز کے بارے میں بھی ایسی ہی روایات ملتی ہیں۔ چنانچہ بیئر گری ندن کے مقالہ "چینی زبان کا ماخذ اور اس کے رموز" میں لکھا ہے:

"چینی تہذیب کی عہد بہ عہد نشو و نما میں قدیم تحریری شکلوں کا تعین ایک اہم تاریخی واقعہ ہے۔ کہتے ہیں یہ کام ہوانگ تی (HOUANG - TI) نے کیا۔ یہ شخص عبادت کی رسوم فائدہ مند فنون اور خصوصاً علم کیمیا کا بھی موجد ہے۔"[10]

اگرچہ اسلام اساطیری مذہب نہیں تاہم یہاں بھی رسم الخط کو مقدس سمجھنے کا رویہ برقرار ہے۔ "آئین اکبری" میں علامہ ابوالفضل کے بموجب: "بعض عبرانی کتابوں میں خط عبری حضرت آدم صفی اللہ سے منسوب کیا گیا ہے اور ایک گروہ نے اس خط کو حضرت ادریس علیہ السلام سے نسبت دی ہے۔ بعض اشخاص کی رائے ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام نے خط معقلی ایجاد کیا۔"[11]

یہودی روایات سے بھی اس کی توثیق ہو جاتی ہے کہ "تحریر کے موجد حضرت ادریس علیہ السلام ہیں، جن کا زمانہ طوفانِ نوح سے قبل ہے۔ طوفانِ نوح کا زمانہ چار ہزار سال قبل مسیح سے بھی زائد بتایا جاتا ہے۔"[12]

یہ صرف چند مثالیں ہیں ورنہ عالمی سطح پر رسم الخط کے بارے میں مزید ایسی روایات مل سکتی ہیں جن کے بموجب رسم الخط دیوتاؤں کا تحفہ اور طلسمی خصوصیات کا حامل قرار پاتا ہے۔

الفاظ کے چہرے:

بنیاد میں لفظ تصویر تھا اور یہ باعث تعجب نہ ہونا چاہیے۔ ہزاروں برس قبل مسیح کی تہذیب و تمدن اپنے عصر کے لحاظ سے کتنی ہی ترقی یافتہ پر قوت کیوں نہ ہو لیکن ابھی تک وہ ذہن کے اس درجے تک نہ پہنچے تھے جہاں مجرد کو اس کی مجرد صورت میں سمجھا جا سکے۔ وہ گفتگو کرتے تھے لیکن صوت اور حرف کے تعلق کا شعوری ادراک نہ رکھتے تھے۔ لہٰذا جب رسم الخط کی تشکیل کی گئی تو اصوات کو الفاظ کا جامہ پہنانے کے برعکس اشیاء کی تصاویر بنا ڈالیں۔ یعنی مرد کو حروف تہجی میں لکھنے کی بجائے مرد کی تصویر بنا ڈالی۔ اسے اصطلاح میں مصورانہ رسم الخط (PICTORIAL WRITING) یا تصویری خط (PICTOGRAPH) کہتے ہیں۔

اگرچہ بیشتر قدیم تہذیبوں میں مصورانہ رسم الخط کا رواج رہا ہے لیکن جہاں تک مصر کے مصورانہ رسم الخط ہیرو غلافی (لغوی معنی مقدس تحریر) کا تعلق ہے تو دلکش رنگوں، خوبصورت نقوش اور شبیہوں کی بناء پر یہ مینیچر پینٹنگ جیسی دلکشی اختیار کر لیتا ہے۔ یہ خط مصری اساطیر کے ساتھ تقریباً تین ہزار برس قبل مسیح طلوع ہوا اور فرعونوں کے عروج کے ساتھ ساتھ اس میں ارتقاء ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ یہ سات سو تصاویر، شبیہوں اور نقوش پر مشتمل ہو گیا۔ مندروں، مقابر اور شاہی محلات پر لکھے جانے کے باعث اس کے حسن و زیبائش میں خوب اضافہ ہوا۔ رفتہ رفتہ ہیرو غلافی نے بھی ایک طرح سے دیو بانی کی صورت اختیار کر لی تو عام ضروریات کے لیے پاپرس (جس کا معرب قرطاس ہے) پر لکھے جانے والے رسم الخط نے ایک نیا روپ اختیار کر لیا جسے ہراطیقی نام دیا گیا۔ مطلب اس کا بھی مقدس ہی ہے مگر یہ زیادہ خوشنما اور دیدہ زیب نہ ہوتا تھا۔

مصری ہیرو غلافی کی خوبصورتی اور فنکارانہ نزاکتوں کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ ابن حنیف کی کتاب "مصر کی قدیم مصوری" کا مطالعہ کریں تو ہیرو غلافی کی مصورانہ نزاکتوں کی وجہ سمجھ میں آجاتی ہے۔ ابن حنیف نے بڑی تحقیق سے مصر کی قدیم ترین مصوری کا کھوج لگا کر ہزاروں

HIEROGLYPHIC ALPHABET

برس قبل مسیح سے اس کی روایات کے سراغ مہیا کیے گئے ہیں۔ مصر میں مصوری کے احیاء کا بڑا سبب شاہی مقابر کا مصور کیا جانا تھا۔ شاہی محلات اور امراء کی رہائش گاہوں میں بھی مصورانہ تزئین ہوتی تھی۔ مصر کی مصوری ایک تحقیقی موضوع ہے۔ اگر ہم اس موضوع پر اور کچھ بھی نہ پڑھیں اور رف ریمیس دوم (۱۲۹۰ تا ۱۲۲۴ ق م) کی ملکہ نفیتہ ری بانفر تیتی کی تصویر یا اس کا مجسمہ دیکھ لیں تو مصریوں کی فنی مہارت کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ یہ دنیا کی چند اہم اور نادر تصاویر میں سے ایک ہے اور بلحاظ اہمیت مونالیزا کے مساوی۔ جس ملک میں مصوری کی اتنی قدیم اور توانا تاریخ موجود ہو وہاں ہیرو غلافی جیسا مصورانہ رسم الخط ہی جنم لے سکتا تھا۔ برعکس ہوتا باعث تعجب ہوتا

تصویر کیسے حرف میں تبدیل ہوئی یہ بے حد طویل داستان ہے جس کے دہرانے کا موقع نہیں تاہم مختصراً اتنا عرض کیا جا سکتا ہے کہ مصورانہ رسم الخط کے بعد جس رسم الخط کی بہت شہرت ہوئی اور سے مصورانہ رسم الخط اور موجودہ تجریدی علامات کے درمیان اہم کڑی سمجھنا چاہیئے۔ وہ ہے خط میخی یا پیکانی۔ اگرچہ ابتدا میں یہ بھی تصویری ہی تھا لیکن بڑھتی ہوئی عوامی ضروریات اور اختصار پسندی کے باعث مختصر ہو کر تجریدی علامات کی صورت اختیار کر گیا۔

محمد اسحاق صدیقی اس ضمن میں لکھتے ہیں:

"دنیا کے خطوں میں میخی خط کی تاریخ بہت قدیم اور طویل ہے۔ اس کا استعمال تقریباً تین ہزار سال قبل مسیح سے ہوا اور سن عیسوی کے آغاز تک جاری رہا۔ ایک زمانہ تھا جب ایران سے لے کر ایشیائے کوچک تک ہر جگہ مستعمل تھا اور اس نے بین الاقوامی شہرت حاصل کر لی تھی۔ حتیٰ کہ فرعون مصر کا محکمہ خارجہ بھی اسی خط میں مراسلت کیا کرتا تھا۔ چونکہ اس کی بنیاد ایسے نشانات پر ہے جو کبھی کھونٹی (میخ) کبھی تیر کے پھل (پیکان) اور کبھی کیل (مسمار) سے مشابہ ہوتے ہیں۔ اس لیے اسے میخی، پیکانی اور مسماری تین ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔ انگریزی میں اسے کیونیفارم (CUNEIFORM) کہتے ہیں جو لاطینی لفظ کیونیس (CUNEUS) میخ اور فارمہ (FORMA)

شکل سے مرکب ہے۔ یہ نام اول اول سترہ سو عیسوی میں مسٹر ٹامس ہائیڈ نے استعمال کیا تھا۔ جو آکسفورڈ یونیورسٹی میں عبرانی کے پروفیسر تھے۔"[14]

ایشیا میں تہذیب و تمدن کا دجلہ و فرات کے دوآبہ (عراق) سے آغاز کیا جا سکتا ہے۔ یہ وہ علاقہ ہے جہاں اساطیر کی صورت میں مذاہب نے اولین صورت میں ظہور پایا۔ جہاں جلجامش کی داستان کی صورت میں دنیا کی پہلی رزمیہ ملتی ہے اور الواح پہ مشتمل دنیا کا بہترین اور قدیم ترین کتب خانہ بھی "کاشتکاری" نے سب سے پہلے وہیں رواج پایا تھا۔ کمہار کا چاک سب سے پہلے وہیں بنایا گیا۔ سب سے قدیم شہروں کے آثار وہیں برآمد ہوتے ہیں۔ شہری ریاستیں سب سے پہل اسی وادی میں قائم ہوئی تھیں اور قانون کا سب سے پہلا ضابطہ اسی سرزمین پر مرتب ہوا تھا۔ مگر دجلہ و فرات کے قدیم باشندوں کا سب سے عظیم کارنامہ فن تحریر کی ایجاد ہے۔ اور یہ سب کچھ آج سے کوئی تین چار ہزار برس قبل مسیح میں ہوا۔ ویسے اس وادی میں انسان کی آبادکاری کی عمر ماہرین نے ایک اور ڈیڑھ لاکھ برس کے درمیان بتائی ہے۔"[15]

جہاں تک فن تحریر کی ایجاد و فروغ کا تعلق ہے تو سبط حسن کے بموجب، "گو مصریوں اور پھر فونیقیوں نے بھی یہ ہنر جلد ہی سیکھ لیا لیکن اولیت کا شرف بہرحال قدیم عراقیوں ہی کو حاصل ہے۔۔۔ یہ انقلابی ایجاد اب سے ساڑھے پانچ ہزار برس پیشتر سمیر کے شہر ارک کے معبد میں ہوئی۔ ارک اس وقت عراق کا سب سے خوشحال اور ترقی یافتہ شہر تھا۔" (ص ۴۳) "اس شہر کے کھنڈرات کی کھدائی سے بعض مہریں اور مٹی کی تختی برآمد ہوئی ہے جس پر تصویری حروف کندہ ہیں۔ اس تختی پہ ایک بیل کا سر ایک مرتبان کی شکل اور کئی قسم کی بھیڑیں بنی ہوئی ہیں اور دو شلث بھی کھنچے تھے۔ یہ انسان کی سب سے پہلے تصویری تحریر تھی جو ۳۵۰۰ ق م کے قریب لکھی گئی۔ لوح پر کندہ کی ہوئی یہ تصویریں بظاہر سامنے کی چیز معلوم ہوتی ہیں اور ان کا مفہوم واضح ہے لیکن یہ علامتیں اور ان علامتوں میں حروف کا سا تجریدی عمل بھی شامل ہے۔" (ص: ۴۵) "اس ابتدائی رسم الخط میں تصاویر دو ہزار سے بھی زیادہ تھیں لیکن پھر ان میں بتدریج کمی ہوتی گئی اور

۳۰۰۰ ق م میں شہر ریک کی الواح میں یہ تعداد ۸۰۰ رہ گئی اور ایک صدی بعد مزید کم ہو کر صرف ۶۰۰ رہ گئی۔" (ص: ۴۶)

ابن حنیف نے عراق میں رسم الخط کے ارتقاء کے بارے میں مزید معلومات بہم پہنچائی ہیں۔ ان کے بقول "عراقیوں کا رسم الخط میخی یا پیکانی تھا۔۔۔ اس رسم خط کے میخ نما ہونے کی علماء نے ایک وجہ یہ بھی بتائی ہے کہ گیلی مٹی پر گول حروف یا علامتیں بنانا کار دارد تھا۔ چنانچہ سمیریوں نے اپنی حرفی علامتیں گول کی بجائے میخ نما بنائیں۔ اس رسم خط کے موجد سمیری ہی تھے۔ ساڑھے چار ہزار سال قبل جب سامی النسل بابلیوں نے سمیریوں کو زیر کیا تو انہوں نے اہل سمیر کے بہت سے تہذیبی گوشوں کے ساتھ ساتھ ان کا طرز تحریر اور حروف بھی اپنا لیے۔ ان حروف کی تعداد کوئی ساڑھے پانچ سو تھی، لیکن استعمال عام طور پر تین سو ہی ہوتے تھے۔ گو سمیری تلفظ سامیوں کی زبان پر آسانی سے نہ چڑھتا تھا۔ تاہم انہوں نے بڑی کامیابی سے سمیریوں کے حروف وغیرہ اپنی زبان میں شامل کر لیے۔"[16]

"چڑیا کے پنجے":

آج کاغذ کے دور میں ہم یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ تحریر کو محفوظ کرنے کے لیے قدیم لوگوں کو کیا کیا جتن کرنا پڑتے تھے۔ عرب ہرن کے چمڑے پر لکھتے تھے۔ مصری پاپیرس کے گودے سے جو "صفحہ" بناتے تھے وہ قرطاس کہلایا۔ جنوبی ہند میں تاڑ کے پتے استعمال ہوتے تھے جبکہ شمالی ہندوستان میں توز کی چھال سے بھوج پتر بنتا تھا۔ اہل عراق اور بابلی چکنی مٹی کی الواح پر لکھتے تھے اور انہی پر خط میخی سے "تحریر" کیا جاتا۔ ان گیلی الواح کو سکھا کر پکا لیتے تھے۔ بابل، نینوا اور سمیری تہذیب کے بعض مراکز سے ایسی ہزاروں الواح برآمد ہوئی ہیں۔ اس عہد کا بادشاہ اشور بنی پال مطالعے کا شوقین تھا اور اس کی لائبریری الواح کی صورت میں ہزاروں الواح پر مشتمل تھی۔ اسی کی لائبریری میں سے دنیا کی قدیم ترین داستان اور عالمی ادب کا اگر

اولین نہیں تو کم از کم اہم ترین اور بے حد دلچسپ رزمیہ جلجامش کی نجات کی صورت میں ...
ہوا۔ جس کا اردو ترجمہ "جلجامش کی داستان" کے نام سے ابن حنیف نے (لاہور ۱۹۹۱) ...
انگریزی میں متعدد محققین نے اس کے متن کی درستی کی۔ دنیا کی مختلف زبانوں میں اس کے ...
ہو چکے ہیں۔ اس داستان سے طوفان نوح کی بھی توثیق ہو جاتی ہے۔

کسی نے میخی خط کے بارے میں مزیدار بات کہی ہے کہ اسے دیکھ کر یوں محسوس ہوتا ہے ...
گیلی مٹی پر چڑیا کے پنجوں کے نشانات بن گئے ہوں۔ بات کچھ ایسی ہی ہے لیکن اتنا ہے کہ یہ خط
ہزاروں برس تک آج کے معلوم ایشیا کی مختلف اقوام اور تہذیبوں میں مروج رہا۔ آج خط میخی کی
الواح کے مطالعے سے ان کی قدیم تہذیب، تاریخ، اساطیر اور عوامی زندگی کے بارے میں بیش بہا
معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ تاہم ایک ایسا وقت بھی آیا کہ یہ خط زوال پذیر ہو کر معدوم ہو گیا۔

"میخی خط کے خاتمے کا سبب بابل اور اشوریہ کی سلطنتوں کا کمزور ہو جانا تھا ۵۳۹ ق م
کیخسرو (CYRUS) کی فتح بابل کے بعد اس کا استعمال رفتہ رفتہ کم ہو گیا۔ دوسرا سبب فنیقی رسم
خط کی ایجاد و اشاعت تھی۔ بابلی اور آشوری رسم خط میں سینکڑوں نشانات کام آتے تھے جن
میں بعض چودہ چودہ پندرہ پندرہ پیکانوں سے بنتے تھے۔ برخلاف اس کے فنیقی رسم خط میں
کل بائیس حروف کام آتے تھے جن کا لکھنا بڑا ہی آسان تھا۔ بہر حال میخی رسم خط سن عیسوی کی
ابتدا تک رائج رہا۔ اس کا آخری کتبہ ایک تختی ہے جو غالباً ۸۲ء میں لکھی گئی تھی اور اب
میونخ کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔" ۱۸

تصویری اور میخی رسم خط دنیا کی قدیم ترین زبانوں اور تہذیبوں سے وابستہ رہا ہے۔ اسے
یوں سمجھیے کہ اب تک قطعی طور پر یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حضرت آدم کون سی زبان بولتے تھے۔ (آدم
سریانی زبان کا لفظ ہے)، تاہم اب اتنا کہا جا سکتا ہے کہ حضرت نوح اور ان کے عہد کی زبان
سامی تھی جو ان کے بیٹے سام کے نام پر تھی۔ سام کے بیٹوں میں آرام اور اشور وغیرہ کے نام
پر آرامی، اعیلامی اور اشوری زبانیں بنیں۔ عرب، یمن اور عراق میں آرامی[۱۸] بولی جاتی تھی۔ جب
بابل فتح کیا گیا تو وہاں کی زبانوں سمیری[۱۹] اور عکادی کے الفاظ اس میں شامل ہو گئے۔ آشور کی

...ادی میں عام تھا۔ اس کے نام پہ عبری (عبرانی) بنی[20]۔ یہ شام میں بولی جاتی تھی۔ شام کی
...ی زبان سریانی تھی توریت اسی میں لکھی گئی تھی۔ آج یہ تمام زبانیں مردہ ہیں البتہ اسرائیل
...ی عبرانی نے حیات نو پائی) لیکن ان کے متعدد الفاظ ایک طرف مصر کی زبانوں میں شامل
...وئے تو دوسری طرف عربی اور فارسی کے ذریعے سے آج تک زندہ ہیں۔ تصویری یا میخی
...برحال ان سب زبانوں میں کسی نہ کسی طور پہ مشترک تھا۔ اور قدیم تصویر کو جدید حرف کی
...ورت دینے میں کہیں نہ کہیں ان کا بھی خواہ بے حد دور ہی کا ہی تعلق ہے۔

Probable developmental sequence of letter "A" from ox head

الف: بیل کا سر

آج ہم تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارا یا دیگر زبانوں کا رسم الخط کتنے پیچیدہ مراحل اور
...ول تہذیبی سفر طے کر کے موجودہ صورت کو پہنچا۔ چنانچہ الف آم یا اے ایپل پڑھنے والا
بڑا ہو کر بھی بالعموم اس امر سے آگاہ نہیں ہو پاتا کہ اس نے جو قاعدہ پڑھا تھا۔ اس کے
...تلف حروف، اساطیر، تہذیب اور تاریخ سے متعلق اشیاء کی علامات ہیں۔ اس ضمن میں سب
سے دلچسپ مطالعہ الف یا اے کا ہے جو اپنی اصل صورت میں بیل کا سر تھا۔ بیل کو مختلف
زمانوں میں قوت، توانائی اور زرخیزی کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسی لیے قدیم زرعی معاشرہ
میں بیل مقدس سمجھا جاتا تھا۔ بعض قبائل میں یہ ٹوٹم کی حیثیت رکھتا تھا۔ ہندو بھی بیل اور گائے
کو مقدس مانتے ہیں اور موت کا دیوتا یم دوت جس بیل پہ سوار ہو کر روح قبض کرنے آتا ہے
اسے نادیہ کہتے ہیں۔

بیل کا قدیم سامی نام الفا تھا۔ جو ہیرو غلافی اور مصورانہ رسم الخط میں گردن اور سینگوں
کی صورت بنایا جاتا تھا۔ بیل کی یہی تصویر مختلف زمانوں اور زبانوں میں صورت بدلتی اور مختصر ہوتی
ہوئی موجودہ یونانی میں الفا کے روپ میں ظاہر ہوئی اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ قدیم فونیقی

شکل ۱۰۰

سامی ابجد کا ماخذ

	حروف کے نام				دوسری زبانوں کے لفظ		معنی	سامی ابجد		قدیم سینائی	مصری ہیروغلیفی
								سبائی	فنیقی		
	اصل	عبرانی	یونانی	حبشی	اکادی	عربی		۹۰۰ ق م	۱۰۰۰ ق م	۱۸۰۰-۲۰۰۰ ق م	۳۰۰۰ ق م
	الف	الف	الفا	الف	الپو		بیل				
۲	:	بیط	بیٹا	بیت	بیتو	بیت	گھر				
۳	جیم	گیمل	گاما	جمیل	جملو	جمل	اونٹ، پھینک کر مارنے کی چھڑی				
۴	دال	دالت	ڈیلٹا	دینت	دالتو	—	دروازہ				
۵	ہا	ہے	ایپسیلان	ہوئی	—	—	خوشی یا مسرت کی آواز				
۶	واؤ	واؤ	واؤ	وادے	—	—	کیل، کھونٹی				
۷	زا	زین	زیٹا	زائی	زنو	زیت	ہتھیار، زیتون ؟				
۸	حا	حیط	ایٹا	حاؤت	—	حائط، حاظر	جنگلہ، جھاڑی				
۹	طا	طیط	تھیٹا	طیط	—	—	روئی، سانپ ؟				
۱۰	یا	یود	آیوٹا	یمن	ادو	ید	ہاتھ				
۱۱	کاف	کاف	کاپا	کاف	کاپو	کف	ہتھیلی، خارج				
۱۲	لام	لامد	لامڈا	لاوے	—	—	آنکس، کوڑا، پھندا				
۱۳	میم	میم	مو	مائی	مو	ماء	پانی				
۱۴	نون	نون	نو	نحاس	نونو	نون	مچھلی، سانپ				
۱۵	سین	سامک	سی	سَت	—	سمک	مچھلی، [illegible]				
۱۶	عین	عین	اومیکرون	عین	مینو	عین	آنکھ				
۱۷	فا	پے	پائی	الیف	پو	فم	دہانہ				
۱۸	صاد	صادے	سان	صادائی	—	—	جال، نیزہ، ہڈا ؟				
۱۹	قاف	قوف	کوپّا	قاف	—	قفا	گدی، بندر، گرہ				
۲۰	را	ریش	رہو	ریس	ریسو	راس	سر				
۲۱	شین	شین	سگما	شاوٹ	—	سن	دانت، نوک، چوٹی				
۲۲	تا	تاؤ	تاؤ	تاوے	—	تاؤ	نشان				

۱ اس کی ابتدائی صورتیں یہ ہوں گی ۲ اسے شروع میں غالباً یوں بناتے ہوں گے۔ [illegible]

۳ یہ شکل قدیم آشوری رسم الخط کے اثر کو ظاہر کرتی ہے جس میں مچھلی کے لئے یہ نشان تھا یعنی مچھلی کی ریڑھ کی ہڈی کی تصویر ہے [illegible]

ور انگریزی، عربی، فارسی (اور ان کی وجہ سے اردو میں بھی) اور ان کے ساتھ ساتھ دیوناگری
ان سب میں الف کی مشترک داستان ہے۔ بے کی داستان بھی اسی سے مشابہ ہے جو اپنی
اصل صورت میں بیت یونانی اور فونیقی میں بیٹا تھا اور ان ہی دو الفاظ کے ملاپ سے حروف
تہجی کے لیے یونانی اصطلاح "الفا بیٹا" (ALPHA - BETA) حاصل ہوئی۔ الف اور بے
کی مانند تمام حروف تہجی کی اصل کی جستجو ہمیں تصویری رسم الخط کی کسی نہ کسی تصویر تک لے جاتی
ہے۔ (ملاحظہ ہو چارٹ)

اسی سے دیگر زبانوں کے ساتھ ساتھ یہ بھی اندازہ ہو جاتا ہے کہ خود عربی اور فارسی
کے حروف تہجی کی کیسے تشکیل ہوئی ہو گی۔

رسم الخط کی حکایت اور لفظ کے سفر کا مطالعہ بے حد دلچسپ ہے۔ بالخصوص قدیم تہذیبوں
کے مطالعات میں آثار قدیمہ کے ساتھ ساتھ رسم الخط سے بھی مدد لی جاتی ہے اور اسی سے ان کی
ی قدر و قیمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سندھ میں موہنجوڈارو سے دستیاب ہونے والی
یریں اگر DECIPHER کی جا سکتیں تو اس تہذیب کے بارے میں کارآمد معلومات مہیا ہو
سکتیں۔ کیونکہ محققین کا خیال ہے کہ: "سندھی اور ابتدائی سمیری رسم خط دونوں مصر کے قدیم
ترین رسم خط سے بھی مشابہہ ہوتی اور اب یہ خیال کیا جاتا ہے کہ تینوں غالباً ایک ہی اصل سے
ہیں اور وقت کے ساتھ ساتھ ان کا اختلاف بڑھتا گیا۔"[21] اب اگر یہ بات ثابت ہو جاتی ہے
تو قدیم تاریخ پر نئے زاویہ سے روشنی پڑے گی۔ مگر اس کی کلید سندھی رسم الخط ہے جو سربستہ معمہ
ہے۔

عربی رسم الخط:

عرب میں زبان اور فن تحریر کے آغاز کی داستان بھی خاصی دلچسپ ہے اور اس پر پڑوس
کی پرانی تہذیبوں کے اثرات کا بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ پروفیسر سید محمد سلیم کے بموجب:

"خط آرامی کو عرب میں قوم سبا نے رائج کیا۔ قوم سبا جنوبی عرب میں یمن کے علاقے میں حکمران رہی ہے۔ اس کا زمانہ ایک ہزار سال قبل مسیح کا ہے۔ ملکہ سبا اور حضرت سلیمان کا تذکرہ قرآن میں مذکور ہے۔ یمنی عربوں کی زبان احمیری (بروزن مستری) کہلاتی تھی۔ ایک لحاظ سے عربی کی بڑی بہن تھی۔ اہل صبا کو اپنی زبان آرامی خط میں لکھنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انہوں نے آرامی حروف میں مزید چھ حروف کا اضافہ کیا ثہ، خ، ذ، ض، ظ، غ۔ عربی زبان میں ان حروف کو روادف کہا جاتا ہے۔ اہلِ سبا نے یہ حروف بعض آرامی حروف کے ہم شکل بنائے۔ ان کی زبان حمیری تھی اور تحریری خط مُسنبہ کہلاتا تھا۔ خط مُسنبہ میں ۲۸ حروف تھے۔[۲۲] دوسرا انقلابی قدم نبطی قوم نے اٹھایا۔ حروف تہجی میں ہمزہ کا اضافہ ان کی یادگار ہے۔ اس وقت تک سین (سمک) اور شین کی تحریری شکلیں مختلف تھیں اور انہوں نے دونوں حروف کو ہم شکل بنا دیا۔ لام الف (لا) کا استعمال بھی پہلی مرتبہ نبطی کتابت میں ملتا ہے مگر ان کا انقلابی قدم یہ تھا کہ انہوں نے پہلی مرتبہ حروف کو ملا کر اور مرکب بنا کر لکھا۔ ترکیب حروف کا راستہ انہوں نے دکھایا۔"[۲۳]

اِس سلسلے میں محمد اسحاق صدیقی لکھتے ہیں: "عربی رسم الخط کی تاریخ مرتب کرنے کے لیے ہمارے پاس دو ذریعے ہیں۔ ایک روایت اور دوسرے کتبات۔ کتبوں کی روایت موجودہ زمانے کا کارنامہ ہے۔ قدیم مؤرخین نے محض روایات کو سامنے رکھا ہے جیسے ابن ندیم کی الفہرست اور بلاذری کی فتوح البلدان میں جن میں سے بعض مشتبہ ہیں اور بعض کی موجودہ تحقیقات سے تردید ہوتی ہے۔ کتبوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عربوں نے تیسری صدی عیسوی میں نبطی رسم خط استعمال کر لیا تھا۔ اور چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی تک اس میں تغیر و تبدل کر کے بڑی حد تک انفرادیت پیدا کر لی تھی۔"[۲۴]

تقریباً سبھی ماہرین نے یہ تسلیم کیا ہے کہ قدیم عربی رسم الخط (کوفی بننے سے پہلے) نبطی رسم الخط کی صورت میں تھا۔ نبطی رسم الخط کا ماخذ فینیقی رسم الخط کو تسلیم کیا جاتا ہے۔ جبکہ بعض

Scanned with CamScanner

محققین کے بموجب چوتھی صدی عیسوی میں یہ خط مبری، خط سرپاک یا خط سطرنجلی سے اخذ کیا گیا۔ عربی رسم الخط کے بارے میں یہ بھی باور کیا جاتا ہے یہ حیری کی اصلاح شدہ یا ترقی یافتہ صورت تھی۔ واضح رہے کہ قدیم عربی رسم الخط کے لیے حیری یا حیاری کے نام ہی استعمال ہوتے رہے ہیں۔ محققین کے خیال میں چھٹی صدی عیسوی میں عرب میں یہی خط مروج تھا۔ اور اعلانِ نبوت کے وقت مکہ میں سترہ ایسے لوگ موجود تھے جو اس خط میں لکھ سکتے تھے۔ جہاں تک نام حیری کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ حرب ابن امیہ نے اسے حیرہ سے سیکھ کر عرب میں روشناس کرایا تھا۔ حیرہ ایک شہر کا نام ہے جسے بعد میں کوفہ کہا گیا۔

حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے وقت رائج عربی رسم الخط کو خط کوفی کہا جاتا تھا۔ اس نام سے یہ مغالطہ ہوتا ہے کہ شاید یہ کوفہ میں ایجاد ہوا۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی نے اپنے مقالے "پاک و ہند میں نستعلیق" میں بلاذری کی فتوح البلدان (مصر ۱۹۰۱) کے حوالے سے لکھا ہے کہ خط عربی کی ابتدا بمقام حیرہ نزد کوفہ ہوا۔[25] وہاں سے حرب ابن امیہ نے سیکھا اور عرب میں پھیلایا۔ اس خط میں نہ تو نقطے تھے نہ ہی اعراب وغیرہ۔ بلکہ آج کا الف ان دنوں ا یوں لکھا جاتا تھا۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے تبلیغ دین کے لیے مختلف بادشاہوں کو جو مراسلات ارسال فرمائے وہ اسی بے نقط خط میں تھے۔ آپ کی حیاتِ مبارکہ میں قرآن مجید کی آیات بھی اسی خط میں لکھی جاتی تھیں۔ کاتبانِ وحی میں حضرت معاویہ بن سفیان اور حضرت زید بن ثابت مشہور ہیں۔ حضرت زید عبرانی زبان بھی جانتے تھے اور مراسلات بالعموم آپ ہی قلمبند کرتے تھے۔

جہاں تک اس میں نقطوں اور اعراب کے اضافوں کا تعلق ہے تو محمد سجاد مرزا کی بموجب ۵۰ھ میں اعراب کے طور پر نقطوں کے استعمال کا آغاز ہوا۔ اس کے بعد حجاج بن یوسف نے نصر بن عاصم کو رسم الخط کی اصلاح کے لیے مامور کیا جس نے مخارج میں قطعیت اور حروف کی بہتر شناخت کے لیے قرمزی اور سیاہ رنگ کے نقطے تجویز کیے۔ اس کے تقریباً چالیس برس بعد

کے موجد عبدالرحمٰن خلیل بن احمد عروضی نے اعراب متعین کر کے رنگین نقطے ختم کر دیئے۔[۲۶]
ڈاکٹر وحید قریشی کے بقول ابن ندیم (وفات ۔۔۔۱۰) نے اس خط کو خط کوفی کا نام دیا
غالباً یہ عموماً عمودی اور افقی خطوط میں لکھا جاتا تھا۔

"باب العلم : اصل خط کوفی است"

انجم رحمانی کے مقالے ' خط کوفی کا ارتقاء' کے بموجب 'بعض روایات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت علی نے کوفہ کو اپنا دارالحکومت بنایا تو سب سے پہلے آپ ہی نے وہاں خط کی ایک قسم ایجاد کی اور لوگوں کو اس کی تعلیم دی۔ چنانچہ سلطان علی مشہدی کا مشہور شعر ہے :

مرتضیٰ اصل خط کوفی است

کرد پیدا داد و نشو و نما

حضرت علی سے تعلیم و تحسین خط کے سلسلے میں بہت سی ہدایات مروی ہیں۔ اس کے علاوہ خط کی تعریف، دوات میں سوف ڈالنے کا طریقہ، قلم کی بناوٹ کے قواعد اور فن خطاطی کے بعض بنیادی اصول بھی حضرت علی سے منسوب کیے جاتے ہیں۔ جن کی صحت اور عدم صحت کے بارے میں کچھ کہنا مشکل ہے۔ تاہم اتنا کہنا ضروری ہے کہ حضرت علی کے عہد خلافت میں خط کوفی بحیثیت خط ایک مرکزی صورت اختیار کر گیا تھا۔ مختصراً مرامر بن مرہ نے اس کے حروف وضع کیے۔ اسلم ابن سدرہ نے حروف کے جوڑ ملانے کا طریقہ وضع کیا اور تاریخ القرآن کے مطابق عامر نے نقطے اور اعراب وضع کیے۔ لیکن اس نظریے سے بعض مورخین کو اختلاف ہے۔ ان کے خیال کے مطابق علم الخط کے واضع ابوالاسعد دوئلی تھے۔ جنہوں نے درحقیقت اعراب کو ایجاد کیا۔ ابوالاسعد دوئلی، حضرت علی کے تلمیذ ارشد تھے جن کا انتقال ٦٩ ہجری مطابق ٦٨٨ عیسوی میں واقع ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ ابوالاسعد نے اعراب لگانے کا یہ کام حضرت علی کے عہد خلافت میں حاکم بصرہ کے ایماء پر کیا تقریباً ٤٠ ہجری سے پہلے حرکت زیر / زبر / پیش کو ظاہر کرنے کے لیے گول نقاط ایجاد کیے۔ نقاط
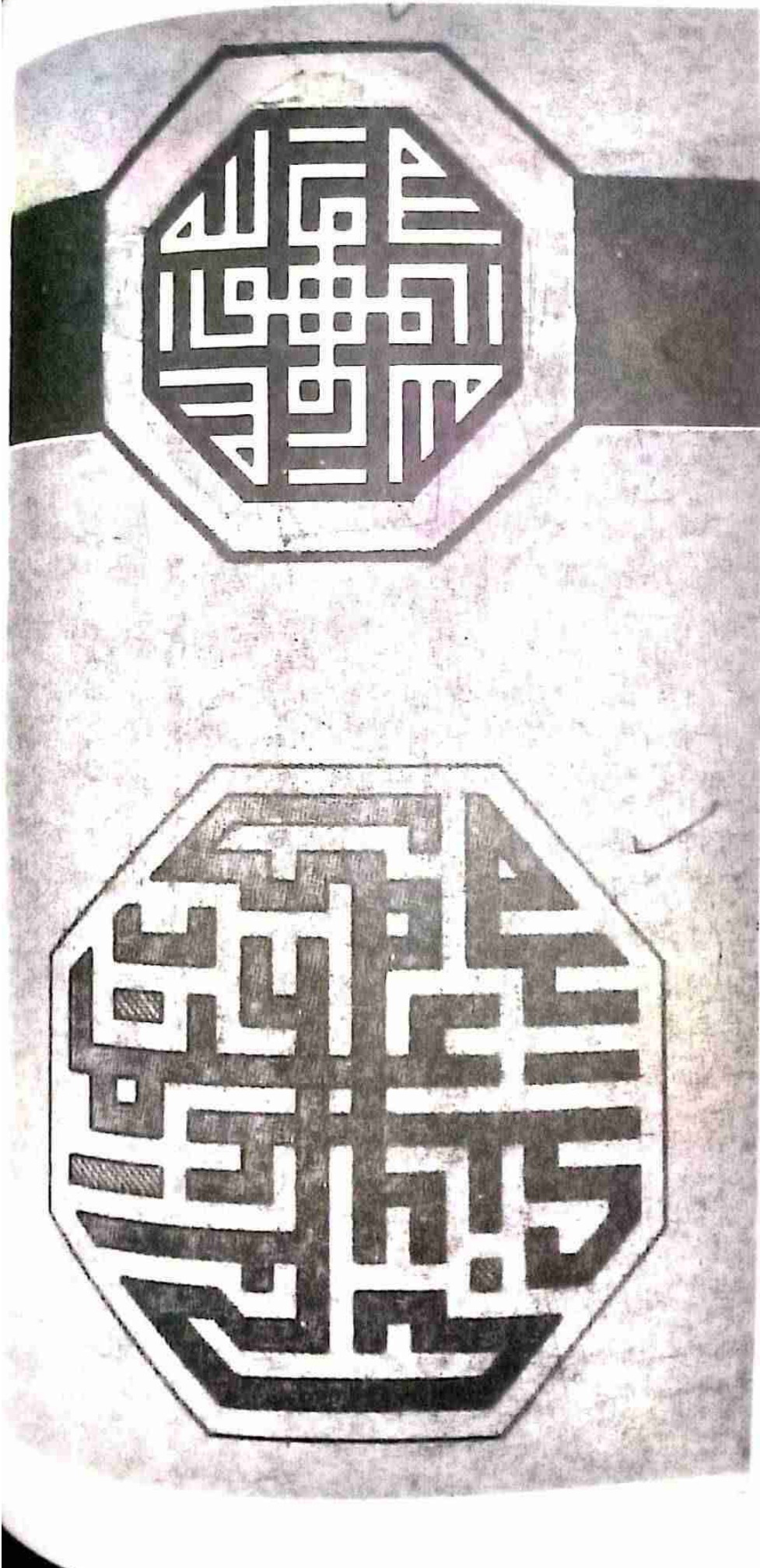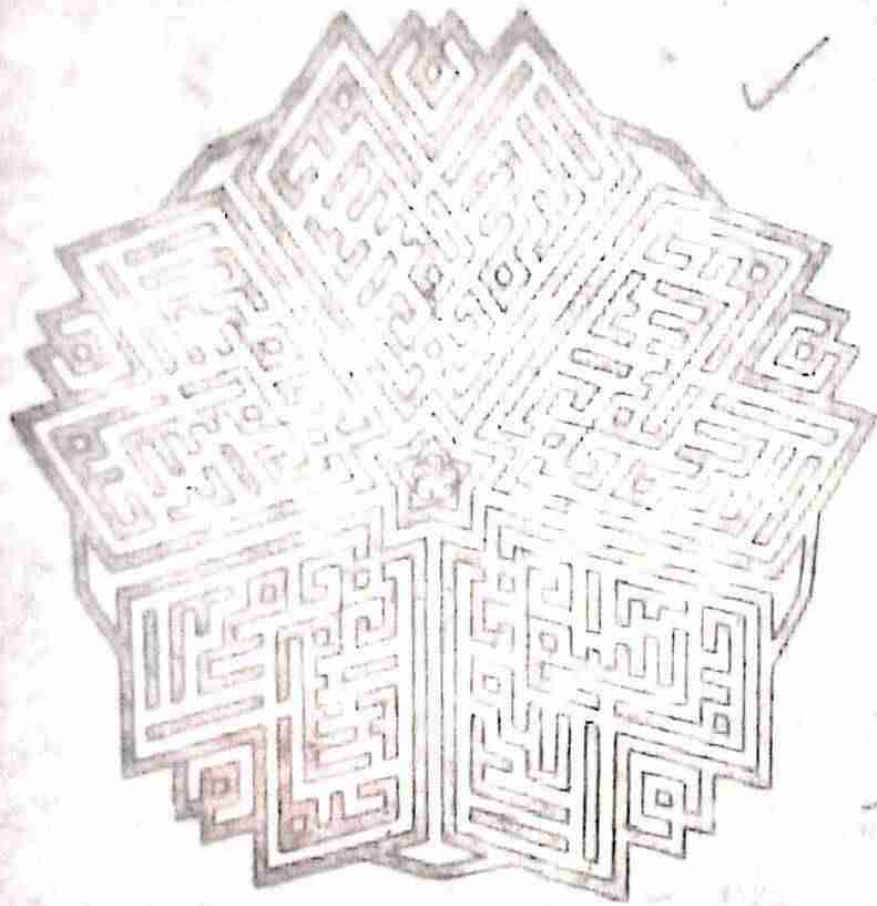
اس طغرے میں بسم اللہ الرحمن الرحیم پانچ دفعہ لکھا گیا ہے
یہ کوفی انداز تحریر کا ایک نادر اور بہت ہی خوب صورت نمونہ ہے ۔

لگانے کے لیے یہ طریقہ اختیار کیا کہ تلاوت کے دوران میں جن حروف کی قرأت کے وقت دونوں
لبوں کے کنارے کھل گئے اس حرف پر زبر کو ظاہر کرنے کے لیے گول نقطہ جن حروف کی قرأت
کے وقت دونوں لبوں کے کنارے مل گئے ان پر پیش کو ظاہر کرنے کے لیے ان کے آگے گول
نقطہ اور جن حروف کے ادا کرنے میں آواز کا رخ نیچے کی طرف زیر کو ظاہر کرنے کے لیے
نقاط لگا دیئے۔

حضرت امام حسن اور حضرت علی خود بھی اس خط کے ماہر تھے ۔[28]

خطِ کوفی سے حضرت علی کے تعلق کے بارے میں علامہ ابوالفضل نے بھی "آئین اکبری"
میں یہی لکھا ہے :

"ایک جماعت کہتی ہے کہ امیرالمومنین علی مرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے
معقلی سے خط کوفی ایجاد کیا ۔"[29]

"ابجد"

عربی حروف تہجی کے بارے میں ڈاکٹر ابو محمد سحر نے اپنے مقالے "اردو حروف تہجی" میں
بیان کیا ہے : "کہ حروف تہجی کی ایجاد سامی خاندان کی ایک شاخ یعنی آرامی زبان میں ہوئی ، عربی
عربی رسم الخط نبطی کے توسط سے آرامی خط سے ماخوذ ہے ۔ آریائی خاندان کی اکثر زبانوں کے
رسم الخطوں کی تشکیل آرامی خط کے زیر تحت ہوئی ہے ۔"

وہ مزید لکھتے ہیں : "عربی حروف تہجی کا صوری انداز ترتیب کچھ ایسا عیب و عزیب یا ناقص
نہیں ہے ۔ یہ صوتیاتی انداز ترتیب کی مشکلات کے بعد وجود میں آیا تھا ۔ ابتدا میں عربی حروف
کی ترتیب آرامی ابجد یعنی ابجد ہوز ، حطی ، کلمن ، سعفص ، قرشت کے مطابق تھی ۔ ان میں
ثخذ اور ضظغ کا اضافہ کیا گیا ۔ یہ ترتیب نہ صوری نہ صوتیاتی ۔ خلیل بن احمد نے ان کو حلقی اصوتیاتی
انداز پر ترتیب دیا ۔ لیکن اس سے دشواریاں دور نہیں ہوئیں خصوصاً حروف کے یاد رکھنے میں آسانی

نہیں ہوئی۔ بالآخر ابن مقلہ نے حروف تہجی کو صوری انداز سے ترتیب دیا اور یہ ترتیب جو ترتیب ابتث کہلاتی ہے، اس قدر مقبول ہوئی کہ ابجدی اور حلقی ترتیبیں ختم ہوگئیں۔[20]

ملتے جلتے حروف کا ساتھ لکھا جانا صوری ترتیب (یا تعلیمی ترتیب) کہلاتا ہے۔ جب مختلف حروف تہجی کو ملا کر ایک یونٹ کے طور پر جمع کر دیا جائے تو یہ ابجدی ترتیب ہے۔ ابتداء میں عربی حروف یوں تھے: ا۱ ۔ ب۲ ۔ ج۳ ۔ د۴ ۔ ہ۵ ۔ و۶ ۔ ز۷ ۔ ح۸ ۔ ط۹ ۔ ی۱۰ ۔ ک۲۰ ۔ ل۳۰ ۔ م۴۰ ۔ ن۵۰ ۔ س۶۰ ۔ ع۷۰ ۔ ف۸۰ ۔ ص۹۰ ۔ ق۱۰۰ ۔ ر۲۰۰ ۔ ش۳۰۰ ۔ ت۴۰۰ ۔ ث۵۰۰ ۔ خ۶۰۰ ۔ ذ۷۰۰ ۔ ض۸۰۰ ۔ ظ۹۰۰ ۔ غ۱۰۰۰ ۔ (۲۸) ان ہی کے ابجد ہوز وغیرہ کی صورت میں یونٹ بنا لیے گئے۔ اسی سے حروف تہجی کے لیے ابجد کی اصطلاح بھی استعمال کی جاتی ہے۔ اس ابجد کو علم الاعداد سے ہم آہنگ کرنے کے نتیجے میں حرف کی عددی قدر مقرر کر دی گئی جس کا فارمولا یوں ہے۔ پہلے نو حروف اکائیاں، دوسرے نو حروف دہائیاں، تیسرے نو حروف سینکڑے ظاہر کرتے ہیں۔ اور آخری حرف یعنی غ ۱۰۰۰ (ہزار) ظاہر کرتا ہے۔ علم الاعداد کا سراغ یقیناً غورث تک جاتا ہے بلکہ محض محققین تو اسی کو اس کا موجد سمجھتے ہیں۔ یہودیوں، یونانیوں اور عربوں میں بھی اس کا چرچا رہا ہے۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس کی یہ اہمیت ہے کہ فن تاریخ گوئی کی اساس اسی پر استوار ہے۔ چنانچہ افراد، کتب اور عمارات کے تاریخی ناموں سے سن پیدائش، سن تحریر اور سن تعمیر دریافت کیا جا سکتا ہے۔

جہاں تک عربی حروف تہجی کا تعلق ہے تو یہ عربوں کی ایجاد نہ تھے جیساکہ الفا (الف) اور بیٹا (ب) سے ظاہر کیا گیا۔ یہ ہزاروں برس کا سفر طے کر کے عربوں تک پہنچے تھے، پہلے ۲۲ حروف قدیم ہیں۔ عربوں نے اپنی صوتی ضروریات کے مطابق مزید ۶ حروف یعنی خ۔ ذ۔ ض۔ ث۔ ظ۔ غ کا اضافہ کیا۔ اور شاید اسی لیے انہیں آخر میں رکھا گیا تھا۔ انہیں حروف روادف بھی کہتے ہیں۔ بعد میں ان میں مزید اضافے بھی ہوئے۔ اور مزید جدت یہ ہوئی کہ صوری ترتیب سے لکھے جانے لگے۔ اب یہ یوں لکھے جاتے ہیں: ا ب ت ث ج ح خ د ذ ر ز س ش

صاحبِ فرہنگ آصفیہ نے ابجد کا اسلامی مفہوم اجاگر کرتے ہوئے یہ لکھا ہے

"ابجد دو ہیں ایک آدم علیہ السلام کی ترتیب دی ہوئی دوسری حضرت ادریس علیہ السلام کی۔ چنانچہ آج کل ادریس ہی کی ابجد جاری ہے۔ انہوں نے اسی ابجد کو ترتیب دے کر آٹھ بامعنی کلمے بنائے اور ابجد ادریس اس کا نام رکھا۔ اس ابجد میں عربی کے تمام حروف آگئے ہیں اگر انہیں علیحدہ کر کے ترتیب دیا جائے تو پوری الف بے تے بن جائے ان حروف کے اعداد بھی مقرر ہیں جنہیں حسابِ جُمّل کہتے ہیں۔

ابجد ادریس کے آٹھ کلمے ہیں:

۱۔ **ابجد** : یعنی میرا باپ آدم تھا گنہگار پایا گیا یعنی اس سے گناہ صادر ہوا۔

۲۔ **ھَوّز** : یعنی اپنی خواہشِ نفسانی کی پیروی کی

۳۔ **حُطّی** : یعنی اس کے گناہ اس کی توبہ واستغفار سے کھو دیئے گئے۔

۴۔ **کَلِمَن** : یعنی زبان پر کلمۂ حق لایا اِس سے اس کی توبہ قبول ہوئی

۵۔ **سَعْفَص** : یعنی دنیا اس کے اوپر تنگ ہوگئی پس بہا دی گئی

۶۔ **قُرِشَت** : یعنی اپنے گناہوں کا اقرار کیا جس سے کرامت کا شرف حاصل ہوا۔

۷۔ **ثَخَّذ** : یعنی خدا تعالٰی نے اسے قوت دی

۸۔ **ضَظَغ** : یعنی شیطان کا جھگڑا کلمۂ توحید کی برکت سے مٹ گیا۔"

مولوی سیّد احمد دہلوی اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں :

"بعض لوگوں نے لکھا ہے کہ آبا جاد ایک بادشاہ کا نام تھا (از مدار الافاضل) جس کا مخفف ابجد ہے اور باقی سات کلمے اس کے بیٹوں کے نام ہیں چنانچہ شُراح وغیرہ میں اس کی تشریح کی گئی ہے بعض لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ مرامر ایک شخص کا نام تھا لکھنے کا طریقہ اسی کی ایجاد ہے اور یہ آٹھوں کلمے اس کے آٹھوں بیٹوں کے نام ہیں۔ رسالۂ ضوابط عظیم میں ان آٹھوں کلمات کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں۔ ابجد یعنی مل گیا۔ حطّی یعنی واقف ہوا ـــــ کلمن یعنی متکلم ہوا ـــ سعفص یعنی اس سے سیکھا۔ قرشت یعنی ترتیب دیا ہوا ـــــ ثخذ یعنی محفوظ رکھا ـــ ضظغ یعنی تمام کیا"۔

مولوی سیّد احمد دہلوی کے بموجب "ابجدی آٹھ کلموں کی نسبت بعض لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اعداد یا حسابی جملے حضرت شیث پیغمبر پر نازل ہوئے اور ترتیب ہارون رشید کے زمانے میں دیئے گئے لیکن لفظ ہندسہ ظاہر کرتا ہے کہ اعداد کا حساب ہند سے نکلا ہے اور اسی وجہ سے اہل عرب نے علم حساب کا نام ہندسہ رکھا"۔

(ص : ۸۵ - ۸۴)
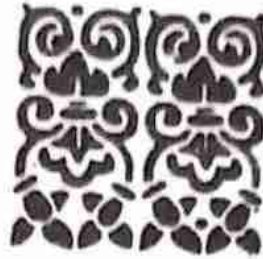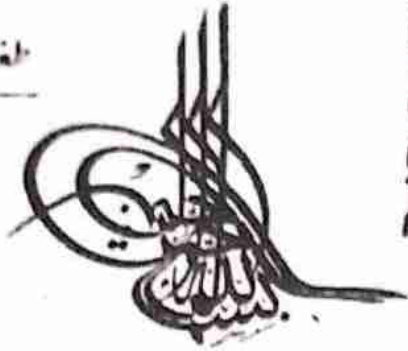
طغریٰ
يظنون بالله غير الحق ظن الجاهلية
ثلث
يقولون هل لنا من الأمر من شيء قل إن الأمر كله لله
نسخ
يخفون في أنفسهم ما لا يبدون لك
يقولون لو كان لنا من الأمر شيء ما قتلنا
ههنا قل لو كنتم في بيوتكم لبرز الذين
رقاع
كتب عليهم القتل إلى مضاجعهم وليبتلي الله
ما في صدوركم وليمحص ما في قلوبكم
نستعلیق
والله عليم بذات الصدور

ص ض ط ظ ع غ ف ق ک ل م ۔ ن و ہ ء ی ۔[31]

جنتِ نگاہ فردوسِ گوش

جمالیاتی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لینے پر حروفِ تہجی جنتِ نگاہ بھی ہیں اور فردوسِ گوش بھی۔ تحریر کی صورت میں ان کا تعلق بصارت سے ہوتا ہے۔ جبکہ دیکھنا۔ تقریر کی لذت کی صورت میں سماعت سے۔ لہٰذا دونوں صورتوں میں یہ بصری اور سماعی اعصاب پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اگرچہ اس ضمن میں خوشخطی، دلکش آواز اور مترنم لہجے بھی اہمیت رکھتے ہیں۔ تاہم اساسی صورت میں ان سب کا انحصار حروف کی مخصوص ساخت اور ان اصوات پر ہے جن کی نمائندگی کے لیے یہ وضع کیے گئے تھے۔ واضح رہے کہ ابتدا میں حرف تصویر تھا۔ اس لیے جن زبانوں کے رسم الخط نے تصویری عناصر کو حروفِ تہجی میں نسبتاً زیادہ برقرار رکھا اس کی دلکشی اور جمالیاتی عناصر بھی اسی نسبت سے اجاگر ہوئے۔ اس سلسلے میں چینی اور جاپانی رسم الخط کی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ جو آج بھی تصویری ہی ہیں اور ان کی تحریر دیکھ کر ننھی منی تصویروں کا خیال آتا ہے۔

عربی حروفِ تہجی نے بعد میں خطاطی کے متنوع اسالیب کے فنی تقاضوں اور جمالیاتی اوصاف کی تشکیل کی تو اس کا بنیادی سبب حروف کی ساخت میں مضمر ہے۔ ب۔ ک۔ ر کی صورت اور ج س ق کے نصف دائرے معصومانہ حسن کے لیے محرک ثابت ہوتے ہیں۔ اس لیے انہیں دیکھ کر ناتمامی کا جو احساس ہوتا ہے اسی نے ان میں گویا گیلی مٹی جیسی لچک پیدا کر دی کہ جس سانچے میں چاہو ڈھال لو۔ یوں عدمِ تکمیل کا احساس ان کی تکمیل کی صورت میں کئی اسالیب اختیار کر جاتا ہے۔ مسلم خطاطوں کے یہ متنوع اسالیب اسی لیے معرضِ وجود میں آئے کہ حروف متنوع روپ اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ ان کے برعکس رومن یا سنسکرت

حروف میں بالعموم یہ صلاحیت نہیں۔ رومن حروف اے۔او۔بی۔ڈی وغیرہ اپنی صورت میں مکمل نظر آتے ہیں اس لیے ان کی تحریر میں مزید جدتیں کیسے پیدا ہوں۔ اگرچہ گاتھک اور بیروق میں اس سلسلے میں کچھ کیا گیا لیکن آج ان میں فنی نزاکت کا فقدان نظر آتا ہے مسلمانوں میں خطاطی نے اسی لیے فروغ پایا کہ اسلام میں شبیہ سازی ممنوع ہے۔ لہذا ان کی جمالیاتی حس نے جب دینی سطح پہ اظہار پایا تو قرآن مجید کی خوب صورت اور دل کش خطاطی میں انہوں نے فنکاری کے جوہر دکھائے۔ یہ غلط نہیں لیکن اس ضمن میں یہ اساسی امر بھی ملحوظ رہے کہ اگر خود حروف کی ساخت میں جمالیاتی عناصر کا فقدان ہوتا تو تمام فنکاری کے باوجود بھی شاید اتنے متنوع اسالیب کی اختراع آسان نہ ہوتی۔ اس لیے مسلم خطاطوں نے رسم الخط کو جو جنت نگاہ بنا دیا یوں کہ دنیا عش عش کر اٹھی۔ اس کے لیے انہیں حروف تہجی کا بھی ممنون ہونا چاہیے۔

حروف تہجی کے فردوس گوش بننے کے ضمن میں عابد علی عابد نے اپنا مقالہ "اردو میں حروف تہجی کی غنائی اہمیت" میں اس خیال کا اظہار کیا "حروف تہجی کے گروہوں کی اندرونی ترتیب غنائی ہے۔ یعنی مان لیا گیا ہے کہ ہر گروہ کا حرف ایک سُر ہے۔ اب ان گروہوں کے سُروں کی ترتیب دیکھیے۔ الف کو چھوڑ دیجئے کہ حرف علت ہے..... ب پ ت ٹ ث مان لیجئے کہ یہ سُر ہیں، تو فوراً واضح ہوگا کہ ب سُدھ ہے۔ پ تیور یا چڑھا ہوا سُر ہے۔ ت کومل یا اترا ہوا سُر ہے۔ ٹ بہت چڑھا ہوا یا ات تیور سر ہے۔ ث بہت اترا ہوا یا ات کومل سُر ہے۔ آگے ج سدھ ہے، چ تیور ہے۔ ح کومل ہے۔ خ ات کومل ہے۔ د ڈ ذ د سُدھ ہے، ڈ تیور ہے اور ذ کومل ہے۔ ر ڑ ز ژ ۔ ر سُدھ ہے ڑ تیور ہے ز کومل ژ ات تیور ہے۔ س ش سدھ اور تیور ہیں۔" [۳۲]

نعیم اللہ خیال کے بموجب "اردو رسم الخط کی علمی بنیاد..... ریاضیات کے اصل الاصول پہ مدون ہے۔ اس لیے قطعاً ٹھوس اور سائنٹفک ہے۔ چنانچہ ریاضیات کے بنیادی اصول پانچ ہیں۔ ایک نقطہ، دو خط یا لکیر، تین زاویہ، چار دائرہ اور پیمائش یا ساخت، اردو رسم الخط مکمل طور پہ

انہی پانچ اصولوں پہ مبنی ہے۔[۲۲]

جلال و جمال کا امتزاج۔ خطاطی:

دیکھا گیا ہے کہ فاتح قوم جلالی مزاج کی حامل ہوتی ہے جبکہ مفتوح جمالی کی۔ اسی لیے قوت بازو فاتح کی خاصیت ہوتی ہے تو علم و فن مفتوح کی۔ رومن یونانیوں پر تو غالب آ گئے مگر ان کے فلسفے سے شکست کھا گئے۔ جب مسلمانوں نے ۶۵۱ء میں ایران فتح کیا تو اس وقت ان میں وہ شجاعت موجود تھی جو عرب قبائل کا طرہ امتیاز تھی۔ جبکہ ایران قدیم تہذیب اور ارفع تمدن کا حامل تھا۔ یوں فاتح اور مفتوح کے ملاپ نے جس اسلامی تہذیب و تمدن کی بنیاد استوار کی اس کی اساسی خصوصیت کو جلال و جمال کے امتزاج سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ دیگر امور کے علاوہ اس کا اظہار مسلم خطاطی سے بھی ہوتا ہے۔ قدیم ایران میں متعدد جبکہ (بعض محققین کے بموجب) سات خط رائج تھے۔ ان میں سے بعض مخصوص مقاصد کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ جیسے فلسفہ، منطق، طب اور ان سے متعلق مباحث کے لیے ایلبتج اور داس سہر استعمال ہوتے تھے۔ شاہ دبیریہ اور داس سہریہ امور مملکت کے لیے تھے اور یہ خفیہ نوعیت کے ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ دین دفتریہ ریش دبیریہ نامہ دبیریہ نبن اور خطوط بھی مروج تھے۔ ویسے جہاں تک ایران میں رسم الخط کی قدامت کا تعلق ہے تو اس کے سراغ ۵۵۰ ق م تک تلاش کیے جا چکے ہیں۔ یعنی وہ دور جب ان تمام علاقوں کا خط میخی تھا۔ جس نے ارتقا پذیر ہو کر پہلوی رسم الخط کی صورت اختیار کر لی۔ جس کی دو قسمیں پہلوی اور پارسک بیان کی جاتی ہیں۔ زرتشت کے صحائف کے لیے مخصوص خط نے اوستا خط کا نام پایا۔ یہ تمام خطوط ایران میں اسلامی تسلط تک موجود رہے۔ لیکن اسلامی اثرات کی بدولت تمام ایرانی خط ختم ہو گئے اور ان کی جگہ کوفی نے لے لی۔ قرآن مجید اور تمام عبادات کی زبان عربی تھی۔ لہذا اسلام کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ عربی زبان اور رسم الخط بھی پھیلنے لگے۔ اگرچہ عرب اپنے ساتھ اپنا خط کوفی لائے تھے لیکن عربی جلال اور عجمی جمال نے مل کر خطاطی کی صورت میں
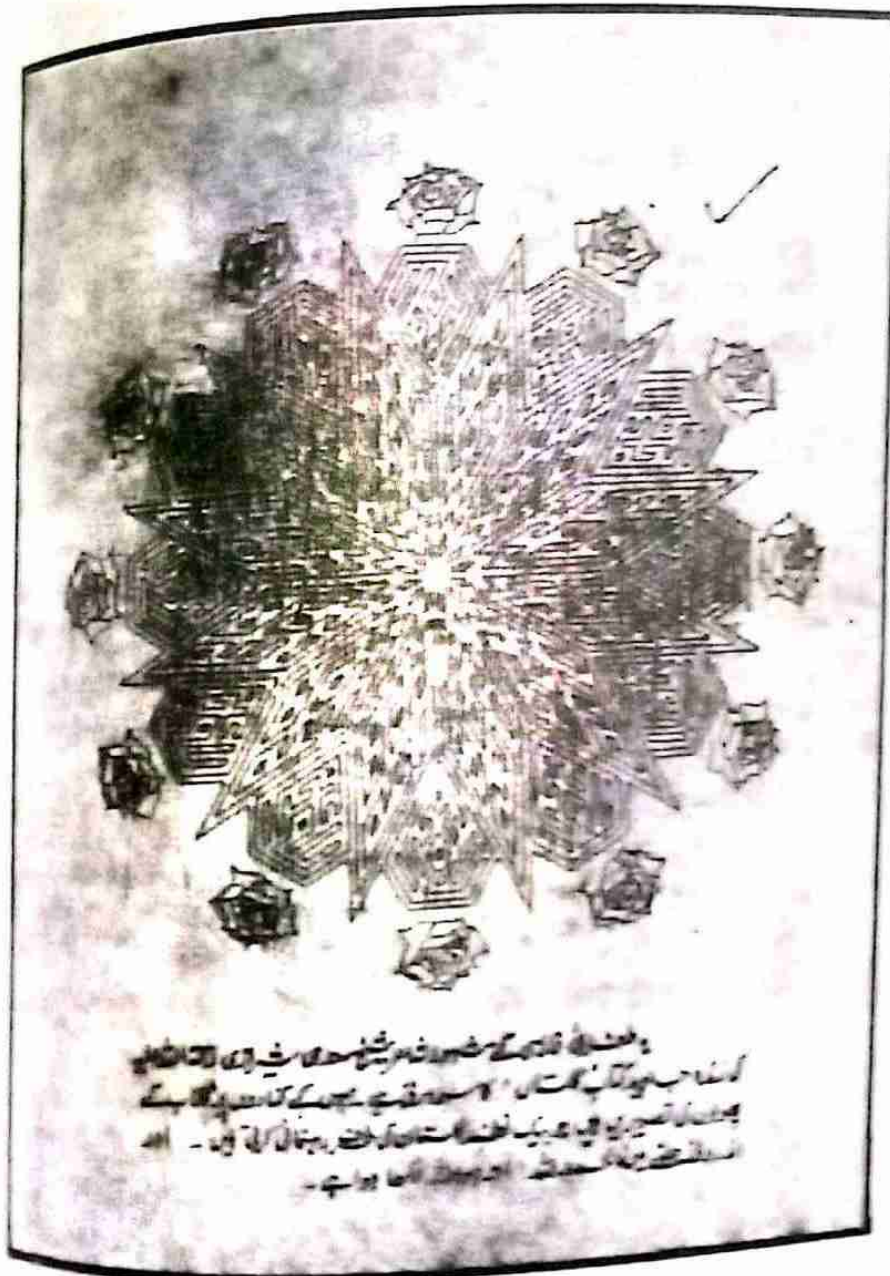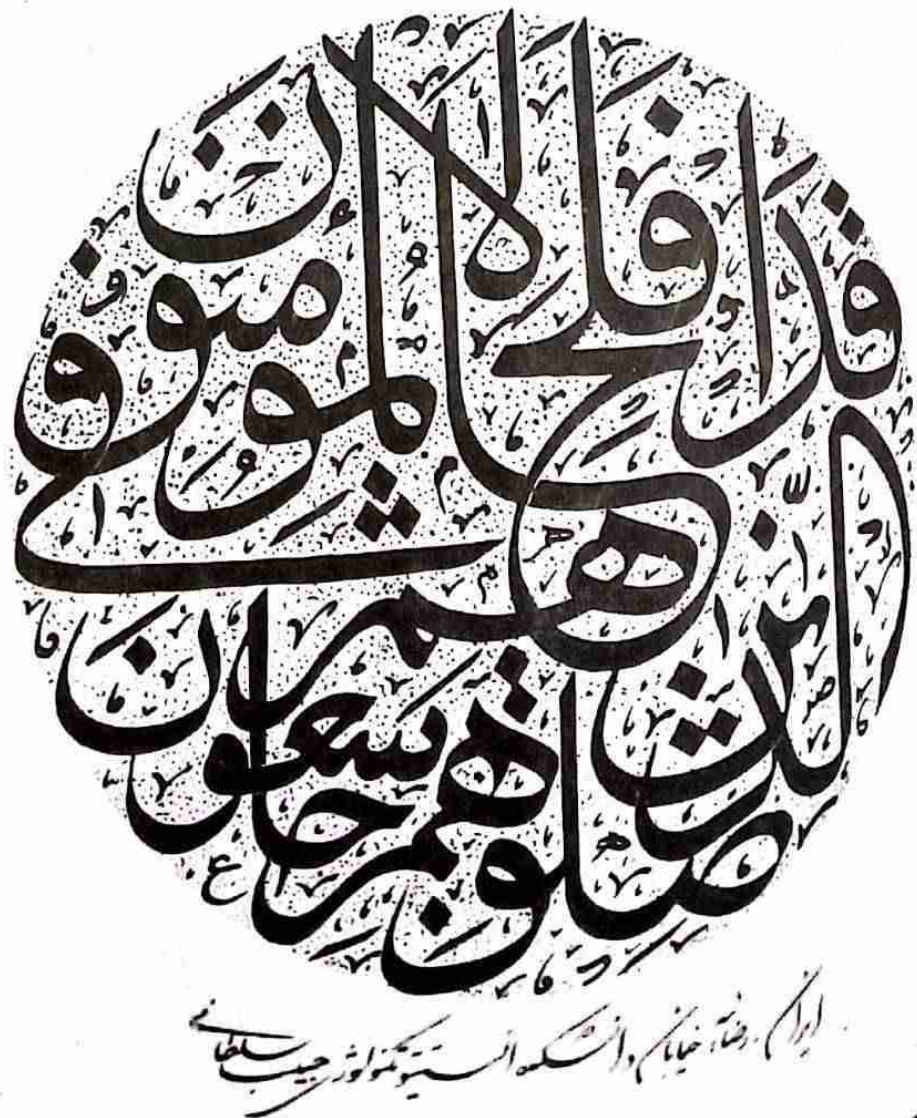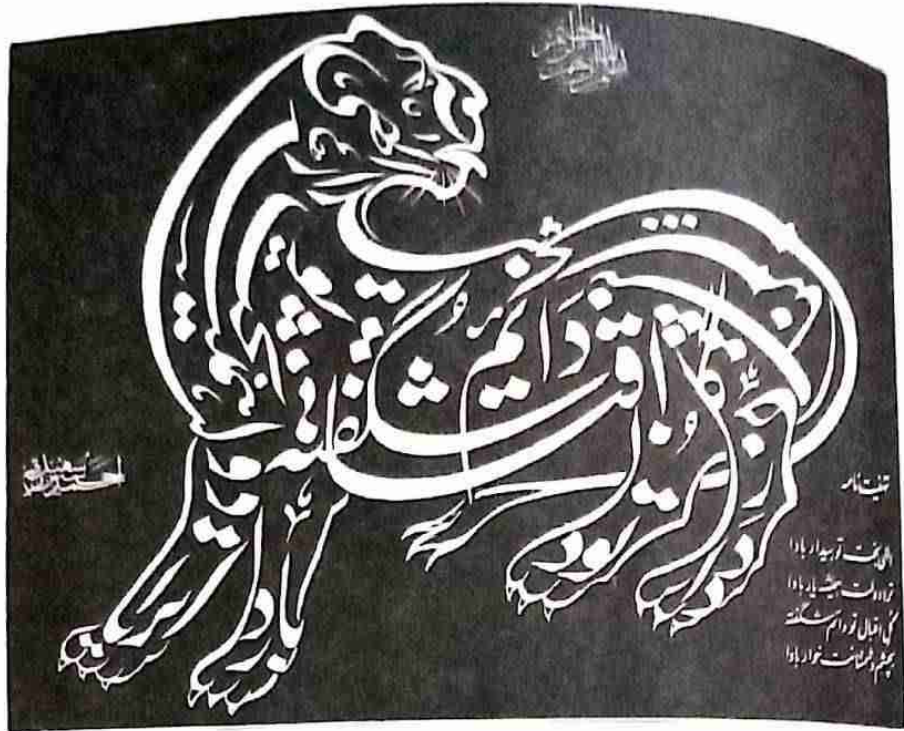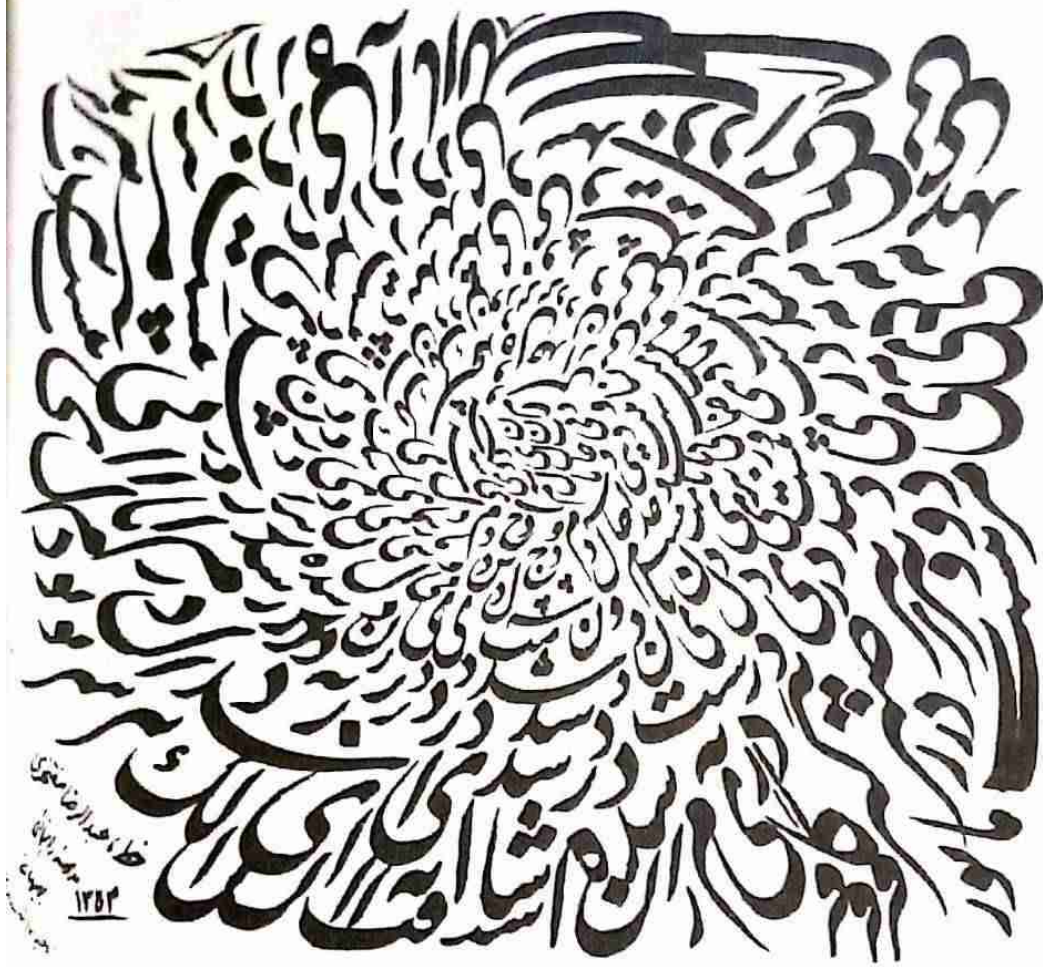
وما أبرئ نفسي إن
النفس لأمارة بالسوء إلا ما رحم ربي إن ربي غفور
رحيم ۝ وقال الملك ائتوني به أستخلصه لنفسي
فلما كلمه قال إنك اليوم لدينا مكين أمين ۝
قال اجعلني على خزائن الأرض إني حفيظ عليم ۝

سلام علیک ای نبی مکرم
مکرمت از آدم و نسل آدم

جمالیاتی اظہار کے متنوع امکانات دریافت کیے۔ یوں خطاطی مسلمانوں سے مخصوص ہو کر رہ گئی
اسلامی تہذیب کی تاریخ میں خطاطی نے جمالیاتی سطح پہ اظہار کے جو بوقلموں اسالیب ایجاد کیے ان
کی بنا پر خطاطی اور بعض مشہور اسالیب پہ باقاعدہ تحقیقی کتابیں لکھی گئیں۔ خطاطی کے جتنے دبستان
اور اہم اسالیب ہیں ان کے موجد و اساتذہ، تلامذہ جدتوں اور اختراعات کا بالکل اسی طرح
ذکر کیا جاتا ہے جیسا ہمارے ہاں شاعری کے اہم اساتذہ اور تلامذہ کا تذکرہ ہوتا ہے۔

اہم خطوط کا مختصر بلکہ مختصر ترین تذکرہ کیا جاتا ہے۔ جس سے اور نہیں تو اجمالی طور پہ ہی
خطاطی کی متنوع جہات کا اندازہ ہو جائے گا۔

"نسخ":

محققین کا خیال ہے کہ خط کوفی کے پہلو بہ پہلو یہ خط مدینہ اور مکہ میں مستعمل تھا۔ اس کا
ماخذ نبطی بتایا جاتا ہے۔ قرآن مجید اس خط میں بھی لکھا جاتا رہا۔ بعض ماہرین کے نزدیک ابن
مقلہ اس کا موجد تھا۔ جیسا کہ مولانا امتیاز علی خاں عرشی نے جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے مدرسہ کتابت
کی افتتاحی تقریب میں نسخ کے بارے میں فرمایا "گیارہویں صدی کے شروع میں بغداد کے ایک
وزیر ابن مقلہ کے ثلث کے دائروں میں کچھ گولائی بڑھانے اور کششوں میں غیر ضروری لمبائی
کم کرنے سے نسخ پیدا ہوا"[۳۴] ابو علی ابن مقلہ (متوفی ۳۲۸) نے اگرچہ اسلامی خطاطی کے جمالیاتی
امکانات دریافت کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ مگر بعض اسے نسخ کا موجد تسلیم نہیں کرتے[۳۵] لیکن
اس سے کچھ فرق نہیں پڑتا۔ کیونکہ اس نے جو دیگر اسالیب ایجاد کیے ان کی بنا پہ وہ یقیناً خطاطی میں
جینئس کا درجہ اختیار کر جاتا ہے۔ ابوالفضل اسے نسخ کا موجد تسلیم نہیں کرتا۔ وہ "آئین اکبری" میں لکھتا
ہے کہ ابن مقلہ نے ۳۱۰ ہجری میں معقلی اور کوفی سے ثلث، توقیع، رقاع اور نسخ، ریحان محقق اور
غبار ایجاد کیے۔ جہاں تک نسخ کا تعلق ہے تو اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ کچھ اور ماہرین اس کا موجد
مستعصمی کو سمجھتے ہیں جبکہ ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی کے بموجب: "یعقوب مستعصمی (متوفی ۶۹۶ ہجری)

نے اس میں ایک خاص حُسن بھر دیا ہے۔ جس سے خط اسلامی یعنی طرز نسخ نے ایک خاص حیثیت اختیار کر لی ہے۔ بعض اسے خط یاقوت کا موجد بھی سمجھتے ہیں۔ لیکن اس کی تردید بھی کی جاتی رہی ہے، چنانچہ اظہر حسین جعفری نے اپنے مضمون "تین خطوں کے موجد ابن مقلہ" میں انہیں صرف محقق، ریحان اور نسخ کا موجد بتایا ہے۔

"خط ریحان کا موجد ریحانی تھا۔ خط نسخ ابن مقلہ سے پہلے وجود میں آچکا تھا۔ اس لیے وہ اس کے موجد نہیں ہو سکتے۔ (غالباً انہوں نے اس خط کی اصلاح کی تھی اور خوش نویسی کے اصول مقرر کیے تھے)، خط محقق کو بعض نے ابن بواب کی ایجاد بتایا ہے۔ خط توقیع کا موجد یوسف (شاگرد اسحاق بن حماد شامی) تھا رہا خط ثلث سو یہ خط ثلثین سے کسی قدر مختلف تھا اور ثلثین کا موجد یوسف کا بھائی ابراہیم آل شیری اور شاگرد اسحاق بن حماد شامی تھا۔"[۳۷]

"تعلیق"

ڈاکٹر طارق عزیز نے مختلف حوالوں کی امداد سے لکھا ہے کہ "حسن بن حسینی علی فارسی نے خط رقع اور خط توقیع کی آمیزش سے ایک نیا خط تعلیق وضع کر لیا۔ حافظ یوسف سدیدی نے یاقوت الدومی المستقصی (پورا نام یاقوت بن عبداللہ الدومی) کو خط تعلیق کا موجد قرار دیا ہے۔ محمد سجاد مرزا نے خط تعلیق کے اجراء کا زمانہ چوتھی صدی ہجری اور پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ نے ایم ایس ڈیمنڈ کے حوالے سے تیرھویں صدی عیسوی قرار دیا ہے۔ محتاط تحقیق سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا اجراء پانچویں صدی ہجری میں ہوا۔"[۳۸]

جامی کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

"کاتباں را ہفت خط باشد بطرز مختلف
ثلث و ریحان و محقق نسخ و توقیع و رقع

بعد ازاں تعلیق آں خط است کش اہلِ عجم
از خط توقیع استنباط کردند اختراع

خط تعلیق شاہی رسل و رسائل، سرکاری کاروبار اور عام مراسلت میں استعمال ہوتا تھا۔ اس لیے اس کا دوسرا نام خط ترسیل بھی مشہور ہوگیا۔ یہ خط پیچیدہ تھا۔ اس کے حرفوں کے پیچ و خم دیکھ کر فانی ایک موقعہ پر کہتا ہے:

اے زلف تو پیچیدہ تر از خطِ ترسیل
بہ دامن زلف تو مرا دست توسل

خواجہ ابو العالی بک نے فارسی زبان کے مخصوص حروف پ۔ چ۔ ژ۔ گ ایجاد کیے۔ (پہلے گ پر بجائے دو لکیروں کے تین نقطے رکھے جاتے تھے)، اور خط تعلیق میں اتنی اصلاح کی کہ لوگ انہی کو اس کا موجد سمجھنے لگے۔"[39]

یہ پہلا خط ہے جو کسی ایرانی نے ایجاد کیا تھا۔ جہاں تک خود لفظ تعلیق اور خط کی ایجاد کا تعلق ہے تو مولانا امتیاز علی خاں عرشی کے بموجب: "تعلیق عربی میں لٹکانا کا مترادف ہے۔ کتابوں کے مشکل الفاظ یا مطالب کی تشریح یا توضیح کے سلسلے میں اہلِ علم برجستہ کچھ جملے کتاب کے حاشیوں پر یا بین السطور میں لکھ دیا کرتے تھے۔ اور انہیں تعلیقات کہتے تھے۔ عموماً یہ نوٹ اپنے ذاتی استعمال کے لیے لکھے جاتے تھے۔ اس بناء پر سادہ خط بھی ہوتے تھے۔ خواجہ تاج الدین سلمانی نے اسی سادہ و رواں انداز تحریر کے اصول اور ضابطے بنائے اور اسے خط تعلیق کا نام دیا۔ یہ نام بعد میں مختصر ہو کر صرف تعلیق رہ گیا۔ یہ خط بہت جلد مقبول ہوگیا۔ چنانچہ کئی برس تک نسخ کے پہلو بہ پہلو قائم رہا۔"[40]

ابو الفضل نے تعلیق کو رقع اور توقیع سے مستخرج بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ: "خواجہ تاج الدین سلمانی ششش قلم نے اس خط میں کمال پیدا کیا۔ بعض افراد کی رائے ہے کہ یہی شخص خط تعلیق کا موجد ہے۔"[41]

نستعلیق

بقول ڈاکٹر محمد عبداللہ چغتائی "مستند طور پر خط نستعلیق کا موجد میر علی تبریزی کو تسلیم کیا جاتا ہے میر علی بغداد میں سلطان احمد جلائر (۷۸۴ - ۸۱۳ھ) کے دربار سے منسلک تھا۔" [42]

اس خط نے نسخ اور تعلیق کے ملاپ سے جنم لیا۔ جیسا کہ میر علی تبریزی کے شاگرد سلطان علی مشہدی کے اس شعر سے بھی ثابت ہو جاتا ہے۔

نسخ و تعلیق گر خفی و جلی ست
واضع الاصل خواجہ میر علی ست
وضع فرمود او ز ذہن دقیق!
از خط نسخ و ز خط تعلیق [43]

ابوالفضل نے "آئین اکبری" میں میر علی تبریزی کے اس کے موجد ہونے کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "یہ روایت صحیح نہیں کیونکہ اس سے پیشتر بھی اس خط میں چند رسالے دیکھے گئے ہیں۔" [44]
ان تحقیقی بحثوں سے قطع نظر خط نستعلیق کی صورت میں اسلامی خطاطی نقطۂ عروج تک پہنچ جاتی ہے۔ اب تک مختلف خطوط کی صورت میں گویا خطاطی سے وابستہ فنی اور جمالیاتی امکانات کی جستجو کی جا رہی تھی۔ اگرچہ خطاطی کے دیگر اسالیب بھی انفرادی حیثیت میں عصری تقاضے پورے کر رہے تھے۔ لیکن ان میں چیزے دیگر کی کمی کا احساس بھی تھا۔ جسے نستعلیق نے پورا کر دیا۔ خط کوفی کی صورت میں عربی رسم الخط کے جس سفر کا آغاز ہوا اس نے نستعلیق کی صورت میں مکمل جمالیاتی قدر کو پا لیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی خطاطی کے مزید اسالیب وضع ہوتے رہے مگر یوں محسوس ہوتا ہے کہ نستعلیق کی صورت میں علم خطاطی نے معراج حاصل کر لی۔ اس کا حسن قائم بالذات ہے۔ اس میں کشش کی محرکات، دائروں کی ساخت اور نقطوں کی نفاست کا اپنا داخلی معیار جمال ہے۔ جو کسی سے مستعار نہیں ہے۔

توزک میں ایسا دعویٰ نہیں کیا۔

اہل لکھنو نے جہاں تہذیب و تمدن کے دیگر شعبوں میں جدت پسندی سے اختراعات کیں وہاں انہوں نے خطاطی میں بھی ایجادات کیں۔ چنانچہ مرزا جعفر حسین کی تالیف "لکھنؤ کی ایجادات و اختراعات" سے معلوم ہوتا ہے کہ خط معکوس اہل لکھنؤ نے ہی ایجاد کیا تھا۔ چاول یا چنے کی دال پر قل ھو اللہ تحریر کرنا، ناخن سے قلمکاری یا شبیہ سازی بھی ان کی اختراعات میں سے ہیں۔

اردو رسم الخط کا مسئلہ:

تو یہ ہے وہ تناظر جس میں اردو رسم الخط نے نشوونما پائی۔ مسلم حکمرانوں اور مغل بادشاہوں میں اکبر سے لے کر شاہجہان تک مسلم خطاطی کی خوب سرپرستی ہوئی جس کی تفصیلات معاصر تواریخ میں محفوظ ہیں۔ مسلم حکومت ہونے کی بناء پر یہاں خود بخود اسلامی خطاطی مروج ہو گئی۔

رسم الخط کے بارے میں لکھنے والے ماہرین نے اردو رسم الخط پر جو اعتراضات کیے ہیں۔ ان میں غالباً قدیم اور بنیادی اعتراض یہ ہے کہ ایک آواز کی ادائیگی کے لیے دو دو حروف ہیں۔ جیسے الف ع ۔ ہ ح ۔ ت ط ۔ ث س ص ۔ ذ ز ض ظ وغیرہ۔ لیکن اس اعتراض کا غالباً جواب بھی اتنا ہی قدیم ہے کہ یہ سب حروف قرآن مجید اور عربی الفاظ و اصطلاحات کی درست تحریر اور صحیح املا کے لیے ہیں۔ اسے یوں بھی سمجھیے کہ اگر حیدر آباد دکن کے لوگ ک کو خ بولتے ہیں اور لاہوری ر کو ڑ تو ان کی سہولت کے لیے نہ تو ک ابجد سے خارج کیا جا سکتا ہے اور نہ ر کو ڑ میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال رسم الخط اور اس کے حوالے سے املا کی بحث بہت پرانی ہے۔ اس موضوع سے سنجیدہ دلچسپی رکھنے والے حضرات ان کتب کا مطالعہ فرما سکتے ہیں:

۱۔ سید مسعود حسین رضوی ادیب "اردو زبان اور اس کا رسم خط" لکھنؤ ۱۹۴۸ء

۲۔ رشید حسن خاں "اردو املا" دہلی ۱۹۷۴ء

۳۔ پروفیسر سید محمد سلیم "اردو رسم الخط" کراچی ۱۹۸۱ء

خطاطی کے اسالیب

مرتضیٰ قلی خاں شاملوں (حاکم ہرات) نے گیارہ سو ہجری میں خط شکستہ ایجاد کیا۔ جو نستعلیق ہی کی مختصر صورت تھی۔ اسے زود نویسی کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر ایجاد کیا گیا تھا۔ یہ دفتری ضروریات کے لیے تھا اور صدیوں تک ہندوستان میں مستعمل رہا۔ ہمارے ہاں اب بھی جائیداد اور زمین کی خرید و فروخت کی رجسٹریاں اسی میں لکھی جاتی رہی ہیں۔

"شکستہ آمیز (شفیعہ) مرتضیٰ قلی شاملو کے میر منشی محمد شفیع نے ایجاد کیا۔ یہ گویا نستعلیق کی مختصر ترین صورت تھی۔"[45]

عام اور کاروباری ضروریات کے ساتھ ساتھ جمالیاتی ذوق کی تسکین کے لیے کچھ ایسے خطوط بھی ایجاد کیے گئے جو عملی یا افادی ہونے کی بجائے تزئینی اور آرائشی تھے۔ ان میں سے بیشتر میں یہ اہتمام کیا جاتا تھا کہ الفاظ و حروف کے باہمی امتزاج پیوستگی اور ہم آہنگی سے جانور، پھول شبیہ یا تصویر بنا دی جائے۔ ان میں سے بیشتر خطوط ایسے ہیں کہ ان کے نام سے ہی یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ کس نوعیت کے ہیں۔ جیسے خط گلزار، خط ماہی، خط طاؤس، خط ہلال و بدر، خط گوہر، خط خشت، خط غبار، خط لرزہ، خط زلف عروس، خط منشور، خط توام، خط طغریٰ، خط سنبل خط پیچاں، خط ناخن، خط معکوس، ان کے علاوہ خطوط کی مزید اقسام بھی ہیں۔[46] جیسے خط بہار یا بہاراں۔ اس خط کے بارے میں ڈاکٹر وحید قریشی لکھتے ہیں۔ "نستعلیق کے ساتھ اس کا یہ رشتہ ٹھہرا ہے کہ یہ اسی شاخ سے پھوٹا ہے۔ اس کے بعد اس کا قریبی تعلق نسخ اور کوفی کے ساتھ ہے۔ بلکہ اپنے ارتقاء کے آخری منازل میں تو یہ خط کوفی کی طرف زیادہ ہی مائل ہو گیا تھا۔ جس کے بنا پر بعض محققین اسے کوفی اور نسخ کی درمیانی کڑی قرار دیتے ہیں۔"

خط بابری، یہ خط مغل سلطنت کے بانی بابر کے نام سے منسوب ہے بلکہ بعض محققین تو بابر ہی کو اس خط کا موجد گردانتے ہیں۔ جو خود اعلیٰ درجہ کا خوش نویس بھی تھا مگر اس نے اپنی

۴۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری — "زبان اور اردو زبان" — لاہور ۱۹۷۳ء

۵۔ 〃 〃 〃 — "اردو املا اور رسم الخط" — لاہور ۱۹۷۷ء

۶۔ 〃 〃 〃 — "ہندی اردو تنازع" — کراچی ۱۹۷۷ء

۷۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ — "اردو املا" — دلی ۱۹۶۶ء

۸۔ محمد سجاد میرزا — "اردو رسم خط" — حیدرآباد ۱۹۴۰ء

۹۔ عبدالقدوس ہاشمی — "ہمارا رسم الخط" — دلی ۱۹۴۹ء

۱۰۔ 〃 〃 — "رومن رسم الخط اور پاکستان" — کراچی ۱۹۶۳ء

یہ محض چند کتابیں ہیں۔ ان کے علاوہ اس موضوع پر پاکستان اور ہندوستان کے ادبی اور تحقیقی جرائد وقتاً فوقتاً اہم ناقدین اور محققین اور ماہرین لسانیات کے مقالات طبع کرتے رہتے ہیں۔ ان سب کے مطالعے سے اس اہم مسئلہ سے وابستہ مباحث کے تنوع کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں ان مقالات کا مطالعہ خاصا سودمند ہو سکتا ہے۔

۱۔ ڈاکٹر ابو محمد سحر — "اردو املا اور اس کی اصلاح" — نگار پاکستان کراچی اگست ۱۹۸۶ء

۲۔ 〃 〃 — "اردو حروف تہجی" — شاعر بمبئی شمارہ ۳، ۴ ۱۹۸۶ء

۳۔ محمد حسن عسکری — "اردو کا رسم الخط: ایک مابعد الطبیعیاتی مطالعہ" — شب خون شمارہ ۵۴ الہ آباد اکتوبر ۱۹۷۰ء

۴۔ عصمت چغتائی سے[۴۷]
رشید احمد صدیقی سے[۴۸] — "ایک مسئلہ ایک بحث" — نیا دور کراچی ۵۵-۵۶۔ ۱۹۷۱ء
ڈاکٹر جمیل جالبی سے[۴۹]

حواشی

۱. لفظی معنی دور اندیش

۲. اساطیر، داستانوں اور مافوق الفطرت کی تشکیل میں انسانی تخیل کی امتزاجی صلاحیت کا بھرپور اظہار ہوتا ہے۔ یعنی دو مختلف بلکہ بعض اوقات تو متضاد اشیاء کی پیوستگی سے نیا پیکر معرض وجود میں لایا جاتا ہے۔ عالمی اساطیر میں اس انداز کے دیوتا عام ملتے ہیں۔ بھارت میں دانش کے دیوتا گنیش کا سر ہاتھی کا ہوتا ہے۔ یونانی اساطیر میں دیوتا تو انسانی صورت میں تراشے گئے مگر پھر بھی ایسی مخلوق ملتی ہے جیسے گھوڑے پر مرد کے سر والا SENTUR اور SILENE بکرے پر مرد کے سر والا SATYR جنگلوں کے دیوتا PAN کا جسم اگرچہ مرد کا تھا مگر سر پر سینگ اور پاؤں کی جگہ کھر ہوتے تھے، اور خوفناک GORGON پردار اور اژدہا کی سر والی مخلوق تھی۔ عام داستانوں کی پریاں اور جل پریاں وغیرہ بھی اسی انداز پر تخلیق کی گئیں۔

3 - SPENCE, LEWIS "THE OUTLINE OF MYTHOLOGY" P. 95

۴. الیضاً ص: ۹۸

۴. الیضاً ص: ۹، ۱۰۴

5. HAMILTON, EDITH "MYTHOLOGY" P. 308 - 309

۶. مصنف کی کتاب کا ایک حصہ بعنوان "رسم خط یا لپی کا ماضی" ہمایوں دہلی سالنامہ جنوری ۱۹۶۹ء میں شائع کیا گیا یہ اقتباس اسی سے ماخوذ ہے۔

۷. البوریحان البیرونی "کتاب الہند" ص: ۱۲۸ نوٹ: اب سنسکرت میں ۴۸ حروف ہیں۔

۸. الیضاً ص: ۱۸۳

۹. "نہر سپہر" ترجمہ محمد رفیق عابد ص: ۱۸۵

۱۰. "اورینٹل کالج میگزین" مارچ جون ۱۹۷۲ء

۱۱۔ "آئینِ اکبری" جلد اوّل ص: ۱۸۶، ۱۸۷۔

۱۲۔ پروفیسر سید محمد سلیم "اردو رسم الخط" ص: ۱۴

۱۳۔ حضرت موسیٰ نے اسی کے عہد میں جنم لیا تھا اور اسی کے محل میں پرورش پائی تھی۔

۱۴۔ "فنِ تحریر کی تاریخ" ص: ۵۷

۱۵۔ سید سبطِ حسن "ماضی کے مزار" طبع دوم ص: ۱۲

۱۶۔ "جلجامش کی داستان" ص: ۱۳

۱۷۔ محمد اسحاق صدیقی "فنِ تحریر کی تاریخ" ص: ۸۰

۱۸۔ "اشوک کے کتبات یا تو گھروشٹی رسم الخط میں ہیں جو مشرقی افغانستان اور پنجاب میں رائج تھا۔ یہ براہمی رسم خط ہے۔ گھروشٹی ایک قدیم آرامی رسم خط سے اخذ کیا گیا ہے جو ۵۰۰ ق م میں رائج تھا۔ یہ دائیں بائیں طرف لکھا جاتا تھا۔" ("تاریخ تمدنِ ہند" ص: ۴۷)

۱۹۔ اہلِ سمیر کے بارے میں اب تک یہ تصفیہ نہیں ہو سکا ہے کہ وہ کس نسل کے لوگ ہیں۔ ان کے پرانے ڈھانچوں سے بس اتنا پتہ چلتا ہے کہ ان کے دانت بڑے لمبے لمبے تھے۔ جبڑے کی ہڈی موٹی اور ابھری ہوئی تھی۔ رنگ گندمی تھا اور سر کے بال سیاہ تھے۔ بعض محققوں کا قیاس ہے کہ یہ لوگ آریا تھے لیکن ان کی زبان آریائی خاندان کی کسی زبان سے مشابہت نہیں رکھتی بلکہ بیک وقت چینی، کوریائی، تامل، بنتو، ماجیار (ہنگری) اور ترکی زبانوں سے ملتی جلتی ہے۔" ("ماضی کے مزار" ص: ۱۹)

۲۰۔ بعض عبرانی کتابوں میں خطِ عبری حضرت آدم صفی اللہ کے نام سے منسوب کیا گیا ہے۔ اور ایک گروہ نے اس خط کو حضرت ادریس علیہ السلام سے نسبت دی ہے۔ بعض اشخاص کی رائے یہ ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام نے خطِ معقلی ایجاد کیا۔ ("آئینِ اکبری" جلد اول ص: ۸۷، ۱۸۶)

۲۱۔ "تاریخ تمدنِ ہند" ص: ۳۰

۲۲۔ "اردو رسم الخط" ص: ۲۵

۲۳۔ بحوالہ "تاریخ صحفِ سماوی" از پروفیسر نواب علی ص: ۱۶۸

۲۴۔ "فن تحریر کی تاریخ" ص: ۲۰۳

۲۵۔ مجلہ "اقبال" لاہور اکتوبر ۱۹۷۳ء

۲۶۔ محمد سجاد مرزا "اردو رسم الخط" ص: ۶

۲۷۔ "خط بہار" مطبوعہ مجلہ تحقیق جامعہ پنجاب جلد ایک شمارہ ۱، ۲

۲۸۔ روزنامہ "امروز" ۲۸ جون ۱۹۷۹ء

۲۹۔ "آئین اکبری" جلد اوّل ص: ۱۸۷

۳۰۔ مقالہ مطبوعہ "شاعر" بمبئی شمارہ ۳، ۴ ۔ ۱۹۸۶ء

۳۱۔ "ع" کے بارے میں ڈاکٹر سہیل بخاری کا دلچسپ مقالہ "همزه" ملاحظہ ہو۔ مطبوعہ "اوراق" لاہور ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۵ء

۳۲۔ "تنقیدی مضامین" ص: ۳۳، ۳۴

۳۳۔ نعیم اللہ خیالی "اردو کی بین الاقوامی حیثیت" حصہ اوّل ص: ۶۶

۳۴۔ "نسخ + تعلیق = نستعلیق" مطبوعہ اخبار اردو اسلام آباد جنوری ۱۹۸۵ء

۳۵۔ "فن تحریر کی تاریخ" ص: ۲۱۹

۳۶۔ "پاک و ہند میں خط نستعلیق" مطبوعہ مجلہ "اقبال" لاہور اکتوبر ۱۹۷۳ء

۳۷۔ "فن تحریر کی تاریخ" ۲۱۸، ۲۱۹

۳۸۔ "اردو رسم الخط اور ٹائپ" ص: ۱۸

۳۹۔ "فن تحریر کی تاریخ" ص: ۲۲۰

۴۰۔ "نسخ + تعلیق = نستعلیق" مطبوعہ اخبار اردو اسلام آباد جنوری ۱۹۸۵ء

۴۱۔ "آئین اکبری" ص: ۱۸۸

۴۲۔ "پاک و ہند میں خط نستعلیق"، مجلہ "اقبال" اکتوبر ۷۳ء

[illegible] ص: ۲۲۱

۴۴ ۔ "آئین اکبری" ص: ۱۸۹

۴۵ ۔ "فن تحریر کی تاریخ" ص: ۲۲۱

۴۶ ۔ مزید تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر وحید قریشی کا مقالہ "خط بہار" مجلہ تحقیق شمارہ نمبر ۱، ۲ ۔

۴۷ ۔ عصمت چغتائی: "اردو رسم الخط بدل دیا جائے"

۴۸ ۔ رشید احمد صدیقی: "کچھ اردو رسم الخط کے بارے میں"

۴۹ ۔ ڈاکٹر جمیل جالبی: "صورت اور معنی کا رشتہ"

۶- اُردُو میں لُغت نویسی

"لغت (ع) اسم مذکر (۱) کسی قوم کی زبان، بولی، بھاشا وہ اصوات یا کلمات جن کے وسیلے سے آدمی اپنے مطالب و اغراض بیان کرے۔ (۲) وہ الفاظ جن کے معنی مشہور نہ ہوں (۳) لفظ، شبد، کلمۂ مفرد، ورڈ (۴) ڈکشنری[1]۔ کوش، کتاب لغت، فرہنگ۔"[2]

"فرہنگ (ف) اسم مونث (۱) دانش، دانائی، سمجھ، عقل و ادب، فہم، فراست، قیاست (۲) کتاب لغات فارسی"[3]

لُغت کیوں؟

لغت کے نام ہی میں اس کا استعمال ضرورت اور افادیت پوشیدہ ہے۔ یہ جاننا دلچسپی کا باعث ہوگا کہ لغت کا آغاز کیوں ہوا۔ اگرچہ اس پہ خاصی خامہ فرسائی ہوئی ہے۔ تاہم سیدھی سی یہی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ اس کی ابتداء کا تدریس سے کچھ نہ کچھ تعلق ضرور ہوگا۔ دوران تدریس مُعلّم متعدد ایسے الفاظ استعمال کرجاتا ہے جن کے معنی سے طلبا ناآشنا ہوتے ہیں یا پھر سبق میں بھی ایسے الفاظ مل جاتے ہیں جن کے معنی سے طلباء ناواقف ہوتے ہیں۔ ذہین طالب علم سبق کی بہتر تفہیم، یادداشت اور مستقبل کی ضرورت کے تحت ان مشکل الفاظ کے معانی قلمبند کرتا جاتا ہوگا۔ کسی طالب علم نے انہیں بلا ترتیب ایام تدریس کے مطابق لکھا ہوگا۔ کسی نے کتب کے موضوعات اور مسائل کے مطابق اور کسی نے سب الفاظ کو حروف تہجی کے مطابق ترتیب دے دیا ہوگا۔ یہ طالب علمانہ سعی لغت کی ابتدائی صورت ہوسکتی ہے۔ ہرچند کہ یہ خاصی خام اور نامکمل بھی ہوتی ہوگی

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ خود معلم طلباء کی تدریسی ضروریات کے مطابق مشکل الفاظ اور ان کے معنی کی فہرست مرتب کرا دیتا ہو۔ الغرض یہی دو محرک نظر آتے ہیں جن کے نتیجے میں فہرست الفاظ نے ایسی کتاب کی صورت اختیار کی ہو گی جسے لغت، فرہنگ، ڈکشنری، کوش وغیرہ کا نام دیا گیا۔[۴]

بعض اوقات اس صورت میں بھی فہرست الفاظ ترتیب پا جاتی ہے جب کوئی ادیب دانشور لسانی محقق یا نقاد کسی دوسری قوم کی زبان یا تو سیکھ رہا ہو۔ یا اس کے ادب اور تاریخ وغیرہ پر تحقیقات کر رہا ہو اس صورت میں وہ اپنی یادداشت کے لیے الفاظ ان کے معنی اور مترادفات لکھتا جاتا ہے جو بالآخر لغت کی صورت اختیار کر سکتے ہیں۔ یورپین حضرات نے جو اردو کے ابتدائی لغات مرتب کیے تو اس کا ایک سبب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے خود انہوں نے زبان سیکھنے کے لیے الفاظ جمع کیے۔ اسی انداز پر ڈاکٹر جمیل جالبی کی "قدیم اردو کی لغت" کو ان کی "تاریخ ادب اردو" کی ضمنی پیداوار قرار دیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے اس کے پیش لفظ میں خود بھی اس کا اعتراف کیا ہے:

"اس لغت کی داستان یہ ہے کہ تاریخ ادب اردو پر کام کرتے ہوئے مجھے سینکڑوں مخطوطات اور بیاضوں کے صحراؤں سے گزرنا پڑا۔ دوران مطالعہ اکثر ایسے لفظوں سے واسطہ پڑا جو میرے لیے اجنبی تھے۔ میں ان لفظوں کو ایک کاپی میں لکھ لیتا اور پھر سیاق و سباق کے حوالے، مختلف لغات کی مدد اور اہل علم سے گفتگو کرنے کے بعد جب ان لفظوں کے معنی متعین ہو جاتے تو ان کے سامنے لکھ دیتا تھا۔"[۵]

یہ کام دس برس (۱۹۶۱ء - ۱۹۷۱ء) میں مکمل ہوا اور لغت تقریباً گیارہ ہزار الفاظ پر مشتمل ہے۔

بعض اوقات یہ بھی ہوتا ہے کہ کسی کتاب کے آخر میں مؤلف یا مرتب مشکل الفاظ کے معنی درج کر دیتا ہے۔ جیسے ڈنکن فاربس نے لندن سے "باغ و بہار" کا جو مستند ایڈیشن (۱۸۴۳ء) میں شائع کرایا اس کے آخر میں انگریز قارئین کی سہولت کی خاطر اردو الفاظ کے معنی انگریزی میں درج کیے جو ۱۲۳ صفحات پر پھیلے ہیں۔ اس انداز کی فہرست الفاظ عمومی ہونے کے باوجود اساسی طور

پہ یک موضوعی ہوتی ہے۔

اگرچہ ہمارا موضوع صرف اردو لغات ہیں لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یورپین یا انگریزوں نے صرف اردو ہی کے لغت تیار کیے۔ ایسا نہیں، وہ جس علاقے میں بھی گئے زبان سیکھنے کے دوران انہوں نے لغات مرتب کر دیئے۔ اس ضمن میں پنجابی، پشتو، سندھی اور بھارت کے بڑے صوبوں کی زبانوں جیسے بنگلہ، تامل، تیلگو وغیرہ کی بھی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ الغرض یہ ہیں وہ چند قیاسات جن کی روشنی میں لغت کی ضرورت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ بہرحال تدوین لغت کے محرکات خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں، یہ طے ہے کہ آج کسی بھی زبان کا لغت کے بغیر تصور محال ہے۔

عام تصور کے برعکس لغت الفاظ کا سٹور روم نہیں، نہ لفظوں کی کالونی اور نہ ہی یہ الفاظ کی شکرگاہ بلکہ یہ تو زبان کی ترقی اور نشو و نما کے مختلف مراحل منعکس کرنے والا آئینہ ہے۔ جس طرح شہر کے لوگ کسی ملک کی تہذیب و تمدن کے مظہر ہوتے ہیں، بلحاظ زبان لغت بھی ایسی ہی اہمیت اختیار کر لیتا ہے۔ جن لغات میں الفاظ کے اشتقاق اور مختلف ادوار میں الفاظ کے معنی میں تغیرات کو اشعار یا تخلیقات کی مثالوں سے اجاگر کیا جاتا ہے۔ ایسے لغات بلاشبہ زبان کے تخلیقی سفر کی روداد میں تبدیل ہو جاتے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ ماخذ اور اشتقاقات کی بنا پر اس امر کا تعین بھی ہو سکتا ہے کہ زبان میں کتنے ملکی الفاظ ہیں اور کتنے غیر ملکی۔ دخیل، غریب اور یتیم۔ یوں دیکھیں تو لغت الفاظ کی تعریف اور ان کی حیات کے بارے میں اساسی نوعیت کی معلومات بہم پہنچانے کی بنا پر لسانی اہمیت بھی اختیار کر جاتا ہے۔ فکر و فلسفہ، شعور و تخیل کی اساس الفاظ پر استوار ہوتی ہے۔ لغت کسی قوم کی ترقی کے ساتھ ساتھ تہذیبی ترقی کا بھی مظہر ثابت ہوتا ہے۔ لغت کو محض لفظ شماری نہ سمجھا جائے کہ تعداد الفاظ وسعت زبان کی غماز ہوتی ہے۔

لُغت نویسی کا آغاز:

لغت اور زبان جام و مینا کی مانند ہیں یہ ناممکن ہے کہ زبان ہو۔ اس کے مخصوص الفاظ، یا

اصطلاحات ہوں، ذخیرۂ الفاظ ہو، مگر ان سب کو یکجا کرنے والا لغت نہ ہو۔ رسم الخط کے ارتقائی مراحل کے مطالعے میں اس امر سے آگاہی ہو چکی ہے کہ لفظ پہلے تصویری روپ میں، اور اس کے بعد میخی یا پیکانی صورت میں تھا۔ ان قدیم زبانوں میں اساطیر لکھی گئیں۔ تواریخ قلمبند کی گئیں اور تخلیقات بھی ہوئیں۔ تو یہ کیسے ممکن تھا کہ جب زبان (اپنے زمانے کے حالات کے مطابق) ترقی یافتہ ہو وہ تعلیم وتدریس اور کاروباری مقاصد کے لیے استعمال ہو رہی ہو اور اس میں کوئی لغت نہ ہو۔ قدیم متروک اور مردہ زبانوں میں بھی لغات ہوں گے یہ الگ بات ہے کہ امتداد زمانہ سے وہ ناپید ہیں۔ یہی نہیں بلکہ جن زبانوں میں اب قدیم لغات دستیاب ہیں ان میں بھی بعض اوقات قدیم ترین لغات ناپید ہیں۔ جیسے یونانی زبان کے بارے میں بتایا جاتا ہے کہ ذینوڈوٹس کے مطبوعہ لغت گلوسو ("GLASSO") ۔ انگریزی لفظ "GLOSSARY" اسی سے ماخوذ ہے) سے قبل ۲۵ لغات لکھے جا چکے تھے جو اب ناپید ہیں۔ ذینو بطلیموس اول اور دوم کے زمانوں میں اسکندریہ کے کتب خانے کا مہتمم تھا۔[۴]

جہاں تک انگریزی زبان میں لغت مدوّن کرنے کا تعلق ہے تو "اردو لغت نویسی اور اہل انگلستان" میں پروفیسر ایس کے حسینی کے بقول "انگریزی میں لغت نویسی کی ابتدا تیرھویں صدی عیسوی سے ہوتی ہے۔ ۱۲۲۵ عیسوی میں پہلی مرتبہ جانگار لینڈ نے لاطینی الفاظ اور ان کے معنی بچوں کو حفظ کرانے کے لیے لغت کی شکل میں مدون کیے۔ جن میں الفاظ کی ترتیب موضوع کے لحاظ سے کی گئی تھی۔ لغت میں انگریزی الفاظ بھی استعمال کیے جانے لگے۔ مگر یہ لغت بھی لاطینی سیکھنے کے لیے ترتیب دیے گئے۔ اس قسم کا پہلا لغت "PROMPLORIUM PRAVOALOR" ہے۔ جو انگریزی لاطینی کا پہلا لغت ہے۔ جس کی تدوین ۱۴۴۰ء میں ہوئی۔ اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا اور ۱۵۵۲ء میں انگریزی زبان کا پہلا لغت "A BUDARIUM ANGLICO CATIUM PORTY RUNCIUS" رچرڈ ہیوم لائیٹ نے ترتیب دیا۔ ۱۵۷۳ء میں جان بیرٹ نے اپنا لغت "BEHIVE" ترتیب دیا۔ جس میں انگریزی زبان کے معنی انگریزی میں دیئے

گئے اور ساتھ ساتھ فرانسیسی اور لاطینی مترادفات بھی دیئے گئے تھے ROBERT CROWDY نے پہلی مرتبہ کوشش کی کہ زبان کے سارے لفظی سرمائے کو لغت میں جگہ دی جائے۔ اس کے لغت میں تقریباً ۲½ ہزار الفاظ شامل ہیں۔ فن لغت نویسی میں زبان کے پورے لفظی سرمایہ کو سمیٹ لینے کی یہ پہلی دانستہ کوشش ہے۔ اٹھارویں صدی میں یہ فن انگلستان میں کافی ترقی کر جاتا ہے۔ اور ۱۷۳۰ء میں بیلی نے ایک لغت "DICTION RIUM BRITANIZCUM" ترتیب دیا جس میں الفاظ کے معنی اور ان کی وضاحت کے ساتھ ساتھ الفاظ کے ماخذ سے بھی بحث کی ہے۔"[ھ]

پروفیسر الیس کے حسینی کے برعکس ڈاکٹر سہیل بخاری کا یہ کہنا ہے کہ انگریزی میں ۱۷۲۳ء میں کوک ایم نے سب سے پہلی ڈکشنری مرتب کی تھی۔[ھ]

خیر یہ تو تحقیقی بحث ہے تاہم جہاں تک انگریزی زبان کی اہم اور رجحان ساز ڈکشنری ہونے کا تعلق ہے تو سیموئیل جانسن کی "A DICTIONARY OF THE ENGLISH PEOPLE" (1775) خاصے کی چیز ہے۔ جانسن تخلیقی فن کار تھا۔ اس نے محض "KING'S ENGLISH" کے برعکس گلی کوچوں میں بولے جانے والے عوامی الفاظ اور دیگر زبانوں کے الفاظ بھی شامل کر کے صحیح معنوں میں انگلش پیپل کی ڈکشنری مرتب کی۔

ڈاکٹر سہیل بخاری کے بموجب: "سنسکرت لغات میں امرکوش کا نام سب سے پہلے آتا ہے۔ اسے لکھنے والا امر سنگھ ایک ہزار عیسوی سے پہلے گزرا ہے۔" یہ متعدد مرتبہ کلکتہ (۱۸۰۷ء، ۱۸۳۴ء) بمبئی (۱۸۶۰ء) لکھنؤ (۱۸۶۳ء) مدراس (۱۸۷۰ء) سے طبع کیا گیا۔ امرویدک کے نام سے مہیشور نے اس کی شرح (بنارس ۱۸۶۷ء) لکھی۔

عربی لغات میں خلیل ابن احمد متوفی ۱۶۰ ہجری کی کتاب العین اولیت کی حامل ہے۔ یہ اس نے ۴۰ برس کی عمر میں لکھی۔

جہاں تک ایران میں لغت نویسی کے آغاز کا تعلق ہے تو آقائے محمد علی داعی الاسلام کی تالیف

" فارسی لغت نویسی کی تاریخ "[9] میں یہ معلومات ملتی ہیں کہ " پہلی صدی ہجری میں عربی اور پہلوی کی آمیزش سے فارسی نے جنم لیا۔ دوسری صدی ہجری فارسی شاعری کا آغاز ہوا اور تیسری صدی ہجری میں سب سے پہلے اہل توران نے شعراء کے مخصوص لفظوں کی فرہنگ کی ضرورت محسوس کی چنانچہ سب سے پہلے ابوحفصی سعدی نے ایک لغت ترتیب دی۔ اس لغت کا کوئی نسخہ دنیا کے کسی کتب خانے میں موجود نہیں۔ مولف جہانگیری نے اسے اپنا ماخذ قرار دیا ہے اور محمد قاسم سروری کاشانی نے بھی اسے اپنے مواد تالیف میں شمار کیا ہے۔ خراسان میں بھی تیسری صدی ہجری میں فرہنگ کی ضرورت محسوس کی گئی چنانچہ رودکی المتوفی (۳۲۹ھ) نے تاج المصادر کے نام سے ایک فرہنگ لکھی مگر اب رودکی کی شاعری کی طرح اس کا بھی کوئی نسخہ موجود نہیں ہے۔ تاج المصادر کے بعد تیسری فرہنگ شعری ابوالحسن علی ابن احمد الاسدی الطوسی کی تالیف لغت مُفرس ہے، (۴۶۲ء) یہ لغت کئی اعتبار سے بہت اہم ہے۔ اول یہ کہ معلوم تاریخ کے بعد فارسی کی سب سے پہلی (شعری لغت ہے) دوسرے یہ کہ بعد کے لغت نولیسوں کا ماخذ رہی ہے۔ سوم یہ کہ اساتذہ قدیم کے بہت سے اشعار بھی ہیں جو کسی دوسری جگہ دستیاب نہیں۔ قدیم شعراء اور اساتذہ کا تذکرہ ہے۔ اس میں تقریباً ۷۶ ایسے شعراء اساتذہ کا تذکرہ ہے جو اور کہیں نظر نہیں آتا۔ چہارم یہ کہ کلیلہ ودمنہ اور رودکی کے گمشدہ سندباد کے اشعار بھی ہیں۔ اسی طرح عنصری کی وامق وعذرا کے اشعار بھی ہیں جو کسی جگہ موجود نہیں۔"

صاحب مقالہ نے متعدد قدیم فرہنگوں کا تعارف کروایا ہے۔ ڈاکٹر سہیل بخاری نے محولا بالا مقالہ میں لکھا ہے، " فارسی لغت کی کتابوں میں سب سے پہلا نمبر "برہان قاطع" کا آتا ہے۔" مگر یہ درست نہیں جیسا کہ آقائے محمد علی کے مقالہ سے واضح ہو جاتا ہے۔

ہندوستان میں قدیم لغات:

جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو ان کی زبانوں عربی، فارسی، ترکی وغیرہ کے الفاظ

اور مقامی زبانوں اور بولیوں کے الفاظ کے امتزاج سے اس لسانی عمل کا آغاز ہو گیا جو بالآخر اردو کی صورت میں پایۂ تکمیل تک پہنچا۔ ظاہر ہے اردو کے تشکیلی دور میں لغت کی ضرورت محسوس نہ ہوئی ہوگی۔ حکمران اور خواندہ حضرات کی زبان فارسی تھی۔ اس لیے ہندوستان میں اگر اردو کے مقابلے میں فارسی کے لغات پہلے مدون ہوئے تو وجہ ظاہر ہے۔ "پاک و ہند کی سر زمین پر سب سے پہلی فارسی فرہنگ علاؤالدین محمد خلجی کے عہد میں ۱۲۹۵ء، ۱۳۱۵ء کے مابین تالیف ہوئی۔ یہ فرہنگ خلجی دربار کے امیر مولانا محمد فخر الدین مبارک شاہ غزنوی المعروف بہ قواسی نے تالیف کی جو فرہنگ قواس کے نام سے مشہور ہے۔"[۱۰]

سب سے پہلا اردو لُغت:

امیر خسرو (۱۲۵۳ء تا ۱۳۲۵ء) ہمہ جہت شخصیت کے حامل تھے۔ یہ ناممکن ہے کہ لسانیات شاعری، تصوف اور موسیقی کا تذکرہ ہو اور ان کا ذکر نہ ہو۔ یہ اپنے عہد کی عظیم ثقافتی شخصیت تھے اور تیرھویں صدی عیسوی کے ہندوستان کے اس ثقافتی انقلاب کی علامت بھی جو مسلم ہندو تہذیب و تمدن اور زبانوں کے ملاپ سے معرض وجود میں آرہا تھا۔

امیر خسرو کی متعدد موضوعات پر تصانیف میں "خالق باری" بھی شامل ہے۔ یہ منظوم لغت ہے۔ حافظ محمود شیرانی نے "پنجاب میں اردو" میں اسے امیر خسرو کی تالیف تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔[۱۱] دوسری طرف سید مسعود حسن رضوی ادیب کے بموجب: "حضرت امیر خسرو کو جس طرح اور بہت سی چیزوں میں اولیت کا شرف حاصل ہے۔ اسی طرح اردو کا سب سے پہلا لغت لکھنے کا فخر بھی انہیں کے لیے ہے۔ اب تک اردو کا کوئی ایسا لغت دستیاب نہیں ہوا جو "خالق باری" سے زیادہ قدیم ٹھہرتا۔"[۱۲]

بعض حضرات اس شعر کی وجہ سے اسے امیر خسرو ہی کی تصنیف تسلیم کرتے ہیں:

گدا بھکاری خسرو شاہ
مولوی صاحب سرن پناہ

اس لغت میں عربی، فارسی اور ہندوی الفاظ اور ان کے معانی درج ہیں۔ مسعود حسن رضوی ادیب کے بقول "خالق باری" سے پہلے اس انداز کی ایک کتاب نصاب الصبیان از ابونصر محمد بدرالدین ملتی ہے اور خسرو نے بھی وہی انداز اپنایا۔ جہاں تک اس کے نام کا تعلق ہے، تو یہ معلوم نہ ہو سکا کہ اصلی نام کیا تھا۔ لیکن مسعود حسن رضوی ادیب کے بموجب، کریمہ (سعدی) اور مامقیماں (شیخ علاؤالدین خراسانی) کی مانند اس کے پہلے دو الفاظ نام قرار پا گئے۔

۱۹۲ اشعار پہ مشتمل خالق باری کا آغاز یوں ہوتا ہے:

خالق باری سرجن ہار
واحد ایک بدا کرتار
رسول پیغمبر جان بسیٹھ
یار دوست بولی جا ابیٹھ
اسم اللہ خدا کا ناؤں
گرما ہے دھوپ، سایہ ہے چھاؤں [۱۳]

منظوم لغات:

خالق باری امیر خسرو کی تالیف ہو یا نہ ہو اس امر کا تصفیہ محققین کا کام ہے لیکن اتنا یقینی ہے کہ یہ نہ صرف مقبول ہوئی بلکہ رجحان ساز بھی ثابت ہوئی جس کا ثبوت اس کے تتبع میں لکھے گئے متعدد منظوم لغات ہیں۔ مسعود حسین رضوی ادیب کے محوالہ بالا مقالہ سے چند لغات کے نام درج کیے جاتے ہیں:

قصیدہ در لغات ہندی از حکیم یوسفی ۴۴ اشعار پہ مشتمل ہے۔

اللہ خدائی	از تجلی	۱۰۶۰ھ تقریباً ۲۵۰ اشعار
اسمائے فارسی	از منشی نوبیندہ رائے	تقریباً ۲۰۰ اشعار

لغات سعیدی	مصنف نامعلوم سنہ نامعلوم	تقریباً ۲۵۰ اشعار	
نصاب عجاب	از سید فرزند علی شوق بریلوی	۱۳۰۴ھ	۲۵۷ اشعار
فیض شاہجہانی	از مولوی غلام احمد فروغی	۱۳۱۰ھ	۴۲۰ اشعار
انوار اللغات	از حافظ انوار اللہ بیخود	۱۳۱۲ھ	

بحر الفضائل فی منافع الافاضل (دو جلدیں) از محمد بن قوام کرخی ۷۹۵ھ

یہ منظوم لغات اس لحاظ سے منفرد ہیں کہ شاید ہی اور کسی (بالخصوص یورپین) زبان میں اس انداز کا کام ہوا ہو۔ ان کے مصنفین کے مقاصد لسانی کے برعکس تدریسی تھے اور طلبہ کی نصابی ضروریات کو مدنظر رکھ کر لکھے جاتے تھے۔ کسی خاص نصاب یا سبق کے مشکل الفاظ یا معنی بتانا نہیں بلکہ عمومی طور پر ذخیرۂ الفاظ میں اضافہ مقصود تھا اور یقیناً اس مقصد میں یہ منظوم لغات کامیاب رہے ہوں گے۔ نثر کے مقابلے میں شعر دلچسپ اور بامزہ ہوتا ہے۔ مختلف الفاظ کے انفرادی طور پر معنی یاد رکھنے کے مقابلے میں شعر کی صورت میں معنی یاد کرنا آسان بھی ہے اور دلچسپ بھی۔ ان لغات میں اشعار کی تعداد زیادہ نہ ہوتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ دو اڑھائی سو اشعار کی مدد سے طلبہ کو کارآمد الفاظ پر مشتمل ذخیرۂ الفاظ مہیا کر دیا جاتا تھا۔ اگر فی شعر چار الفاظ فرض کیے جائیں تو ڈھائی سو اشعار کی لغت ایک ہزار الفاظ سکھا دیتی تھی۔[۴]

ملک میں فارسی کا چلن تھا۔ اس لیے جب اردو زبان اتنی بالغ ہو گئی کہ لغت مدون ہو سکے تو ابتدائی لغت بھی اردو شعراء کے قدیم تذکروں کی مانند ہوتے تھے۔ یعنی اردو الفاظ کے معنی فارسی میں درج کیے جاتے تھے۔ جہاں تک اس ضمن میں اوّلیت کا تعلق ہے تو بقول ڈاکٹر سید عبداللہ: "اردو میں فرہنگ نویسی کا باقاعدہ آغاز عہد عالمگیری میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اردو کا قدیم ترین لغت "غرائب اللغات" اسی زمانے میں لکھا جاتا ہے"[۵] اس کے مؤلف میر عبدالواسع ہانسوی ہیں مگر ان کے حالات کے بارے میں کوائف ناپید ہیں۔ جہاں تک اس لغت کی علمی حیثیت کا تعلق ہے تو بقول ڈاکٹر سید عبداللہ: "غرائب کی ترتیب حروف تہجی کے اعتبار سے ہے مگر یہ

محسوس ہوتا ہے کہ میر عبدالوسع کو لغت نگاری کے تقاضوں سے پوری پوری واقفیت نہ تھی۔ اس لغت میں لفظوں کی ترتیب بے حد ڈھیلی ہے اور بہت سے موقعوں پہ پہلے حرف کی رعایت سے قطع نظر لفظ کے باقی حروف کے معاملے میں بھی صحیح ترتیب کو مدنظر نہیں رکھا۔ غرائب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اردو الفاظ ہریانی تلفظ اور لہجہ کے تابع ہیں۔" (ص ۹) اسی طرح بعض لفظوں کا تلفظ پنجابی زبان کے تابع ہے۔" (ص: ۱۰)

آرزو کی نوادر الالفاظ:

سراج الدین علی خان آرزو کا ایہام کے ضمن میں تذکرہ کیا جا چکا ہے۔ شمالی ہند میں ریختہ کے فروغ میں ان کے اساسی کردار پہ بھی روشنی ڈالی جا چکی ہے۔ خان آرزو کو آج کی اصطلاح میں انسائیکلوپیڈیا ذہن کی حامل شخصیت قرار دیا جا سکتا ہے۔ شاعری ان معنی میں ان کے لیے وجۂ شہرت نہیں بنتی کہ وہ لسانیات اور تحقیق و تنقید کے ساتھ ساتھ لغت بلکہ زیادہ بہتر تو یہ ہے کہ علم لغت میں سند کا درجہ رکھتے تھے۔ فارسی میں کئی دواوین اور متعدد مثنویوں کے خالق ہیں، نثر میں بھی ان کے کارنامے وقیع ہیں۔ جب ان کی لغت نویسی کا جائزہ لیں تو اگرچہ ان کی شہرت "نوادر الالفاظ" (۱۱۶۵ھ) کی بنا پہ ہے لیکن وہ اس کے علاوہ قدیم شعراء کے کلام میں ملنے والی مخصوص اصطلاحات اور چالیس ہزار الفاظ پہ مشتمل "سراج اللغات" کے بھی مؤلف ہیں جس میں قاطع کی اغلاط کی نشاندہی بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ تقریباً پانچ ہزار الفاظ پہ مشتمل "چراغ ہدایت" ہے اور پھر "المذھر" ہے جس میں لغت نویسی کے اصولوں کی وضاحت کی گئی ہے۔

لغت کے ضمن میں "نوادر الالفاظ" ان کا اہم ترین کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ خان آرزو نے جب میر عبدالوسع ہانسوی کی اردو فارسی "غرائب اللغات" کا مطالعہ کیا تو انہیں اس میں کافی سے زیادہ اغلاط نظر آئیں۔ انہوں نے نہ صرف اغلاط کی تصحیح کی بلکہ اس وقت تک اردو میں

مستقل عربی، فارسی، ترکی، سنسکرت اور دکھنی کے الفاظ بھی شامل کر کے ان کے معنی کا تقابلی مطالعہ بھی کیا۔ یہی وجہ ہے کہ اس عہد کی زبان، اس کی تبدیلیوں اور الفاظ و محاورات کی مختلف اور بدلتی صورتوں کا جائزہ لینے کے لیے یہ لغت حوالے کی صورت اختیار کر چکی ہے۔ خان آرزو نے جس انداز میں مختلف زبانوں کے الفاظ کا تقابل کیا یہ مروج لسانی اصولوں سے مطابقت رکھتا ہے۔ انہوں نے تلفظ اور املا کے بارے میں دقت نظری کا ثبوت دیتے ہوئے عوامی استعمال کی بجائے اہل زبان کے تلفظ اور املا کو بنیاد بنایا۔ الغرض انہوں نے اس عہد میں اردو کا ایسا مستند لغت لکھا جس کی لسانی اہمیت میں دن بدن اضافہ ہی ہوتا گیا۔ "نوادر الالفاظ" کو ڈاکٹر سید عبداللہ نے مرتب کر کے مقدمہ اور حواشی قلمبند کیے۔ (مطبوعہ انجمن ترقی اردو کراچی ۱۹۵۱ عیسوی۔)

اس لغت کا تجزیاتی مطالعہ کر کے لفظ شماری سے اس امر کا تعین کیا جا سکتا ہے، کہ بارہویں صدی ہجری میں اردو زبان کے ذخیرہ الفاظ کی تعداد کتنی تھی۔ ذیل میں مختلف حروف سے بننے والے الفاظ کی تعداد درج ہے:

باب الالف ۱۲۸، باب الباء العربیہ (ب) ۱۵۹، باب الباء الفارسیہ (پ) ۱۶۲، باب التاء الفوقانیہ (ت) ۶۲، باب التاء الہندیہ (ٹ) خان آرزو کا نوٹ: "چو ایں حرف کہ مخصوص ہندوستان است مقرر است و دیگر حروف ہندیہ مخلوط التلفظ بہا برائے ایں باب علیحدہ مقرر کردہ شدہ" ص: ۱۴۱۔ ۲۹، باب الجیم العربیہ (ج) ۶۶، باب الجیم الفارسیہ (چ) ۱۴۴، باب الخاء معجمہ (خ) ۱۱، باب الدال (د) ۶۳، باب الدال الہندیہ (ڈ) ۳۰، باب الراء المہملہ (ر) ۵۳، باب الزاء المہملہ (ز) ۲، باب السین المہملہ (س) ۱۱۱، باب الشین المہملہ (ش) ۱۳، باب العین المعجمہ (غ) ۵، باب الفاء (ف) ڈاکٹر سید عبداللہ کا نوٹ: غرائب اللغات میں ف اور ق کی ردیفیں موجود نہیں۔ ص: ۳۰۷، ۳ باب القاف (ق) ڈاکٹر سید عبداللہ کا نوٹ غرائب اللغات میں یہ فصل موجود نہیں ص: ۳۰۹ I باب الکاف العربیہ (ک)

۲۰۰، باب الکاف الکاسیہ (گ) ۱۰۷، باب اللام (ل) ۵۲، باب المیم (م)، ۱۱۱، باب النون (ن) ۵۲، باب الواؤ: (و) ۱، باب الہاء (ہ) ۳۵، میزان ۱۶۰۰۔

غالبؔ بطور لُغت نویس

غالب کے خطوط کے مطالعہ سے جہاں اس کی شخصیت کی کئی پرتیں کھلتی ہیں اور نفسیاتی اہمیت کا مواد حاصل ہوتا ہے وہاں تاریخی کوائف اور سماجی نوعیت کی معلومات بھی ملتی ہیں، اسی طرح اشعار کی اصلاح اور تشریح کے ضمن میں غالب نے الفاظ کی جو بحث کی وہ اس کے تنقیدی شعور کی مظہر ہے۔ ادھر فارسی پہ غالب کو جو عبور حاصل تھا، اس نے اس کے لسانی شعور کو مزید صیقل کیا۔ واضح رہے کہ خسرو اور بیدل کے علاوہ غالب کسی کا قائل نہ تھا۔ اور خود کو صائب اور انوری کا ہم پلہ سمجھتا تھا۔ اس حد تک کہ فارسی کے مقابلے میں اردو کلام کو بھی بے رنگ سمجھتا تھا۔

مولانا الطاف حسین حالی نے "یادگار غالب" میں لکھا کہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامے میں غالب جب گھر میں بیٹھنے پر مجبور ہو گیا تو ان ایام میں "برہان قاطع" کا مطالعہ شروع کیا۔ (وقت گزاری کے لیے لغت کا مطالعہ بذات خود معنی خیز ہے) تو اسے اغلاط سے بھرپور پایا۔

جہاں تک "برہان قاطع" کا تعلق ہے تو آقائے محمد علی کے متذکرہ مقالہ سے اس کے بارے میں یہ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کے مولف کا نام محمد حسین برہان ہے۔ یہ خلف تبریزی کا بیٹا تھا اس لیے بعض اوقات اس کا نام محمد حسین تبریزی لکھ دیا جاتا ہے۔ تخلص کی رعایت سے اس نے لغت کا نام "برہان قاطع" رکھا، ان اشعار سے سنہ تکمیل کا علم ہوتا ہے:

چوں برہان از رہ توفیق یزداں
مرا این مجموعہ را گردید جامع

بہئ اہتمام تالیفش قضا گفت

کتاب نافع، برہانِ قاطع[۱۶] (۱۰۶۲ھ)

مقدمہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عبداللہ قطب شاہ کے عہد میں لکھی گئی۔ اس کے علاوہ حالات کے ضمن میں مزید کچھ نہیں ملتا کہ یہ گولکنڈہ میں رہتا تھا اور بقول آقائے محمد علی " اس زمانے میں گولکنڈہ کے مسلمانوں کی بول چال کی زبان تحریف شدہ فارسی تھی۔ اس میں دکن کی ہندی کے الفاظ شامل ہو گئے تھے۔ گولکنڈہ تلنگانہ کے صوبے میں واقع ہے اور اس کی اصل زبان مسلمانوں کی آمد سے پہلے تلنگی تھی۔ محمد حسین برہان نے گولکنڈہ کے تلنگی فارسی کے الفاظ کو بھی ادبی فارسی کے طور پر ضبط تحریر کر لیا۔"

مرزا غالب نے جب اس کا مطالعہ کیا تو غالباً اسی وجہ سے انہیں اتنی ذہنی کوفت ہوئی کہ اس کا جواب لکھنے کی ٹھان لی۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں قاطع کو ایک طرح سے نصابی حیثیت بھی حاصل تھی اور بوقت ضرورت سب اس سے رجوع کرتے تھے۔ غالب نے اغلاط کی تصحیح کا کام شروع کر دیا اور جب ۹۸ صفحات پر مشتمل قاطع برہان (لکھنؤ، نول کشور ۱۸۶۲) کے نام سے طبع ہوئی تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ لوگ یہ باور ہی نہیں کر سکتے تھے کہ برہان قاطع بھی غلط ہو سکتی ہے۔ حالانکہ خان آرزو بھی اس سے پہلے اس کی اغلاط کی نشاندہی کر چکے تھے مگر یا تو "نوادر الالفاظ" عام لوگوں کی پہنچ سے باہر تھی ورنہ یہ پھر غالب کی نزاعی شخصیت کا اثر تھا۔ کہ "قاطع برہان" کے خلاف مخالفت کا طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ "قاطع القاطع" (مولوی امین الدین پٹیالوی)، "محرک قاطع" (مولوی سعادت علی)، "ساطع برہان" (مرزا سلیم بیگ) "معرکۂ برہان" (مولوی احمد علی) کی صورت میں جوابی کتب لکھی گئیں۔ ادھر غالب کے حمایتی بھی میدان میں اتر آئے۔ جنہوں نے "دافع ہذیان" (مولوی نجف علی خاں)، "لطائف غیبی" (سیف الحق) وغیرہ لکھیں۔ "خود نامہ غالب" اور "تیغ تیز" کی صورت میں غالب نے بھی جوابات دیئے۔ اس بحث کا نتیجہ یہ ہوا کہ غالب نے قاطع برہان پر کام جاری رکھا۔ چنانچہ معترضین کے اعتراضات اور اپنے جوابات کی سند میں مزید شواہد پر مبنی "درفش کاویانی"

(دسمبر ۱۸۶۵ء) طبع کرائی۔ اس کے ۱۵۴ صفحات تھے اور اکمل المطابع دہلی سے چھپی۔ آج "برہان قاطع" اور اس انداز کے دیگر لغات متروک ہیں۔ ملک سے فارسی زبان اور اس کا ذوق ختم ہو چکا ہے جس کے نتیجے میں خود غالب بھی اپنی فارسی گوئی پہ نازاں ہونے کے باوجود اب اردو کلام پہ ہی زندہ ہے۔ تاہم لغات کی یہ متنازعہ بحث جہاں غالب شناسوں کے لیے باعث دلچسپی رہی وہاں اس کی روشنی میں غالب کے لسانی شعور کا بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے کہ غالب اگر شاعر نہ ہوتا اور اس نے صرف لسانیات، زبان و بیان اور صرف و نحو کے مباحث پر قلم اٹھایا ہوتا تو یقیناً وہ ایک ماہر کا درجہ پاتا ہے۔ اگر اس نے باقاعدگی سے لغت مدون کی ہوتی تو یقیناً یہ اہم کارنامہ ثابت ہوتی اور غالب، خان آرزو کے پایہ کا لغت نویس تسلیم کیا جاتا۔

اس ضمن میں مزید معلومات کے لیے یہ مقالات ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں:

۱۔ "فارسی لغت نویسی کی تاریخ" از آقائے محمد علی (داعی الاسلام) مطبوعہ اردو شمارہ ۳، ۱۹۷۵ء

۲۔ "قاطع برہان کی حمایت" میں از ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری مطبوعہ نقوش جنوری ۱۹۷۶ء

۳۔ "غالب کے ادبی معرکے" از مالک رام مطبوعہ نقوش ادبی معرکہ نمبر ۱۹۸۱ء

۴۔ "نقد قاطع برہان مع ضمائم" از پروفیسر نذیر احمد دہلوی

"برہان قاطع" کا پہلا ایڈیشن تھامس روبک نے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا تھا۔ "برہان قاطع" کے قلمی نسخوں میں مختلف مقامات پر جو حواشی لکھے ہوئے تھے ان کو روبک نے بطور ملحقات آخر کتاب میں درج کر دیا۔[19] اس کے چار برس بعد اور پھر ۱۸۳۴ء میں بھی چھپی۔ تہران سے ڈاکٹر محمد حسین نے اسے مرتب کر کے چار جلدوں میں شائع کیا تھا۔ "برہان قاطع" ۱۰۶۲ء میں مکمل کی گئی تھی۔

غالب نے خسرو کی "خالق باری" کے انداز پہ بچوں کے لیے تقریباً ۴۰۰ الفاظ پہ مشتمل منظوم لغت "قادر نامہ" (مطبع سلطانی دہلی ۱۸۵۶ء) شائع کیا۔ اس میں عربی فارسی کے مشکل الفاظ کے اردو معنی درج ہیں۔ نمونہ ملاحظہ فرمائیے:

قادر اللہ اور یزداں ہے خدا ہے نبی مرسل پیغمبر رہ نما

آمدِ اہلِ فرنگ کی:

ہندوستان میں لغت نویسی کے دو ادوار بنائے جاسکتے ہیں۔ ایک دور وہ جس میں فارسی فرہنگوں کے قواعد کے مطابق لغت مدون ہوتے تھے اور ان میں الفاظ و معنی اور اخذ و اشتقاق کی بحثیں فصاحت اور علم بیان کی روشنی میں طے پاتی تھیں۔ یہ اس عہد کے اہلِ علم شعراء اور طلباء کی ضروریات کو کافی تھا۔

لغت نویسی کا دوسرا دور یورپین کی ہندوستان میں دلچسپی سے شروع کیا جا سکتا ہے۔ پرتگالی، فرانسیسی اور انگریز یہاں آئے تو خود "ہندوستانی" سیکھنے اور دوسروں کو سکھانے کے لیے ڈکشنریاں مرتب کیں۔ ان دونوں میں کیا فرق ہو سکتا تھا، وہی جو لغت یا فرہنگ یا ڈکشنری کے الفاظ میں ہو سکتا ہے۔ یعنی مشرقی اہلِ علم کا لفظ اور زبان کے بارے میں جو رویہ تھا اور یورپین لفظ اور زبان کی پرکھ کس انداز سے کرتے تھے۔ اہلِ مغرب کی ہندوستان سے تجارت خاصی قدیم تھی اور وہ سورت اور گوری کی بندرگاہوں پر اپنا مال لاتے اور یہاں سے مصالحہ جات، خوشبویات، پارچات وغیرہ لے جاتے۔ مولانا محمد حسین آزاد نے "دربارِ اکبری" میں اس ضمن میں خاصی تفصیل سے لکھا ہے۔ بلکہ ان کے بیان سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ خود اکبر کی خواہش پر ۹۸۴ھ میں اہلِ فرنگ کو دہلی لایا گیا۔ مولانا آزاد اپنے پر تخیل اسلوب میں ان کی آمد کی منظر کشی یوں کرتے ہیں:

> "جس وقت شہر میں داخل ہوئے تو عجائبات کی برات بن گئی۔ انبوہِ کثیر جوان و پیر کا ساتھ تھا۔ بیچ میں سب سے اہلِ فرنگ اپنا ملکی لباس پہنے اور اپنے قانونِ موسیقی کے بموجب فرنگی باجے بجاتے شہر میں داخل اور دربار میں حاضر ہوئے۔ انہیں کے نوادر و غرائب میں اول ارغنون (آرگن) ہندوستان میں آیا۔"[20]

مولانا آزاد کے بموجب "ہندوستان میں پادری بھی آئے اور انجیل لائے۔ ثالث ثلثہ پر دلائل

پیش کر کے نصرانیت کا اثبات کیا اور ملتِ عیسوی کو رواج دیا۔"[21] اکبر ان سے مذہبی گفتگو کرتا
"بلکہ شہزادہ مراد کو ان کا شاگرد بھی کیا۔"[22]
اگرچہ مولانا آزاد کے بیان سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ اہلِ فرنگ کس ملک کے تھے بلکہ
خود انہوں نے بھی اس پہ تعجب کیا ہے۔ "کہ جو زبان شاہزادے سیکھتے تھے وہ رومی تھی، یا عبرانی،
شاید وہ اپنی یونانی زبان سکھاتے ہوں گے"[23]
غالباً آزاد کی رومی سے مراد لاطینی زبان ہے۔ اگرچہ اب اس ضمن میں وثوق سے تو کچھ نہیں کہا
جا سکتا تاہم قوی امکان ہے کہ وہ پرتگالی ہوں گے۔ اس قیاس کو اس امر سے تقویت پہنچتی ہے کہ مولانا
آزاد نے ایک مقام پر لفظ پادھری (ص ۶۷) استعمال کیا ہے جو کہ پرتگالی PADRE ہے۔ ان
دنوں سپین اور پرتگال کو انگلستان اور فرانس پہ بحری فوقیت حاصل تھی۔ تاریخ سے بھی پرتگالیوں کی
آمد کے شواہد ملتے ہیں۔

اس عہد کے یورپ میں ہندوستان کی دولت، حکمرانوں کے حسنِ اخلاق اور مقامی آبادی کی
تابعداری کی داستانیں پھیل رہی تھیں۔ لہٰذا سب ہی اس "سونے کی چڑیا" کے چکر میں تھے۔ گھرے
تو کولمبس ہندوستان کا راستہ دریافت کرنے نکلا تھا مگر امریکہ جا پہنچا۔ (۱۴۹۲ء) وہاں کے مقامی قبائل کو
جو ریڈ انڈین کہا گیا تو اسی مغالطے کی بنا پر۔ پرتگال کا باشندہ واسکوڈے گاما اگست ۱۴۹۸ء میں
بنگال میں کالی کٹ (موجودہ کلکتہ)[24] میں لنگر انداز ہوا۔ آنے والی تمام مغربی اقوام نے واسکوڈے
گاما کا بحری راستہ اپنایا اور یوں کالی کٹ نے جلد ہی یورپ سے تجارت کے لیے ایک اہم بندرگاہ
اور تجارتی منڈی کی حیثیت حاصل کر لی۔ اگرچہ بعد میں فرانسیسی اور انگریز[25] بھی اس دوڑ میں شریک
ہو گئے لیکن ان کے اثر و رسوخ کے پھیلنے سے پہلے دو اڑھائی صدیوں تک پرتگالیوں کا ہی تجارتی
غلبہ رہا۔ انگریزوں کے مقابلے میں پرتگالیوں کے پیچھے رہ جانے کی دو وجوہ نظر آتی ہیں۔ ایک
تو یہ کہ خود یورپ میں انگلستان اور فرانس کے مقابلے پر پرتگال کمزور ملک بن گیا اور دوسرے
اس لیے بھی کہ انہوں نے یہاں بالعموم تجارتی امور سے دلچسپی رکھی۔ انگریزوں کی مانند نہ سازشیں کیں

نہ حکمرانوں کو لڑایا اور نہ مقامی سیاست میں دخل اندازی کی۔ جنوبی ہندوستان کے باشندوں کے پرتگالیوں سے طویل روابط کی لسانی اہمیت ہے، کیونکہ اردو میں پرتگالی کے متعدد الفاظ شامل ہوکر اب عام بول چال کی زبان کا حصہ بن چکے ہیں۔ چند الفاظ بطور مثال پیش ہیں:

اچار۔ آیا (کھلائی) الماری۔ باسن۔ بالٹی۔ بمبا، پادری۔ ڈی۔ پیرچ۔ پیسہ۔ پستول، پولیس۔ تولیہ۔ ساگو۔ صابون۔ فالتو۔ فرما۔ کمرہ۔ کپتان۔ کارتوس۔ کاج (بٹن کا) قمیص۔ میز۔ مستول۔ نیلام۔ یہ فہرست الفاظ "منشورات" (ص ۶۰) میں درج ہے۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد نے اس فہرست میں مزید الفاظ شامل کر دیتے ہیں۔ اناس۔ بوتل۔ بسکٹ۔ پادری۔ پپیتا۔ پرات۔ تمباکو۔ تنبور (طنبور، طنبورہ) جاکٹ اور چار، چھاپ۔ چابی۔ سوفا۔ فیتہ۔ کاجو۔ کوچ۔ کاجو، گارد، مستری۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد نے اس فہرست میں چائے کو بھی شامل کیا ہے۔ "CHA" چینی زبان کا لفظ ہے جو چائے کے ساتھ یورپ پہنچا تھا۔ پرتگالی میں یہ اپنی اصل صورت یعنی چا رہی استعمال ہوتا ہے انگلستان میں نہ جانے کیسے یہ "ٹی" بن گیا۔ یہ بھی عجب بات ہے اردو میں تو یہ چائے ہی ہے مگر پنجابی میں اصل چینی تلفظ کے مطابق چا ہی بولتے ہیں۔ اسی طرح اچار کو بھی پرتگالی بتایا گیا جب کہ نوادر الالفاظ میں خان آرزو نے آچار کی تعریف و توضیح کرتے ہوئے لکھا ہے:

"تحقیق آنست کہ در فارسی لفظ آچار ہم آمدہ" (ص: ۱۲)

رشید حسن خان کی "زبان اور قواعد" (ص ۱۹۵۔ ۱۹۶) میں اچار کے ضمن میں یہ لکھا ہے:

"آصفیہ میں اس کو آچار لکھا گیا ہے اور اچار لفظ کو عوام سے متعلق کہا گیا ہے۔ آچار بنانا یا آچار ڈالنا۔ آچار کرنا، آچاری سب کو الف ممدودہ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اردو میں اچار لکھا اور بولا جاتا ہے اور اردو کے لحاظ سے یہی صورت صحیح اور فصیح ہے۔ آچار کو فارسی سے مخصوص قرار دینا چاہیئے۔"

سازشیں، جوڑ توڑ اور ان کے نتیجے میں سیاسی اہمیت اور پھر بالآخر بالادستی حاصل کرنے سے پہلے ہندوستان آنے والے فرنگیوں کی عمومی تقسیم یوں کی جاسکتی ہے: تاجر، سیاسی عزائم کے حامل

مہم جو، طالع آزما اور وہ دانش ور جو یہاں کی تاریخ، مذاہب، تہذیب و تمدن، اساطیر اور زبانوں کو سمجھنا چاہتے تھے۔ موخر الذکر دانشور بسلسلہ ملازمت آئے یا اور کسی وجہ سے۔ لیکن اتنا ہے کہ انہوں نے ہندوستان کے بارے میں جو کچھ لکھا اس کی اب بھی تاریخی اہمیت ہے۔ یہی وہ لوگ تھے، جن میں سے بعض نے مقامی زبانیں سیکھیں، مقامی لباس پہنا۔ اردو میں غزلیں کہیں۔ اور گارڈنر خاندان کی مانند مقامی عورتوں سے شادیاں کر کے اینگلو انڈین طبقہ پیدا کیا اور بالآخر قرۃ العین حیدر کے "گردش رنگ چمن" کے کردار بنے۔

اُردو: ملکہ وکٹوریہ سے ہٹلر تک

انگریزوں کی اردو سے دلچسپی کا اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ خود ملکہ وکٹوریہ میں اردو سیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس مقصد کے لیے ہندوستان سے ایک اردو معلم کو بطور خاص لندن بلوایا گیا۔ جس نے ملکہ کو اردو سکھائی۔ محمد سردار علی کے بقول "خود ملکہ معظمہ وکٹوریہ قیصر ہند کو بھی اردو کا شوق ہوا۔ آگرہ کے مولوی برکت اللہ صاحب ملکہ کو اردو پڑھانے کے لیے لندن بھیجے گئے۔ ملکہ نے تھوڑے عرصہ میں اس قدر اردو سیکھ لی کہ آپ اپنا روزنامچہ اردو میں لکھا کرتی تھیں۔"[۴۸]

عظیم بیگ چغتائی کے ایک مقالہ "اردو کی شاہی سرپرستی" (مطبوعہ: ادبی دنیا لاہور فروری ۱۹۴۱ء) سے بھی اس ضمن میں معلومات حاصل ہوتی ہیں البتہ انہوں نے ملکہ کے معلم کا (جسے اردو سیکرٹری کہا جاتا تھا) نام مولوی برکت اللہ کی بجائے حافظ منشی عبدالکریم لکھا ہے۔ اس مقالے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ان حافظ صاحب سے ملکہ وکٹوریہ نے قرآن مجید بھی پڑھا تھا اور وہ اس کو الہامی کتاب مانتی تھی۔"

عظیم بیگ چغتائی کے بموجب ۱۸۹۰ء سے پہلے ہی اردو سکھانے پر مامور تھے اور انتقال تک وہ شاہی محل میں مقیم رہے تھے۔ اس مضمون سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ملکہ وکٹوریہ اردو میں دستخط بھی کر لیتی تھیں جو "وکٹوریہ قیصرہ ہند" ہوتے تھے۔ ملکہ نے حافظ صاحب کو کچھ کتابیں بھی بطور تحفہ دیں

ان میں سے ایک پر یہ لکھا تھا: "بخدمت حافظ منشی عبدالکریم" عظیم بیگ چغتائی کے بموجب: کنگ جارج بھی اردو فہمی کے علاوہ اردو لکھنے اور پڑھنے پر قادر تھے۔

ماہنامہ "افکار" کے برطانیہ میں اردو ایڈیشن کے سرورق پر ملکہ وکٹوریہ کی اپنے اردو معلم کے ساتھ تصویر چھپی ہے جو لباس سے پورا معلوم ہوتا ہے۔ اب یہ نہیں کہا جاسکتا کہ یہ آگرہ کے مولوی برکت علی ہیں یا حافظ عبدالکریم۔ ویسے ٹوپی انہوں نے پوروں والی پہن رکھی ہے۔ اسی افکار میں ملکہ کی اردو تحریر کا نمونہ بھی دیا گیا ہے۔ جو ان کی ڈائری میں سے لی گئی ہے۔ اور یہ فقرہ درج ہے:

"ہم کو بہت خوشی ہوئی آج ساٹھ سال بخیریت ختم ہوئے۔ سب بچے اور دیگر بہت اخلاق سے پیش آئے۔"

اردو میں تاریخ ۲۰ جون ۱۸۸۰ء درج ہے۔ خوش خطی میں ملکہ وکٹوریہ بھی اپنی ہم پلہ دکھائی دیں۔

۱۸۵۷ء میں سقوط دہلی کے بعد ملکہ وکٹوریہ نے جب "قیصرہ ہند" کا لقب اختیار کیا اور ایک سال بعد سارے ملک میں امن عامہ کا جو اعلان کیا وہ اردو ہی میں تھا۔ اب یہ کہنا مشکل ہے کہ اسے کس نے لکھا تھا جبکہ عبدالرفیق کے بموجب: "وائسرائے ہند سر جان لارنس نے ۱۲ نومبر ۱۸۶۷ء کو لکھنؤ کے جلسے میں جو تقریر کی تھی وہ بھی اردو اور فارسی رسم الخط میں تھی۔ ان کی تقریر کا ایک اقتباس درج ہے:

"اے مہاراجگان و راجگان و رئیسان و شریفان ملک اودھ! ہم حسب دعوت تمہارے لکھنؤ میں آکر بدین مراد تمہارے ساتھ اس دربار میں ملاقی ہوئے تامکالمۂ محبت و تواضع باہم کریں اور اس ذریعہ سے جیسا تمام ممالک میں سلسلۂ رابطہ و آمیزش کا درمیان حکام اور رعایا کے جاری ہونا چاہیئے، ہم لوگ بھی مستحکم کریں۔"[۲۹]

یقیناً یہ اردو وائسرائے کے قلم سے نہ نکلی ہوگی بلکہ کسی نیٹو منشی نے لکھی ہوگی اور یہ بھی ہو

سکتا ہے کہ یہ کسی انگریزی ڈرافٹ کا ترجمہ ہو۔ اس استدلال کی تقویت اس سے بھی ہوتی ہے کہ تقریر کے فوراً بعد اس کا انگریزی ترجمہ بھی پڑھ کر سنایا گیا تھا۔

ملکہ وکٹوریہ سے لے کر ہٹلر تک خاصہ زمانی بُعد ملتا ہے۔ لیکن ہٹلر نے بھی فوجی اصطلاحات پر مبنی ایک اردو لغت تیار کرائی تھی۔ "اردو معلیٰ" (قدیم اردو نمبر، شمارہ ۹۰) میں مطبوعہ "ہٹلر کا اردو لغت" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ۲۲۸ صفحات کا یہ لغت آزاد ہند فوج کے ایماء پر سرکاری پریس سے ۱۹۴۳ء میں طبع ہوا۔ اس کے ابواب کی فہرست یوں ہے:

۱۔ جرمن حکم ہندوستان میں۔
۲۔ دستوں کے نام۔
۳۔ فوجی راہنمائی
۴۔ میدانی علم
۵۔ ہتھیاروں کا فن
۶۔ پل پار کرنے کے طریقے
۷۔ فوجی سامان
۸۔ فوجی سامان کی مرمت
۹۔ پانی کا پہنچاؤ
۱۰۔ ہوائی بیڑا
۱۱۔ سکھلائی

یہ عنوانات اردو کے علاوہ جرمن میں بھی درج ہیں۔ اس لغت کا دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے ۱۹۴۳ء تک جرمنی میں اردو کو ہندوستانی کہا جا رہا تھا۔ لغت کا جرمن میں سرورق یوں ہے:

"MILITAR WORTERBUCH
FUR DEN
FURHRER UND UNTER FURHREK
DEUTSCH - HINDUSTANI 1943

نوٹ : یورپین کی اردو دلچسپی کے سلسلے میں مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہو :
"یورپ میں اردو کے مراکز انیسویں صدی میں" از ڈاکٹر سید سلطان محمود حسین، لاہور ۱۹۸۴ء
یورپین شعرائے اردو کے بارے میں حصول معلومات کے لیے ملاحظہ ہوں :
"تذکرہ یورپین شعرائے اردو" از محمد سردار علی حیدر آباد دکن ۱۹۴۱ء
"اردو کے یورپین شعراء" از شفقت رضوی کراچی ۱۹۸۱ء
"یورپین اینڈ انڈو یورپین پوئٹس آف اردو اینڈ پرشین" (انگریزی)
از رام بابو سکسینہ، لکھنؤ ۱۹۴۱ء

ان کتب کے علاوہ یہ مقالات بھی دیکھے جا سکتے ہیں :
ڈاکٹر سید عبداللہ کا مقالہ، اردو کا جرمن شاعر فرانسو اور اس کی تصنیفات،"
"(سخن ور۔ نئے اور پرانے" حصہ اوّل لاہور ۱۹۷۹ء)
مولانا عبدالماجد دریا آبادی کا مقالہ" غالب کا ایک فرنگی شاگرد۔ آزاد فرانسیسی"
"(مقالات ماجد") اور ان ہی کا مقالہ "اردو کے چند انگریز شاعر" (افکار :: برطانیہ میں
اردو ایڈیشن (۱۹۸۱ء)

ڈکشنری بمقابلہ لغت :

تو یہ ہے وہ تناظر جس میں یورپین کی اردو جسے وہ بالعموم "انڈوستانی" ہندوستانی"،
"مورز" کہتے تھے، عملی اور پھر علمی دلچسپی کا آغاز ہوا۔ انہوں نے پہلے خود آموزی کے لیے اور پھر

ہم وطنوں اور طلبہ کی زبان شناسی کے لیے ڈکشنریاں مرتب کیں۔ اردو میں لغت اور فرہنگ کا جو انداز مروج تھا وہ عربی فارسی روایات کے تابع تھا۔ اسی لیے ایک مخصوص انداز اور اسلوب میں لغت لکھے جاتے تھے۔ لغت کو محض الفاظ کے معنی بتانے والی کتاب سمجھا جاتا تھا اور بس۔ یہ جو تصور ہے کہ لغت زبان کے ارتقائی مراحل کا آئینہ بن جائے اور اشتقاق سے متداول لفظ کی "جڑ" تک پہنچا جائے، وہ اس سے ناآشنا تھے۔ اسی لیے خان آرزو کی "نوادرالالفاظ" کی استثنائی مثال سے قطع نظر باقی تمام لغات یکساں نوعیت کے تھے۔ اس کے برعکس انگریز لغت نویس کے پیچھے صدیوں کی علمی اور تحقیقی کاوشوں کے علاوہ یونانی "LEXICON" اور لاطینی ڈکشنریوں کی روایات بھی تھیں۔ مزید برآں اس زمانے میں یہاں لسانیات نام کا کوئی علم نہ تھا۔ صرف شعر کے حوالے سے علم بیان، بدیع اور عروض کے مباحث سے دلچسپی کا اظہار کیا جاتا تھا۔ جب کہ انگریز لغت نویس اگر لسانیات کے ماہر نہ تھے تو کم از کم اس کے بنیادی مباحث سے آشنا ضرور ہوتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل زبان جو کام نہ کر سکے وہ نہ صرف یورپین نے کر دکھایا بلکہ اتنا معیاری تھا کہ مولوی عبدالحق کو یہ اعتراف کرنا پڑا:

> "حیرت کی بات یہ ہے کہ اہلِ زبان کی کتابیں اکثر ناقص اور ناقابلِ التفات ہیں۔"[۳۰]

مولوی عبدالحق نے ۱۹۰۶ء میں میرزا لطف علی کے تذکرہ "گلشن ہند" پہ جو مقدمہ لکھا تھا اور جو بقول صہبا لکھنوی "نادر و نایاب" تھا۔ اسے "اردو نثر کے ارتقاء میں انگریزوں کا حصہ" کے عنوان سے صہبا لکھنوی نے "افکار" کے برطانیہ میں اردو ایڈیشن میں طبع کر دیا۔ اس میں بھی مولوی عبدالحق نے متعدد انگریز لغت نویسوں کا تذکرہ کرتے ہوئے انکا کام سراہا اور اردو کا "گاڈ فادر" قرار دیا۔

ہمارے لسانی محققین اور ادبی مورخین کیونکہ اردو سے آگاہ ہوتے ہیں، اس لیے انگریزوں کے بارے میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بالعموم اردو ہی کے حوالے سے ہوتا ہے۔ حالانکہ ایک معقول

تعداد میں ایسے یورپین اور انگریز ملتے ہیں جنہوں نے اردو کے ساتھ ساتھ پاکستان اور ہندوستان کی علاقائی زبانوں، مقامی بولیوں، ادب اور تاریخ کے ضمن میں بھی قابل قدر کام کیا ہوا ہے۔ چنانچہ متعدد ایسے متشرقین ملتے ہیں جو اردو کے ساتھ ساتھ پنجابی، پشتو، سندھی، بلوچی، براہوی، بنگلہ، کشمیری، تامل، تیلگو، مرہٹی، سنسکرت اور ہندی میں بھی خصوصی مہارت رکھتے تھے۔ اگرچہ اس نوع کے مطالعات ہمارے موضوع سے خارج ہیں تاہم علاقائی زبانوں سے دلچسپی رکھنے والے حضرات "افکار" کے "برطانیہ میں اردو ایڈیشن" (۱۹۸۱ء) میں مطبوعہ ان مقالات سے رجوع کر سکتے ہیں:

"بنگال کے انگریز مصنفین اردو" از شانتی رنجن بھٹاچاریہ[۳۱]

"پنجابی ادب اور برطانوی اہلِ قلم" از پروفیسر شریف کنجاہی

"پشتو ادب اور برطانوی اہل قلم" از فارغ بخاری

"سندھی ادب اور برطانوی اہل قلم" از ڈاکٹر میمن عبدالمجید سندھی

"بلوچی و براہوی ادب اور برطانوی اہلِ قلم" از کامل القادری

"کشمیری ادب اور برطانوی اہل قلم" از ڈاکٹر سید محمد یوسف بخاری

اُردو کی قدیم ترین لُغت:

یورپین کی اردو زبان سے دلچسپی کے تناظر میں جب ہم یہ پڑھتے ہیں کہ اردو کی قدیم ترین لغت کسی مقامی کے برعکس ایک یورپی نے لکھی تو یہ باعث تعجب نہیں معلوم ہوتا آغا افتخار حسین کی کتابوں "یورپ میں اردو" اور "یورپ میں تحقیقی مطالعے" میں جہاں اردو اور ہندوستان کے حوالے سے کارآمد معلومات ملتی ہیں وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ "اردو زبان کی سب سے پہلی لغت ایک فرانسیسی فرانسکو ماریا دتورسے نے سترھویں صدی میں لکھی۔[۳۲] یہ غیر مطبوعہ ہے۔ سر جارج گریرسن اور مولوی عبدالحق نے بھی اس کا ذکر کیا ہے۔ اس کا مخطوطہ نمبر ۸۳۹ ببلیوتک ناسیونال پیرس میں موجود

ہے۔ یہ شخص پانڈی چیری کے مشنری کتب خانے میں ملازم تھا۔ اس نے سورت، نیپال اور تبت کی سیاحت بھی کی تھی۔ ۱۷۰۹ء میں پٹنہ میں انتقال ہوا۔ یہ لغت جس کا نام "LEXICON LINGAUE INDOSTANICAE" ہے چار زبانوں یعنی لاطینی، ہندی، فرانسیسی اور مور کے الفاظ پر مشتمل ہے۔ اس کے پانچ سو کے قریب صفحات ہیں۔ ہر صفحہ دو کالمی ہے۔ ("اردو معلّٰی قدیم اردو نمبر")

اگرچہ اس کے مدون کیے جانے کی درست تاریخ کا علم نہیں تاہم آغا افتخار حسین کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ "یہ لغت سترھویں صدی میں لکھی گئی تھی۔"[۳۳] ویسے اس لغت کے بارے میں لکھنے والے بعض حضرات نے یہ بھی لکھا ہے کہ اس کی تالیف ۱۷۰۴ء میں سورت میں ہوئی لیکن جیسا کہ آغا افتخار حسین کے بیان سے واضح ہو جاتا ہے یہ ۱۷۰۴ء میں لکھی نہیں گئی بلکہ اس سنہ میں اسے "روم کے شعبہ تبلیغ و اشاعت کے کتب خانہ میں داخل کیا گیا۔"[۳۴]

"گریرسن نے "لینگوسٹک سروے آف انڈیا" کی جلد نہم میں ہندوستانی لغات و قواعد کا جائزہ لیتے ہوئے جو تفصیلات دی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو کی سب سے پہلی لغت مسٹر کورج کے جو کا ایک قلمی نسخہ تھا جس میں فارسی، ہندوستانی، انگریزی اور پرتگالی الفاظ یکساں درج تھے۔ اس کی تالیف ۱۷۱۳ء میں سورت کے مقام پر ہوئی۔ فارسی الفاظ اپنے اصل رسم الخط اور رومن حروف دونوں میں درج تھے۔ ہندوستانی الفاظ کے لیے رومن اور گجراتی رسم الخط استعمال کیا گیا تھا۔"[۳۵]

سترھویں صدی میں لغات کے ضمن میں یورپین کا کام زیادہ تر غیر مطبوعہ ہی رہا اور اب صرف لسانی محققین کی کتابوں میں ان کے حوالے ملتے ہیں۔ وہ بھی بسا اوقات مجمل اور ناکافی۔ اس لیے ریکارڈ کی حد تک تو اس امر کا تعین ہو جاتا ہے کہ اردو زبان کا اولین یا قدیم ترین لغت کون سا ہے لیکن اگر اس لغت کا مخطوطہ پیرس، برلن یا روم کے کسی کتب خانے کی الماری میں مقفل ہے تو عملاً اس کی افادیت بیکار ہے۔

لغات اٹھارویں صدی میں :

یہ اٹھارویں صدی تھی جس میں مطبوعہ لغات ملتے ہیں۔اب تک انگریز بھی اس میدان میں آچکے تھے چنانچہ پرتگالیوں اور فرانسیسیوں کے ساتھ ساتھ انگریزوں کے مدون کردہ لغات بھی طبع ہونے لگے۔ جیسے جیسے ہندوستانی سیاست میں انگریزوں کی مداخلت اور برتری بڑھتی گئی ویسے ویسے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے عہدہ داروں کی علمی سرگرمیوں میں بھی تیزی آتی گئی۔ تاہم اٹھارویں صدی کے آغاز میں قابل ذکر کام انگریزوں کی بجائے دیگر اقوام کے افراد نے کیا اس ضمن میں ڈنمارک کے جان جوشوا کیٹلر (JOHN JOSHUA KAETELAER) (۱۷۱۸ء - ۱۶۵۹ء) کا نام لیا جاسکتا ہے "جس نے ہندوستانی زبان کے صرف و نحو کی لغت لکھی۔ اس کا مسودہ ولندیزی زبان میں ہے اور ابھی تک ہیگ کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کا ترجمہ ڈیوڈ مل DAVID MILL نے کیا اور اپنی کتاب "MISCELLAEA BRIENTALIA) میں شامل کر کے ۱۷۴۳ء میں شائع کیا۔ کیٹلر کی کتاب اس ترجمہ کے ذریعے منظر عام پر آئی۔" [۳۶] یہ ترجمہ لیڈن (LEIDEN) سے شائع ہوا تھا۔ مولوی عبدالحق کے خیال کے مطابق کتاب کا زمانہ تالیف ۱۷۱۵ء ہے" (قواعد اردو ص: ۱۹) کتاب لاطینی زبان میں ہے لیکن ہندوستانی (اردو) الفاظ اور عبارتیں رومن حروف میں لکھی گئی ہیں۔ ان کے ساتھ ساتھ حروف ہندوستانی جدول میں ہندوستانی الفاظ اور املا میں درج ہیں۔ ان الفاظ کا املا ولندیزی زبان کے مطابق ہے۔" [۳۷]

سلیم الدین قریشی کے پمفلٹ "اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب" میں اس کا مکمل نام درج ہے :

"ہندوستانی اور فارسی زبان سیکھنے کے لیے ہدایات اور سبق فعلوں کے مختلف صیغوں کی گردانیں۔ ہندوستان کے ناپ تول کے پیمانوں سے متعلق الفاظ اور ان کے ولندیزی اور مسلمانوں کے مختلف ناموں کے معنی ہیں" [۳۸]

سلیم الدین قریشی اس ضمن میں مزید لکھتے ہیں کہ "اسے ڈیوڈ مل (DAVID MILL) نے

ایک باب (صفحات ۶۰۱ ، ۴۵۵) کی حیثیت سے شامل کر کے جنوری ۱۷۴۳ء

میں شامل کی تھی۔

اور اس کے صفحہ ۴۵۷ پر مصنف نے ہندوستانی

اور دکنی کے مندرجہ ذیل الفاظ اردو ٹائپ میں دیئے ہیں۔

ہندوستانی ؛ ایک ، دو ، تین ، چار ، پانچ ، چھ

دکنی ؛ فیل وال ، دوسروال ، تیسراوال ، چوتھا وال

مندرجہ بالا الفاظ کے علاوہ اردو کے دوسرے الفاظ رومن رسم الخط میں ولندیزی زبان کے تلفظ کے مطابق دیئے گئے ہیں۔ البتہ فارسی اور عربی الفاظ کے لیے نستعلیق ٹائپ استعمال کیا گیا ہے۔ کیٹلر نے یہ کتاب ولندیزی (ڈچ) زبان میں قلمبند کی تھی۔ ڈیوڈ مل نے غالباً خود اس کا لاطینی ترجمہ کر کے اسے اپنی کتاب میں شامل کیا ہے۔"[۳۹]

کیٹلر کی ابتدائی زندگی اور بعد کی زندگی میں خاصہ تفاوت ملتا ہے محولہ بالا کتاب سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ایک بے حد ذہین شخص اور لسانیات کا ماہر ہوگا۔ جبکہ معاملہ اس کے برعکس نظر آتا ہے۔ ۲۵ دسمبر ۱۶۵۹ء کو ایلبنگ (ELBING) جرمنی میں ایک جلد ساز ہوشوا کیٹلر کے گھر جنم لیا۔ کچھ دیر وہاں کام کیا اور پھر HOHANNE SCHWECHAUSER نامی جلد ساز کی دوکان پر ملازم ہو گیا۔ جہاں اس نے مالک کو زہر دے کر دوکان سے چوری کی، اور فرار ہو کر DANTZIG میں ایک اور جلد ساز کے ہاں ملازم ہو گیا۔ مگر یہاں بھی چوری سے باز نہ آیا اور ۱۶۸۰ء میں پھر بھاگا اور سٹاک ہالم آگیا۔ دو سال یہاں رہا اور پھر ایمسٹرڈیم آگیا۔ جہاں جرمنی نام کو ولندیزی املا میں بدل کر ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی میں ملازمت اختیار کر کے مئی ۱۶۸۲ء میں ہندوستان روانہ ہوا۔ سورت کے دفتر میں بطور کلرک کام شروع کیا اور یہیں سے اس کی محنت اور ترقی

کا آغاز ہوتا ہے۔ ۱۶۹۶ء میں اکاؤنٹنٹ بنا پھر احمد آباد کی فیکٹری میں ڈپٹی بنایا گیا اور سال بعد آگرہ کی فیکٹری کا نگران مقرر کیا گیا۔ حتیٰ کہ ۱۷۱۱ء میں وہ ڈچ حکومت کا سفیر بنا دیا گیا اور اسی حیثیت سے وہ ۸ فروری ۱۷۱۱ء کو وہ سورت سے روانہ ہوا اور اگلے دو برس تک شاہ عالم بہادر شاہ اور جہاں دار شاہ کے درباروں سے وابستہ رہا۔ ۱۷۱۵ء میں بطور سفیر ایران پہنچا جہاں ۱۲ مئی ۱۷۱۸ء کو بندر عباس میں انتقال کیا اور وہیں دفن ہوا۔"[41]

نمونہ منشورات میں سے کیٹلر کی نثر کا نمونہ پیش ہے:

"ہمارے باپ کہ وہ آسمان میں ہے۔ پاک ہوئے تیرا نام آدے ہم کوں ملک تیرا ہو دے راج تیرا جوں اسمان تو جمین (زمین) میں روٹی ہمارے نہ تھی۔ ہم کو آس دے اور معاف کر تقصیر اپنی ہم کوں جوں معاف کرتے اپرے قرض داروں کوں نہ ڈال ہم کوں اس وسوسے میں بلکہ ہم کوں گھس کر اس برائی سے نیری ہی پسیجئ، سواری۔ عالم گیری حمایت میں آبین" (ص: ۵۸)

آغا افتخار حسین نے ڈنمارک کے ایک اور شخص آدارس ایبل (IWARUS ABEL) کی فرہنگ کا بھی تذکرہ کیا ہے۔ جو ۱۷۸۲ء میں کوپن ہیگن سے شائع ہوئی۔ اس فرہنگ میں ۵۳ الفاظ کے معنی کا گیارہ زبانوں میں مقابلہ کیا گیا ہے۔ ان زبانوں میں ہندوستانی بھی شامل ہے۔[42]

سترھویں اور اٹھارویں صدی میں ڈکشنریوں کے سلسلے میں جو کام ہوا وہ زیادہ تر فرانسیسیوں اور پرتگالیوں کا تھا۔ پروفیسر ثریا حسین نے گارسیں دتاسی کے بارے میں اپنے تحقیقی مقالے میں ایک فرانسیسی لغت کا ذکر کیا ہے وہ لکھتی ہیں: "ہندوستانی فرانسیسی اور فرانسیسی ہندوستانی لغت جس میں ہندوستان کی دیو مالا تاریخ اور جغرافیہ کے الفاظ بھی ہیں اس کے مؤلف فرانسوا دلنونکل تھے اور یہ گارسیں دتاسی کی زیر نگرانی پیرس میں ۱۸۷۶ء میں چھپی۔ اس کے صفحات کی تعداد ۳۲ + ۱۲ ہے۔ اس لغت کا دیباچہ گارسیں دتاسی نے لکھا ہے جس کے بقول:

"ہندوستان کے متعلق انگلستان اور فرانس میں رقابت رہی۔ فرانس کے

نمائندے لاہوردونے اور دوپلے تھے۔ اس وقت سے ہی فرانس نے ہندوستانی زبان کی اہمیت محسوس کرلی تھی اور یہ اس بنا پر قدرتی بات تھی کہ فرانسیسیوں کو سب سے بڑی کامیابیاں دکن میں ہوئیں جو ولی کا وطن تھا اور ولی ہندوستانی شاعری کا باوا آدم سمجھا جاتا ہے۔ انگریزی کتابوں کے چھپنے سے بہت پہلے انکٹسل دیوپروں نے اپنے سورت کے قیام کے دوران ہندوستانی زبان کی ایک لغت تیار کی جو ہے تو مختصر لیکن جس کا مخطوطہ اب تک ببلیوتک ناسیونال میں محفوظ ہے۔[42]

انگریزوں کی ڈکشنریاں:

اور اب ذکر شروع ہوتا ہے ان انگریزوں کا جو اگرچہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے ملازم تھے یا فوج میں تھے مگر انہوں نے اپنے شوق یا پھر سرکاری ضروریات کے لیے ڈکشنریاں مدون کیں۔ اب تک انگریز یورپ کی بہت بڑی قوت بن چکے تھے۔ یہی نہیں بلکہ دو صدیوں کی سعیٔ مسلسل کے بعد نوآبادیاتی نظام کی اساس مستحکم کرنے میں بھی کامیاب ہو چکے تھے۔ جس کے نتیجے میں سلطنت برطانیہ پر کبھی سورج غروب نہ ہوتا تھا اور جس کا پھل انہوں نے اگلی صدی تک کھانا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی[43] نے تجارتی اور سیاسی مہم جوئی کے لیے کیا کچھ نہ کیا اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں اردو نثر کے لیے کیا کچھ کیا گیا۔ ان سب کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ اس لیے تکرار کی ضرورت نہیں لہٰذا اپنے موضوع کی حدود میں رہتے ہوئے یہ جائزہ لیتے ہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان کی ڈکشنریوں کے سلسلے میں کیا کچھ کیا۔ اٹھارویں صدی کے آواخر سے ایسی ڈکشنریاں مدون کی جانے لگیں جو اس زمانے میں خاصی مقبول تھیں اور اب بھی تاریخی اہمیت کی حامل ہیں۔ گل کرسٹ اس ضمن میں خصوصی تذکرہ چاہتا ہے۔

محمد عتیق صدیقی کی تالیف "گل کرسٹ اور اس کا عہد" سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ گل کرسٹ نے خاصی مالی مشکلات اور پریشانیوں کے بعد ڈکشنری مکمل کی تھی حتٰی کہ اتنا مقروض ہو گیا کہ مسٹر ڈکو پر جا ہو کلا

کے پاس لغت کے حقوق کا رہن نامہ رکھنا پڑا۔ (ص: ۸۳) اس ضمن میں غازی پور سے ۱۲ ، مئی ۱۷۹۰ء کو جو "اشتہار" شائع کیا گیا اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ڈکشنری کی فروخت سے گل کرسٹ کو اس وقت تک کوئی تعلق نہ ہوگا، "جب تک قرض کی رقم ادا نہ ہو جائے۔ اس وقت تک مولف کو اس رقم کی وصولی کا قطعاً کوئی حق نہیں ہے۔" (ص ۸۴، ۸۳) گل کرسٹ دُھن کا پکا تھا چنانچہ نامساعد حالات اور مالی مشکلات کے باوجود ششٹم پشٹم جس طرح بھی بن پڑا۔ ۱۷۸۶ء میں "DICTIONARY ENGLISH HINDOOSTANEE" کا پہلا اور چار سال بعد دوسرا حصہ چھاپا۔ وہ تو اس کا تیسرا حصہ بھی طبع کرانا چاہتا تھا لیکن ایسا نہ ہو سکا۔ البتہ ہندوستان سے واپس اپنے وطن ایڈنبرا پہنچ کر ان دونوں حصوں کو یکجا کر کے مکمل ڈکشنری ۱۸۱۰ء میں طبع ہوئی۔ ۷۰۲ صفحات پر مشتمل ڈکشنری کے سرورق پر اس کے دوست تھامس روبک کا نام بھی درج ہے۔ پروفیسر ایس کے حتیٰ کے مقالہ "اردو لغت نویس اور اہلِ انگلستان" کے بموجب لندن سے ۱۸۱۰ء میں اس کا ایڈیشن طبع ہوا تھا۔ اب معلوم نہیں یہ ایڈیشن جداگانہ تھا یا وہی ایڈنبرا والا تھا۔ تاہم ان ایڈیشنوں کی یہ خصوصیت قابل ذکر ہے کہ ہندوستانی ایڈیشن میں انگریزی الفاظ کے معنی اردو اور فارسی رسم الخط میں ہیں جبکہ ایڈنبرا اور لندن ایڈیشن کے تمام الفاظ رومن میں۔ شاید یہ عجیب محسوس ہو لیکن، غالباً گل کرسٹ نے یہ ڈکشنری ہندوستانیوں کی بجائے انگریزوں کی ضروریات کو مدنظر رکھ کر مدوّن کی ہو گی۔ اسی لیے معنی رومن میں دیئے۔

عطش درانی کے بقول "۱۷۹۰ء میں اردو کا پہلا مکمل لغت ڈاکٹر ہنری ہیرس نے مدراس سے شائع کیا۔ اس کی کتاب "اے ڈکشنری آف انگلش اینڈ ہندوستانی" اپنے موضوع پر ایک جامع حوالہ جاتی کتاب ہے۔ اس لغت کا ایک نسخہ احسان دانش کے کتب خانے میں موجود تھا۔ اس پر سنہ اشاعت ۱۷۹۰ء درج ہے۔ مگر محمد عتیق صدیقی نے "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں سنہ اشاعت ۱۷۹۱ء بیان کیا ہے۔ اس لغت کے مطالعے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تدوین میں جدید ترین معیار کو سامنے رکھا گیا۔ صفحات کے نمبر نہیں دیئے گئے البتہ ہر صفحہ دو کالموں میں منقسم ہے اور

ان کالموں کے نمبر دیئے گئے ہیں۔ کتاب دو ہزار باون ۲۰۵۲ کالموں یعنی ایک ہزار چھبیس ۱۰۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے علاوہ ۱۵۸ صفحات اشاریہ کے بھی ہیں۔ کتاب کے اختتام پر اغلاط نامہ درج کیا گیا ہے۔ الفاظ لکھنے سے پہلے ان کے ماخذ (زبان) کو درج کر دیا گیا ہے۔ اور معنی بتانے سے پیشتر بتایا گیا ہے کہ یہ کس لفظ سے مشتق ہے اور اس کا تلفظ کیا ہے۔ اگر سنسکرت کا لفظ ہے تو دیوناگری رسم الخط میں بھی اسے تحریر کیا گیا ہے۔ زیادہ تر ہندی، سنسکرت عربی، فارسی، ترکی، یونانی اور انگریزی ماخذوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ دیگر خصوصیات جدید لغات کی ہیں۔ مثلاً تذکیر و تانیث، واحد جمع وغیرہ کی نشاندہی بھی کی ہے۔"[45]

عطش درانی نے یہ ڈکشنری خود دیکھی تھی، اس لیے اس کے بارے میں مکمل کوائف بہم پہنچا سکے وہ اس سلسلے میں مزید لکھتے ہیں: "مسٹر لو نے اپنی کتاب" ویسٹیج آف اولڈ مدراس" میں مدراس کے ایک اخبار "مدراس کوریر" کے حوالے سے لکھا ہے کہ کپتان ہیرس کی کتاب کی دوسری جلد پہلے شائع ہوئی تھی اور پہلی جلد شائع ہونے والی تھی۔ دوسری جلد کا نام انھوں نے "انیلسز گرامر اینڈ ڈکشنری آف ہندوستانی لینگویج" بیان کیا ہے۔ گریرسن نے اس پر اتنا اضافہ کیا ہے، کہ دوسری جلد غالباً شائع نہیں ہو سکی۔ راقم الحروف نے اسے "اے ڈکشنری آف انگلش اینڈ ہندوستانی" کی صورت میں دیکھا جو ۱۷۹۰ء میں شائع ہوئی تھی۔ غالباً یہ اس کی وہی جلد ہو گی، اور دوسری جلد اردو سے انگریزی ہو گی۔"[46]

محمد عتیق صدیقی نے اس لغت کو "جامع" قرار دیتے ہوئے گل کرسٹ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ "اس لغت کی ترتیب و تالیف میں ڈاکٹر ہیرس نے "بڑی محنت اور صحت" سے کام لیا ہے، اور یہ کتاب ہندوستانی زبان سے مؤلف کی، پوری پوری واقفیت کے ناقابل تردید ثبوت" فراہم کرتی ہے۔ گل کرسٹ نے اس کا بھی اعتراف کیا ہے کہ ڈاکٹر ہیرس نے "کچھ منتخب الفاظ اخذ کر کے اپنے "ضمیمے" میں شامل کیے تھے۔ ڈاکٹر ہیرس کی کتاب کا نام تھا۔[47]

"ANALSYSIS,GRAMMER AND DICTIONARY OF THE HINDUSTANY LANGUAGE"

ہیرس کی لغت اگرچہ کئی لحاظ سے جامع نظر آتی ہے مگر اپنی اہمیت کے باوجود یہ اس نوعیت کا پہلا کام نہ تھا کیونکہ ۱۷۷۳ء میں جے فرگوسن کی ——————

"A SHORT DICTIONARY OF THE HINDOSTAN LANGUAGE" دو حصوں میں شائع ہو چکی تھی۔"[۴۸]

اسی دوران میں جارج ہیڈلے کی بھی ڈکشنری شائع ہوئی مگر وہ صرف و نحو کے ساتھ تھی۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد کے بقول "ہیڈلے کی صرف و نحو مع فرہنگ انگریزی و مور کے الفاظ فارسی رسم خط میں ہے۔ ان الفاظ کا خاص طور پہ ذکر کیا گیا ہے جو متحد الصوت اور مختلف المعنی ہیں اس کے مختلف ایڈیشن ۱۷۷۴ء، ۱۷۷۹ء، ۱۷۹۷ء، ۱۸۰۲ء، ۱۸۰۹ء میں شائع ہوئے۔" (ص: ۲۸) معلوم ہوتا ہے کہ ہیڈلے ہر ایڈیشن میں اضافے کرتا گیا۔ کیونکہ گل کرسٹ کی لغت کی اشاعت (۱۷۹۰ء) کے بعد ہیڈلے کے لغت کا جو ایڈیشن، ۱۷۹۰ء میں شائع ہوا تھا اس میں ہیڈلے نے گل کرسٹ کی شکایت کے بموجب اس کے لغت سے کچھ الفاظ اور ان کے معنی "چرا کر" شامل کر لیے تھے۔ اور صرف دو جگہ گل کرسٹ کے لغت کا حوالہ دیا۔ گل کرسٹ نے حل کر اسے "دو کوڑی کی کتاب" قرار دیا تھا۔"[۴۹]

کپتان تھامس روبک گل کرسٹ کا قریبی دوست اور فورٹ ولیم کالج کلکتہ کا اسسٹنٹ سیکریٹری تھا (۱۷۔۱۸۱۱ء)۔ اسے اردو زبان و ادب سے جو دلچسپی تھی گل کرسٹ کی صحبت نے اس میں مزید نکھار پیدا کیا۔ کپتان روبک کی شہرت رومن میں لکھے گئے لغت جہازرانی (کلکتہ ۱۸۱۱ء طبع دوم لندن ۱۸۱۳ء) سے ہوئی۔ یہ ایک مقبول لغت تھا جس میں جہازرانی سے متعلق اصطلاحات اور مخصوص الفاظ کے معنی درج تھے۔ اس کے متعدد ایڈیشن طبع ہوتے رہے۔ چھٹا ایڈیشن "لشکری لغت" (۱۸۸۲ء) کے نام سے چھپا۔

کپتان تھامس روبک کی "HINDOSTANI INTERPRETER" (لندن ۱۸۱۸ء) اگرچہ یہ کتاب اصولِ قواعد سے بحث کرتی ہے۔ تاہم اس میں فرہنگ بھی خصوصی تذکرہ چاہتی ہے۔

بھی تھی۔ دوسرے ایڈیشن (لندن ۱۸۲۴ء) کے بعد لندن اور پیرس سے تیسرا ایڈیشن ۱۸۴۱ء میں طبع ہوا۔

شانتی رنجن بھٹاچاریہ نے اپنے مقالے " بنگال کے انگریز مصنفین اردو" میں کپتان تھامس روبک کے تذکرہ میں لکھا ہے کہ ان کا انتقال کلکتہ میں ہوا اور قبر کے کتبہ کے مطابق انتقال کی تاریخ ۸ دسمبر ۱۸۱۹ء ہے۔

کچھ اور انگریزوں کے لغات کے تذکرے بھی ملتے ہیں۔ ان میں سے بیشتر ایسے ہیں جو ایک دو مرتبہ چھپے پھر معدوم ہوگئے۔ اس لیے ان کی خوبیاں خامیاں گنوانا ممکن نہیں تاہم ان کی اتنی اہمیت یقیناً ہے کہ انگریز لغت نویسوں کی دو صدیوں پہ پھیلی روایت میں ان کا بھی ذکر آتا ہے۔

ڈاکٹر ولیم ہنٹر کی "ADICTIONARY OF HINDUSTANI AND ENGLISH" دو جلدوں میں کلکتے سے ۱۸۰۶ء میں چھپی۔

وائی رابرٹ کی ایک ہزار ، "INDIAN GLOSSARY" لندن سے ۱۸۰۰ء میں طبع ہوئی۔

ولیم ٹننٹ کی گرامر لغت اور اسباق زباندانی ۱۸۲۴ء، ۱۸۲۷ء اور ۱۸۳۳ء میں طبع ہوئی۔

جارج کلیفرڈ وٹ ورتھ (I)، کی "AN ENGLO - INDIAN DICTIONARY" لندن سے ۱۸۸۲ء میں شائع ہوئی۔ سرورق پہ درج عبارت کے مطابق " یہ انگریزی میں مستعمل ہندوستانی اصطلاحات اور ان انگریزی یا دیگر غیر ہندوستانی اصطلاحات کی فرہنگ ہے جنھوں نے ہندوستان میں خصوصی معانی حاصل کر لیے ہیں "۔ یہ ڈکشنری اس لحاظ سے اپنی نوعیت کی غالباً واحد مثال ہے کہ مؤلف نے اردو کے عام الفاظ کے برعکس صرف ان الفاظ کا انتخاب کیا جو ہندوستان میں رہائش پذیر انگریزوں کی زبان کا جزو بن چکے ہیں۔ اس لحاظ سے مؤلف نے پیش لفظ میں اسے " انگلش ڈکشنری ہندوستانی ضمیمہ " قرار دیا ہے اور

یہ بالکل درست ہے۔ الفاظ اور ان کے معنی انگریزی میں ہیں لیکن یہ وضاحت کر دی گئی ہے کہ لفظ کس زبان کا ہے۔ ۳۵۰ صفحات کی اس ڈکشنری میں الفاظ کے ساتھ اشیاء، تاریخی شخصیات و قبائل، جغرافیہ، سرکاری عہدے داروں کے بارے میں مختصر ترین معلومات بھی مل جاتی ہیں۔

جے جے ٹاؤنسن کی اردو انگریزی ڈکشنری ۱۸۳۸ء میں رام پور سے طبع ہوئی۔

ایچ ایم ایلیٹ کی "GLOSSARY OF INDIAN TERM" ۱۸۴۵ء میں آگرہ سے چھپی۔

ڈاکٹر ایف ہیچن کی میڈیکل لغت کلکتہ میں ۱۸۷۳ء اور اس کے بعد ۱۸۷۷ء میں شائع ہوئی۔

ایچ انڈوس کی اردو انگلش لغت کا ساتواں ایڈیشن کلکتہ سے ۱۸۶۹ء میں چھپا۔

ڈاکٹر آغا افتخار حسین کے مقالہ "برطانیہ میں اردو" میں ان لغت نویسوں کے نام ملتے ہیں:

نارتھ برائس ۔ ہندوستانی انگریزی ڈکشنری ۱۸۴۷ء

بلوک مین ۔ انگریزی اردو ڈکشنری ۱۸۷۷ء

یونگ ۔ یونانی اردو لغت [51]

ان کے علاوہ پروفیسر ایس کے حسنی کے مقالے "اردو لغت نویسی اور اہل انگلستان" میں مزید لغت نویسوں کا ذکر بھی ملتا ہے۔ سو ان کے بقول ہنری گرانٹ نے ۱۸۵۰ء میں اپنا لغت ترتیب دیا۔ J. P. HAZELGROVE نے ۱۸۶۵ء میں، لاگ نے ۱۸۷۷ء میں ریورنڈ کریون نے ۱۸۹۰ء، تھابرن نے ۱۸۹۱ء اور راکنگ نے ۱۹۰۵ء میں انگریزی اردو لغت ترتیب دیئے ہیں [52]

ان میں سے بیشتر لغات ان انگریزوں نے لکھے جن کے بارے میں کوئی خاص معلومات نہیں ملیں، اس لیے کتابیاتی کوائف کا بہم پہنچانا ناممکن نہیں تو آسان بھی نہیں۔ لیکن اب جن لغات کا ذکر

کیا جائے گا ان کے مولفین گمنام نہیں۔

ڈی ڈی ولیم ایڈمس ایک مشنری تھا مگر اسے زبانیں سیکھنے کا شوق تھا۔ ہندوستان آکر اس نے اردو کے علاوہ سنسکرت ہندی اور بنگلہ میں اتنی استعداد پیدا کرلی کہ لغت لکھنے کے قابل ہوگیا۔ کچھ دیر کے لیے یہ کلکتہ سکول بک سوسائٹی میں سنسکرت اور بنگلہ کے شعبہ کا سیکرٹری بھی رہا اس کی دو کتابیں قابلِ ذکر ہیں۔ ۳۳۶ صفحات کی "INTRODUCTION TO HINDUSTANI" (کلکتہ ۱۸۲۰ء) جو اردو گرامر، الفاظ، اسباق کی صورت میں تین حصوں پر مشتمل ہے۔ اس کی ہندوستانی انگریزی لغت خاصی معروف ہے اور شانتی رنجن بھٹاچاریہ کے بقول مصنف پیش لفظ میں لکھتا ہے کہ اس نے اس لغت میں سنسکرت آمیز یا ہندوی الفاظ کو شامل نہیں کیا۔ لیکن یہ بات نہ تو درست ہے اور نہ ہی ممکن ہے۔ کیونکہ اردو ہندوستانی زبان ہے جس میں بے شمار الفاظ سنسکرت سے آئے ہیں یا ہندوستان کی دیگر پراکرت زبانوں سے۔ ہاں مصنف چونکہ سنسکرت سے واقف تھے اس لیے انھوں نے اس بات کی کامیاب کوشش کی کہ ٹھیٹھ سنسکرت الفاظ سے ان کی لغت پاک رہے۔ دیباچہ کی تاریخ جنوری ۱۸۴۷ء ہے اور ۱۸۴۷ء ہی میں یہ بیپٹسٹ مشن پریس کلکتہ سے چھپ کر شائع ہوئی۔ اس کے صفحات ۵۸۴ ہیں [۵۳]

لغت نگاری کے سلسلے میں کیپٹن جوزف ٹیلر کا نام اور کام بھی قابلِ توجہ ہے۔ جان شیکسپیئر کی انگریزی اردو لغت کے پیش لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پہلے پہل کیپٹن جوزف ٹیلر نے اپنے ذاتی استعمال کے لیے یہ ڈکشنری مرتب کی تھی۔ بعد میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ کے "لرنڈ نیٹو" کی اعانت سے ڈاکٹر ولیم ہنٹر نے ۱۸۰۸ء میں اسے کلکتہ سے طبع کروایا۔ اس کا نام تھا:

"A DICTIONARY OF HINDUSTANI ENGLISH" یہ لغت خاصا مقبول ہوا اور اس کی طلب میں کمی نہ ہوئی۔ مگر اس لغت سے متعلق دونوں حضرات کا انتقال ہوچکا تھا۔ ادھر لغت بھی بالعموم دستیاب نہ تھا۔ چنانچہ ترامیم اور اضافوں کے ساتھ ۱۸۱۷ء میں لندن سے طبع کیا گیا۔ مسلسل طلب کی بنا پر تین سال بعد تیسرا اور پھر ۱۸۳۴ء میں چوتھا ایڈیشن طبع ہوا جس

میں انڈیکس کے اضافہ سے افادیت میں مزید اضافہ ہو گیا۔ بعد ازاں جان شیکسپیئر نے مزید الفاظ کے اضافے سے اسے اپٹوڈیٹ کر دیا۔ پیش لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ لغت میں دکھنی کی زبان کے الفاظ کا بطور خاص اضافہ کیا گیا اور ان کتب کی نشاندہی بھی کر دی گئی جن سے الفاظ اخذ کیے گئے تھے جیسے پریم ساگر (کلکتہ ۱۸۲۵ء) ڈاکٹر ہیرس کی ڈکشنری انگلش اینڈ ہندوستانی" (مدراس ۱۷۹۰ء) دکھنی انوار سہیلی (مدراس ۱۸۲۴ء) ڈاکٹر ہر کلوڈس کی قانون اسلام (لندن ۱۸۳۲ء) اور "AN INTRODUCTION TO THE STUDY OF HINDUSTANI LANGUAGE AS SPOKEN IN CARNATIC" (مدراس ۱۸۰۸ء) یوں دیکھیں تو شیکسپیئر ۱۸۳۴ء کا مرتبہ ایڈیشن ایک لحاظ سے نئے لغت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ جان شیکسپیئر مستشرقین میں خاصا اہم نام ہے۔ وہ مشرقی زبانوں بالخصوص عربی کا ماہر تھا اور رائل ملٹری کالج مارلو میں مشرقی زبانوں کا پروفیسر تھا۔ اس کی تالیفات میں "AN INTRODUCTION TO HINDUSTANI" بھی خاصی معروف ہے۔

مستشرقین میں ڈنکن فاربس بھی اہم نام ہے۔ اس کی ڈکشنری تقریباً پندرہ ہزار الفاظ پر مشتمل تھی۔ ادبی کے پہلو بہ پہلو اس نے اُن الفاظ کو بھی ڈکشنری میں شامل کر لیا جو روزمرہ کی زندگی اور عام اشیاء سے متعلق تھے۔ لندن سے ۱۸۷۹ء میں طبع ہونے والی ڈکشنری کا مکمل نام یہ ہے:

"A DICTIONARY ENGLISH HINUSTANI AND ACCOMPANIED BY A REVERSED DICTIONARY OF ENGLISH AND HINDUSTANI"

ڈنکن فوربس باغ و بہار کے مستند ایڈیشن کے لیے بھی خصوصی شہرت رکھتا ہے۔ جب ۱۸۶۳ء میں اس نے لندن سے باغ و بہار کا دیدہ زیب چوتھا ایڈیشن طبع کیا تو ۲۵۲ صفحات پر مشتمل باغ و بہار کے اختتام پر ۱۲۵ صفحات کی فرہنگ بھی شامل کر دی۔ اس نے ہر لفظ کے انگریزی کے معانی بیان کرنے کے ساتھ تلفظ اور تذکیر و تانیث کی بھی وضاحت کر دی۔ اگرچہ یہ صرف باغ و بہار کی فرہنگ ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ اسی بناء پر آج یہ خصوصی اہمیت اختیار کر جاتی ہے کہ

دلی کے روڑے سے میراامن نے باغ و بہار کے قصے کو ٹھیٹھ ہندوستانی گفتگو میں جو اردو کے لوگ ہندو مسلمان عورت مرد، لڑکے بالے خاص و عام آپس میں بولتے چالتے ہیں "قلمبند کیا تھا۔ اس لحاظ سے تو یہ انیسویں صدی کے آغاز کی دلی کے گلی کوچوں میں بولی جانے والی زبان کی چھوٹی سی ڈکشنری بن جاتی ہے۔

ڈاکٹر ایس ڈبلیو فیلن کی "A NEW HINDUSTANI ENGLISH DICTIONARY" لندن سے ۱۸۷۹ء میں چھپی تھی۔ ڈاکٹر فیلن ایک کامیاب ڈکشنری کے فنی تقاضوں سے آگاہ تھا۔ چنانچہ اس نے ڈکشنری کے ذخیرۂ الفاظ کو بہ تنوع بنانے کے ساتھ ساتھ ماخذ تذکیر و تانیث کے بارے میں بھی معلومات بہم پہنچانے کی کوشش کی۔ جیسا کہ اس نے دیباچہ میں لکھا:

"...... اہم ترین خصوصیت یہ ہے کہ ہندوستان میں جن لوگوں کی مادری زبان ہندی ہے۔ ان کی ٹھیٹھ گفتگو کے الفاظ کو بطور خاص جگہ دی گئی ہے۔ یہی نہیں بلکہ پہلی مرتبہ دونوں کی ملاوٹ سے پاک زبان کے خالص الفاظ بھی شامل لغت ہیں۔ جہاں تک الفاظ کے معانی کا تعلق ہے تو اس مقصد کے لیے شاعری، گیتوں، محاورات اور کہاوتوں کے ساتھ ساتھ روزمرہ کی عوامی گفتگو سے بھی مثالیں اخذ کی گئیں۔"

یہ لغت اس بنا پر بھی قابل توجہ ہے کہ سید احمد دہلوی مؤلف "فرہنگ آصفیہ" اس لغت کی تدوین میں فیلن کے معاون تھے۔ [۵۴] یوں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لغت نویسی کے اصول اور قواعد انہوں نے فیلن ہی سے سیکھے ہوں گے۔ اور پھر ان ہی کی روشنی میں انہوں نے "فرہنگ آصفیہ" مدوّن کی ہوگی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جو محققین فیلن کے کام سے خوش نہیں وہ فرہنگ آصفیہ کے بھی قائل نہیں اور فیلن جسے اپنے لغت کی خوبی سمجھتا تھا وہ خامی قرار پائی۔ بقول جابرہ علی سیّد:

"..... اس کی خصوصیت محاورات و امثال کی کثرت اور ادبی اصطلاحات کا فقدان ارادی ہے۔ جس کی کمی کو پلیٹس پورا کرتی ہے۔ فیلن کی ادبی گریز پائی

ایسی نمایاں ہے کہ پلیٹس اور مولوی عبدالحق دونوں نے اس کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ افسوسناک بات یہ ہے کہ سید احمد دہلوی نے بھی فیلن کے وطیرہ کے آگے سر تسلیم خم کر دیا ہے۔ ابتذال جیسا اہم کثیر المعانی لفظ دونوں نے نکال باہر کیا ہے۔" [۵۵]

پلیٹس نے اپنی ڈکشنری کے پیش لفظ میں ڈاکٹر فیلن پر یہ اعتراض کیا:

"ڈاکٹر فیلن نے اپنی ڈکشنری میں اردو اور ہندی ادب کے سینکڑوں الفاظ کو اس بنا پر خارج کر دیا کہ اس کے نقطۂ نظر کے مطابق یہ الفاظ علمیت کے مظہر ہیں۔ جس کے باعث کم از کم طلبار کی حد تک تو اس کی کتاب کی افادیت خاصی کم ہو جاتی ہے۔ تاہم اس کے باوجود بھی اس کا کام خاصا اہم ہے اور بلاشبہ شعرار کے کثیر حوالوں اور لاتعداد محاورات اور ضرب الامثال کی بنار پر محققین کے لیے یقیناً باعث افادہ ثابت ہو گی۔"

ان اعتراضات کے باوجود فیلن کی ڈکشنری کی خصوصیات اور اہمیت نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس لیے کہ پہلی مرتبہ ناخواندہ اور دیہی عوام کی گفتگو کے تمام الفاظ اور محاورات کو بطورِ خاص جمع کیا گیا۔ غالباً اس معاملے میں وہ بھی اپنے ہموطن ورڈز ورتھ کے اس تصور کا حامی تھا کہ شہروں کے تعلیم یافتہ حضرات کے مقابلے میں دیہاتی فطرت کے زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس لیے ان کی مانند ان کی زبان بھی زیادہ فطری ہوتی ہے۔ اس کی لغت ۱۲۱۶ صفحات پر مشتمل ہے۔

ڈاکٹر فیلن کی قانون اور تجارت سے متعلق الفاظ اور اصطلاحات پر مبنی
"A HINDUSTANI ENGLISH LAW AND COMMERCIAL DICTIONARY"
۱۸۷۹ء میں بنارس سے طبع ہوئی تھی۔ ۲۸۴ صفحات کی اس ڈکشنری میں ہندی الفاظ دیوناگری میں بھی لکھے گئے ہیں۔

جان ٹی پلیٹس کی "A DICTIONARY OF URDU, CLASSICAL HINDI AND ENGLISH"

۱۸۸۴ء میں پہلی مرتبہ لندن سے طبع ہوئی اور چھپتے ہی مقبول ہوگئی۔ اس کا چوتھا ایڈیشن ۱۹۱۱ء اور پانچواں ۱۹۳۰ء میں طبع ہوا۔ ۱۹۶۳ء میں آخری مرتبہ چھپی جبکہ پاکستان میں ۱۹۸۳ء میں پہلی مرتبہ طبع ہوئی۔

ڈکشنری کے پیش لفظ میں پلیٹس نے جہاں فیلن پہ اعتراضات کیے وہاں یہ اعتراف بھی کیا کہ یہ ڈکشنری جان شیکسپیئر کی ڈکشنری کے انداز پہ مدون کی گئی ہے۔ پلیٹس نے عوامی گفتگو اور غیر کتابی الفاظ کو بھی شامل کیا ہے۔ پلیٹس نے ہر لفظ کا ماخذ ظاہر کیا اور مختلف المعنی مگر ہم صوت اور یکساں املا والے الفاظ کو یکجا کر دینے کے بر عکس الگ الگ سطر میں ماخذ کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ ہندی الفاظ دیوناگری رسم الخط میں لکھے ہیں۔ جبکہ سنسکرت، عربی اور فارسی الفاظ کے ضمن میں پلیٹس نے تمام ماخذ کا حوالہ بھی دیا ہے اور جان شیکسپیئر کی مانند لفظ سے پہلے اس زبان کے نام کا پہلا حرف رومن میں درج کیا ہے۔ یعنی لفظ سے پہلے H کا مطلب ہندوستانی ہوگا۔ یہ ڈکشنری باریک ٹائپ کے ۱۲۵۹ صفحات پہ مشتمل ہے۔ جہاں تک اس کی خوبیوں یا خامیوں کا تعلق ہے جابر علی سید کے بقول:

"...... کئی اعتبار سے مثالی ہے۔ اصلاً یہ انگریزوں کے لیے لکھی گئی ہے یہی وجہ ہے کہ اس میں انگریزوں کے تصور اور بصورت ہندوستانی اردو + ہندی کی یہ بہترین مثال ہے۔ اصناف سخن کا صحیح ادراک اس میں مفقود ہے۔ یہ اس کا کمزور ترین پہلو ہے لیکن اس سے ہندی سنسکرت الفاظ اور دیوناگری رسم الخط بآسانی سیکھا جا سکتا ہے۔ فارسی الفاظ کی اصل بھی قابل تعریف پہلو ہے۔ اس معاملے میں اغلب ہے کہ مولف نے سب سے بڑھ کر برہان قاطع جیسی مقبول اور بآسانی دستیاب لغت سے پورا استفادہ کیا ہے۔"[56]

جابر علی سید نے پلیٹس کی لغت اور اس کے ساتھ "فرہنگ آصفیہ" کا محاکمہ کیا ہے اور پھر ان کے اعتراضات پہ وارث سرہندی نے تبصرہ کیا ہے۔ ملاحظہ کیجئے کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ:

اور اب آخر میں تذکرہ ایسی ڈکشنری کا جو حضرت امام حسن اور حضرت امام حسین کے نام نامی

سے موسوم کی گئی ہے۔ کرنل سر ہنری یول اور آرتھر کوک برنل اس کے مؤلفین ہیں۔ ۱۸۸۶ء میں لندن سے طبع ہونے والی ڈکشنری کا مکمل نام یوں ہے :

"HOBSON JOBSON BEING A GLOSSARY OF ANGLO INDIAN COLLOQUICAL WORDS AND PHRASES AND OF KINDERED TERMS: ETYMOIL OGICAL, ETHMOILOGICAL, HISTORICAL GEOGRAPHICAL DISCURIVE"

اس کے بارے میں جملہ کوائف آغا افتخار حسین کی کتاب "یورپ میں اردو" سے ماخوذ ہیں۔ کرنل یول کے والد میجر ولیم یول عربی اور فارسی کے فاضل تھے۔ انہوں نے اور کتابوں کے علاوہ حضرت علی کی "نہج البلاغۃ" کا بھی ترجمہ (۱۸۳۲ء) کیا تھا۔ گھر کے علمی ماحول کے باعث یول کو بھی اسلام سے دلچسپی پیدا ہو گئی۔ اس نے ڈکشنری کے دیباچے میں نام کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا یا حسن یا حسین انگریزی میں ہابسن جابسن بن گئے۔ اس نام میں مولفین کی طرف اشارہ بھی ہے۔ اشتقاقی نقطہ نظر سے یہ لغت پر از معلومات ہے اور مؤلفین نے انگریزی کے متعدد الفاظ کو عربی فارسی اردو اور جنوبی ہند کی زبانوں سے مشتق قرار دیا ہے۔ اس طرح یورپ کی زبانوں سے جو الفاظ اردو کا حصہ بن گئے ان کی وضاحت بھی کر دی گئی۔ مولفین نے اس ضمن میں ہر طرح کی ادبی تاریخی اور جغرافیائی معلومات جمع کر دی ہیں۔ حوالہ جاتی تنوع کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۰ کتابوں سے استفادہ کیا گیا۔ جس کے نتیجے میں یہ ڈکشنری مینچر انسائیکلوپیڈیا میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ مثلاً مولفین نے پشاور کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں ۴۰۰ عیسوی سے لے کر ۱۸۶۳ء تک کے مستند تاریخی حوالوں کی مدد سے پشاور کے بارے میں معلومات فراہم کر دی ہیں۔ اسی طرح انگریزی لفظ GRABE جمخانہ، پنکھا، پنجاب، شلوار، رن کچھ، شمپو وغیرہ کی مثالوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ لفظ کس طرح صدیوں کا سفر کر کے مختلف تہذیبوں اور زبانوں میں صورتیں بدلتا جاتا ہے۔ کیا کوئی سوچ سکتا ہے کہ ہماری شلوار کا لفظ یونانی زبان میں آج سے دو ہزار سال قبل بھی رائج تھا۔ الغرض ایک صدی پیشتر چھپنے والی یہ ڈکشنری اب بھی استفادہ کے قابل ہے۔ تعجب ہے کہ ہمارے کسی بھی علمی

ادارے کو اس کی اشاعت کا دھیان نہیں آیا۔

تو یہ تھی مختصر الفاظ میں لغت نویسی کی داستان جس کا آغاز فارسی سے ہوا مگر نیا خون یورپین محققین اور مستشرقین نے دیا۔ جب یورپین نے آغازِ کار کیا تو ان کے سامنے فارسی کی قدیم اور روایتی فرہنگوں کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔ مگر انہوں نے اہل زبان نہ ہوتے ہوئے بھی جس محنت اور لگن سے لغت نویسی میں جادہ تراشی کی اس کی داد نہ دینا زیادتی ہوگی۔ واضح رہے کہ اس عہد میں آج کی مانند لاکھوں کی گرانٹ سے چلنے والے نہ تو سرکاری ادارے تھے نہ ائیرکنڈیشنڈ دفاتر نہ لمبی گاڑیاں نہ سیکرٹری نہ ٹائپ اور نہ ہی چپڑاسی کو بلانے والی گھنٹی۔ یہ سب کام انہوں نے اپنے شوق لگن اور جذبہ تحقیق سے کیا۔ گل کرسٹ کے لغت کے سلسلے میں بتایا جا چکا ہے کہ وہ کس طرح مالی پریشانیوں کا شکار رہا حتیٰ کہ قرض خواہ کے پاس ڈکشنری کے حقوق رہن رکھنے پڑ گئے۔

یورپین اور بالخصوص انگریز لغت نویسوں کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے لغت نویسی کے جدید اصولوں اور قواعد کے مطابق کام کیا۔ تقابلی لسانیات اور تقابلی صوتیات کو ملحوظ رکھا۔ اشتقاق کا اہتمام کیا۔ اس سلسلے میں دلچسپ بات یہ ہے کہ خود تو یہ لوگ اردو کی بعض اصوات کی درست ادائیگی سے قاصر تھے۔ اس لیے ٹ ق غ جیسے حروف اور دوچشمی ھ والے بیشتر الفاظ کے درست تلفظ کے اہل نہ تھے۔ مگر اپنی ڈکشنریوں میں انہوں نے صوتی مخارج، املا اور تلفظ کے بارے میں بطور خاص سعی کی۔ اس پر مستزاد یہ کہ الفاظ و محاورات کے استعمال کی مثالوں میں اشعار نقل کیے۔ الغرض انہوں نے مقامی لوگوں کو لغت نویسی کے فنی رموز سے آگاہ کیا۔ یہ درست ہے کہ بعد کے محققین نے ان پر اعتراضات کیے جو سب کے سب غلط بھی نہ تھے۔ لیکن ہزاروں الفاظ پر مشتمل لغت میں چند الفاظ کی غلطیاں کوئی اتنا بڑا جرم نہیں۔ اور اس نوع کے کام میں غلطیوں کا ہمیشہ امکان رہتا ہے۔ "فرہنگ آصفیہ"، "نوراللغات"، "جامع اللغات"، "امیراللغات" اور دیگر اردو لغات پر بھی تو اعتراضات ہوتے رہے ہیں۔ جب زبان دانوں کا یہ حال ہے تو پھر غیر ملکی تو قابل

معانی ٹھہرے۔

"فرہنگ آصفیہ" پہ قاضی عبدالودود کا سلسلہ مضامین اور جابر علی سید کا محاکمہ "نور اللغات" اور "جامع اللغات" پہ مولوی عبدالحق کے تبصرے (تنقیدات عبدالحق) اور مرکزی اردو بورڈ کراچی کی لغت میں سے رشید حسن خان نے جس طرح کیڑے نکالے ہیں، یہ عبرتناک ہے۔ یہ تو تھا اپنی زبان کا حال اور اہل زبان اور زبان دان حضرات کا کمال۔ لیکن جب انگریزی میں کام کیا تو کیا ہوا؟ اس کا اندازہ اس مثال سے ہو جاتا ہے۔ انجمن ترقی اردو کی "دی سٹینڈرڈ انگلش اردو ڈکشنری" (مرتبہ مولوی عبدالحق) پہ ڈاکٹر تاثیر نے جو مضمون لکھا اور اس میں جس طرح سے اس ڈکشنری کا "ریکارڈ" لگایا گیا وہ قابلِ مطالعہ ہے "نثر تاثیر" مرتبہ فیض احمد فیض)

میرا مقصد ان کاموں کی وقعت کو کم کرنا نہیں، صرف یہ واضح کرنا مقصود تھا کہ اِس نوعیت کے بڑے اور مشکل منصوبے اغلاط سے پاک نہیں ہو سکتے۔ لہٰذا اردو والوں کی ان مثالوں کے بعد یورپین کی ابتدائی کاوشوں کی اہمیت اور بھی بڑھ جانی چاہیئے۔

اور پھر جب لغت نویسی کے مسائل (مرتبہ: ڈاکٹر گوپی چند نارنگ) میں شامل ان مقالات کا مطالعہ کریں جن میں لغت نویسی کی فنی مشکلات اور اس سے وابستہ اصولوں اور قواعد سے بحث کی گئی ہے تو اس کام کی مشکلات کا مزید اندازہ ہو جاتا ہے۔

حواشی

۱۔ ڈکشنری کے اطالوی ماخذ "DICTIONORIOUS" کا لغوی مطلب ذخیرہ الفاظ ہے۔

۲۔ یونانی میں اس کے مفہوم کا لفظ "LEXICON" ہے۔ جبکہ "GLOSSARY" یعنی مختصر فرہنگ کا ماخذ یونانی "GLOSSA" یعنی زبان یا لسان ہے۔

۳۔ "فرہنگ آصفیہ" ۱۹۷۴ء

۴۔ سنسکرت میں لغت کو کوش کہتے ہیں۔ ہندی میں اس کے مترادفات ناگر، مالا اور سندھو ہیں۔

۵۔ ڈاکٹر جمیل جالبی "قدیم اردو کی لغت" ص: ۷

۶۔ "اردو لغت کی باتیں" از ڈاکٹر سہیل بخاری۔ مطبوعہ نقوش لاہور شمارہ ۱۲۰، جنوری ۱۹۷۶ء

۷۔ مقالہ مطبوعہ "اذکار" کراچی "برطانیہ میں اردو" ایڈیشن اپریل ۱۹۸۱ء

۸۔ "اردو لغت کی باتیں" از ڈاکٹر سہیل بخاری حوالہ سابق۔

۹۔ ترجمہ سید سعید احمد۔ مطبوعہ سہ ماہی اردو نمبر ۳ (۱۹۱۵ء) یہ وہی محمد علی ہیں جنہوں نے علامہ اقبال پر سب سے پہلا فارسی مقالہ قلم بند کیا۔

۱۰۔ "فارسی لغت نویسی کی تاریخ" حوالہ سابق۔

۱۱۔ "خالق باری" کے ضمن میں تحقیقی مباحث کے لیے ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے مقالہ "امیر خسرو اور خالق باری" مطبوعہ "ہم سخن" امیر خسرو نمبر گورنمنٹ کالج کراچی ۷۵۔۱۹۷۴ء سے رجوع کیا جا سکتا ہے۔

۱۲۔ "اردو کے منظوم لغت" مطبوعہ خیابان جنوری ۱۹۲۷ء

۱۳۔ "اردو زبان کے لغت" مطبوعہ ہندوستانی الہ آباد جنوری ۱۹۳۱ء

۱۴۔ اسی انداز پر کوئی کلیہ یا نکتہ سمجھانے کے لیے بعض اوقات اسے منظوم کر دیا جاتا تھا۔ خود میری چوتھی جماعت (۱۹۴۴ء) کی ریاضی کی کتاب میں بارہ مہینوں کے دنوں کی تعداد یاد کرانے کے لیے یہ اشعار درج تھے

جو مجھے آج بھی یاد ہیں بلکہ اب بھی اگر کسی مہینے کے تیس یا اکتیس دنوں کے بارے میں مغالطہ ہو جائے تو فوراً ان اشعار سے رجوع کرتا ہوں:

تیس ہیں دن ستمبر کے — اپریل جون نومبر کے
فروری کے ہیں اٹھائیس — باقی سب کے ایک اور تیس
فروری جب کہ لیپ کا آئے — اٹھائیس پر ایک بڑھائے

اس نوع کے اشعار "افادی ادب" کی دلچسپ مثال پیش کرتے ہیں۔

۱۵۔ "نوادر الالفاظ" مقدمہ ص: ۱
۱۶۔ بحوالہ "فارسی لغت نویسی کی تاریخ" اردو کراچی شمارہ نمبر ۳ ۱۹۷۵ء
۱۷۔ مطبوعہ مطبع محمدی دہلی ۱۸۶۵ء۔ سولہ صفحات
۱۸۔ مطبوعہ مطبع اکمل المطابع دہلی ۱۸۶۷ء - ۳۴ صفحات
۱۹۔ رشید حسن خان "زبان اور قواعد" ص: ۳۷۸ - ۳۷۹
۲۰۔ "دربار اکبری" ص: ۶۷
۲۱۔ ایضاً ص: ۶۸
۲۲۔ ایضاً ص: ۶۸
۲۳۔ ایضاً ص: ۶۸
۲۴۔ اصل کلکتہ انگریزوں نے ۱۶۱۵ء میں آباد کیا تھا جبکہ بمبئی (BOMBAY) ۱۶۶۱ء پرتگالیوں سے حاصل کیا۔
۲۵۔ برطانوی سفیر کیپٹن ہاکنز ۱۶۰۸ء میں جہانگیر کے دربار میں آیا۔ ۱۶۱۵ء میں سورت میں تجارت کی اجازت ملی۔
۲۶۔ بقول ڈاکٹر فرمان فتح پوری "کمرہ اطالوی زبان کا لفظ ہے۔" "زبان اور اردو زبان" ص: ۴
۲۷۔ ڈاکٹر رضیہ نور محمد "اردو زبان اور اردو ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" ص: ۱۴
۲۸۔ "تذکرہ یورپین شعرائے اردو" ص: ۹

۲۹۔ مقالہ" انگریزی دور کے آغاز میں اردو " مقالے میں مطبوعہ تقریر اصل صورت میں درج ہے (طابع نول کشور، لکھنؤ) "اردو نامہ" لاہور مارچ ۱۹۸۶ء

۳۰۔ "تنقیداتِ عبدالحق" ص: ۱۹۳

۳۱۔ یہی مقالہ "صحیفہ" لاہور جولائی ۱۹۶۷ء میں بھی چھپا۔

۳۲۔ "یورپ میں اردو" ص: ۵۰

۳۳۔ "یورپ میں تحقیقی مطالعے" ص: ۱۹

۳۴۔ ایضاً ص: ۱۹

۳۵۔ "اردو زبان اور اردو ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" ص: ۱۲

۳۶۔ "یورپ میں اردو" ص: ۱۴۱ - ۱۴۰

۳۷۔ "اردو زبان اور اردو ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" ص: ۱۹ - ۱۸

۳۸۔ "اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب" ص: ۹

۳۹۔ ایضاً ص: ۱۰ - ۹

۴۰۔ "نمونۂ منشورات" (ص ۵۸) میں یہ تاریخ وفات درج ہے ۱۵/۱۲/۱۱۲۸ھ

۴۱۔ ایضاً ص: ۱۲ - ۱۱

۴۲۔ "یورپ میں اردو" ص: ۱۴۰

۴۳۔ پروفیسر ثریا حسین "گارسیں دتاسی اردو خدمات علمی کارنامے" ص: ۱۱۹

۴۴۔ کمپنی کے سیاسی عزائم، استحصال اور اقتصادی چیرہ دستیوں کے لیے ملاحظہ ہو باری علیگ کی کتاب "کمپنی کی حکومت"

۴۵۔ عطش درانی "اردو زبان اور یورپی اہلِ قلم" ص: ۲۳ - ۲۲

۴۶۔ ایضاً ص: ۲۴ - ۲۳

۴۷۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" ص: ۸۷

۴۸۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" ص: ۵۵

۴۹۔ ایضاً ص: ۵۳

۵۰۔ "افکار" برطانیہ میں اردو ایڈیشن ۱۹۸۱ء

۵۱۔ یہ معلومات "افکار" کے برطانیہ میں اردو ایڈیشن میں مطبوعہ مقالہ "بنگال کے انگریز مصنفین" از شانتی رنجن بھٹاچاریہ سے ماخوذ ہیں۔ آغا افتخار حسین کا مقالہ بھی اسی ایڈیشن میں شامل ہے۔

۵۲۔ ایضاً

۵۳۔ "افکار" برطانیہ میں اردو ایڈیشن

۵۴۔ بقول سید احمد دہلوی۔ " . . . . . کبھی فیلن جیسے لغت نگاروں کے اسسٹنٹ ڈکشنری رہے۔"
(مقدمہ "فرہنگ آصفیہ")

۵۵۔ جابر علی سید، "کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ" ص: ۱۴

۵۶۔ "کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ" ص: ۱۳

۵۷۔ وٹ ورتھ کی ANGLO - INDIAN ڈکشنری میں جابسن جابسن کے الفاظ نہ ملے۔

۷۔ اُردو میں قواعد نگاری

جس طرح ہندوستانی ڈکشنری کی تدوین کے ضمن میں ابتدائی کام یورپین نے کیا۔ ایسا کام کہ ان میں سے بعض ڈکشنریاں تو ہمارے لیے اب بھی کارآمد ثابت ہو رہی ہیں۔ اسی طرح اردو قواعد نگاری میں بھی اولین اور بعض امور کے لحاظ سے تو اساسی کام اہلِ مغرب ہی نے کیا۔ وجہ وہی، زبان آموزی کے آلات کی تیاری۔ یہ عجب بات ہے کہ عربی، فارسی اور سنسکرت میں صرف و نحو کی روایت کے باوجود اردو زبان کی کبھی بھی کوئی قواعد نہ لکھی گئی۔ ادھر انگریزی میں یونانی اور لاطینی اثرات کے تحت گرامریں لکھی جاتی رہی تھیں۔ جو نصاب کا حصہ ہوتی تھیں۔ اسی لیے گل کرسٹ نے جب ہندوستانی سیکھنے کا ارادہ کرتے ہوئے مقامی لوگوں سے استفسار کیا تو سب نے حیران ہو کر پوچھا کہ زبان سیکھنے کے لیے اہلِ زبان کو قواعد کی کیا ضرورت؟ اس جواب سے گل کرسٹ کس قدر متعجب ہوا ہوگا۔ اس کا اندازہ لگانا بھی دشوار نہیں۔ ادھر اہلِ زبان کی حیرت بھی بجا۔ اہلِ زبان تو خود زبان، روزمرہ، محاورہ اور تذکیر و تانیث میں سند کا درجہ رکھتے تھے:

مستند ہے میرا فرمایا ہوا

ابھی تک فارسی شاملِ نصاب تھی۔ علمی اور ادبی موضوعات پر کتابیں بالعموم فارسی میں لکھی جاتی تھیں اردو نثر برائے نام تھی۔ رہی اردو، تو اہلِ زبان کی بول چال درست ہوتی تھی، زبان والدہ سے سیکھتے، آدابِ محفل طوائف سے اور شاعری استاد سے۔ اس لیے اگر اس زمانے تک کسی کو اردو قواعد لکھنے کا خیال نہ آیا تو یہ باعثِ تعجب نہ ہونا چاہیئے کہ انہیں تو سرے سے قواعد کی ضرورت ہی نہ تھی۔ یہ تھے وہ حالات جن میں گل کرسٹ نے اردو قواعد لکھنے کا بیڑہ اٹھایا لیکن

اس کا یہ مطلب نہیں کہ سب سے پہلی قواعد اس کے قلم سے نکلی تھی۔ ایسا نہیں، جس طرح لغت نویسی میں پرتگال، ہالینڈ اور فرانس کے باشندوں نے انگریزوں پہ سبقت حاصل کی اسی طرح انگریزوں سے کوئی دو صدی قبل ہالینڈ والے قواعد نویسی کا آغاز کر چکے تھے۔

پہلی قواعد

مولوی عبدالحق سے محمد عتیق صدیقی تک سبھی محققین متفق ہیں کہ ہالینڈ کا جان جوشوا کیٹلر سب سے پہلی قواعد کا مؤلف ہے۔ مگر تازہ تحقیقات کے مطابق یہ کام کیٹلر سے کوئی ایک صدی پہلے کیا جا چکا تھا۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، بنجمن شلزے کی "ہندوستانی گرامر" کے مقدمہ میں لکھتے ہیں" سولہویں صدی کے ان مصنفین میں ایک نام جیرونیموز زوائر (JERONIMO XAVIER) کا ہے جو حضرت عیسٰی کے حواریوں "COMPANION OF JESUS" کی تنظیم سے متعلق تھا اور جہانگیر کے دربار میں بھی پیش ہوا تھا۔ اس کا قیام آگرہ میں تھا۔ جہاں وہ ۱۵۸۶ء اور ۱۶۱۵ء کے درمیان موجود تھا۔ اس نے ہندوستانی فارسی لغت کا ایک مجموعہ مرتب کیا (یہ لغت اب دستیاب ہو گئی ہے اور زیر ترتیب و تدوین ہے، حاشیہ مصنف) یہ ان کتابوں میں شامل ہے جو ۱۵۹۹ء سے قبل کی تصنیف ہیں۔ اس کا پورا نام یہ ہے: "VOCABULARIUM PORTUGALICO HINDUSTANO PERSICUM" اس اعتبار سے اس کا شمار اردو کی قدیم ترین لغت اور قواعد اردو میں ہوتا ہے۔ ۱۶۰۰ عیسوی اور ۱۶۹۹ عیسوی کے درمیان مختلف مشنریوں نے بنگال کنڑی، کونکنی، مالاباری، سنسکرت، تامل اور سنگالی (سہالی) زبان میں مختلف رسالے لکھے اس دور کا اردو کا ایک مشنری مصنف انیٹونیو ڈی سلوا (ANTONIO DE SALDHANA) تھا۔ اس کی وفات ۱۶۶۳ء میں ہوئی۔ اس نے دعاؤں کا ایک مجموعہ "ROSAS" کے نام سے ہندوستانی زبان میں لکھا اور کونکنی کے لغات کا ایک رسالہ بھی مرتب کیا۔ اس کی ولادت باری (BARI) میں ۱۶۱۵ء میں ہوئی اور یہ جماعت عیسوی (SOCIETY OF JESUS)

میں ۱۶۳۱ء میں شامل ہوا۔ اس کی وفات ۲۰ اپریل ۱۶۸۳ء کو ہوئی۔ اس نے کونکنی اور دکھنی یعنی اردوئے قدیم کا ایک لغت لکھا جس میں لاطینی مترادفات بھی درج کیے۔ اس کے رسالے میں قواعد بھی ہے اور لاطینی کونکنی لغت کے علاوہ ایک پوری فصل دکھنی اور کونکنی بولیوں کی خصوصیات پر لکھی گئی ہے۔ اٹھارویں صدی کی ایک اور مشنری شخصیت فادر کاسیانو ماسہراتا ہے۔ (FR. CASSIANO DE MACERATA) ان کی ولادت ۱۷۰۸ء میں ماسہراتا میں ہوئی تھی۔ ۱۷۳۸ء میں انہوں نے تبلیغ کے لیے تبت کا سفر کیا۔ ۱۷۴۰ء میں اٹلی کو واپسی ہوئی۔ تبت کا دوسرا سفر ۱۷۵۹ء میں کیا اور ۱۷۸۵ء میں ان کی وفات ہوئی انہوں نے ہندوستانی زبان کی ایک قواعد "GRAMMATICA HINDUSTANIA" کے نام سے لکھی۔ اس کا سنہ تالیف بعض حوالوں سے ۱۷۵۶ء ہے۔ اور اس کا قلمی نسخہ موجود ہے۔[۲]

قواعد اور اس کے ساتھ ساتھ لغت کے سلسلے میں آغاز کار ہالینڈ اور پرتگال کے باشندوں نے کیا اور عہد جہانگیری سے اس کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ ظاہر ہے قواعد نویسی کا مقصد اپنے ہموطنوں کے لیے ہندوستانی سیکھنے کی سہولت پیدا کرنا تھا۔ بالفاظ دیگر یہ سب کچھ پہلے تجارتی اغراض کے لیے اور پھر حالات سازگار ہونے کی صورت میں انگریزوں کی مانند سیاسی مقاصد کے لیے تھا لیکن اردو زبان کے لیے اس کے ضمنی فوائد یہ ہوئے کہ اسی بہانے قواعد کی کتب مدون ہوگئیں۔

ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے جن اولین کتب کی نشاندہی کی یہ سب مخطوطات کی صورت میں ہیں۔ ہم کیونکہ صرف انگریزی جانتے ہیں اس لیے ہمارے محققین، ناقدین اور ماہرین لسانیات ہمیشہ برٹش میوزیم کا رخ کرتے ہیں اور وہاں سے بہت کچھ حاصل بھی کیا۔ ضرورت اب اس امر کی ہے کہ فرانس، جرمنی، اٹلی، ہالینڈ اور پرتگال وغیرہ کی لائبریریوں کو بھی کھنگالا جائے اور زبان وادب کے بارے میں وہاں محفوظ مخطوطات کو منظر عام پہ لانا چاہیئے۔ آغا افتخار حسین نے اس انداز کا مفید کام کیا ہے یورپی زبانیں جاننے والے حضرات بھی تھوڑے وقت کی قربانی دے

کر اس نوع کا قیمتی مواد تلاش کر سکتے ہیں۔ اردو زبان کی یہ بہت بڑی خدمت ہوگی۔ اس سلسلے میں ہمارے سفارت خانے بھی مددگار ثابت ہو سکتے ہیں اور مقامی سکالرز ٹرینیڈ ری سرچیہ یا ریفرنسز سے بآسانی کام لیا جا سکتا ہے۔ لیکن المیہ یہ ہے کہ حکومت کے لیے ان باتوں کی اہمیت نہیں۔ رہے ہمارے سفارت خانے تو ان کی زریں کارگزاریوں پر ہر وہ پاکستانی رطب اللسان ہے جسے اس کی بدقسمتی کسی کام کے لیے کسی سفارت خانے میں لے گئی ہو۔

ہندوستانی زبان: قواعد کی پہلی کتاب

اردو زبان کی سب سے پہلی قواعد جان جوشوا کیٹیلر (JOHN JOSHWA KETELAER) کی "LINGUA HINDOSTANICA" (1743) تسلیم کی جاتی ہے۔ اسے لاطینی زبان میں سمجھا جاتا رہا ہے لیکن ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے جس مقدمہ کا حوالہ دیا جا چکا ہے۔ اس میں انہوں نے بنجمن شلزے کے حوالے سے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے۔ "یہ لاطینی میں نہیں ڈچ میں تھی۔" تاہم عام طور پر اسے لاطینی ہی میں سمجھا جاتا رہا ہے۔ حتیٰ کہ تازہ ترین تالیف کتابیات قواعد اردو" (۱۹۸۵ء) میں بھی اسے لاطینی کتابوں میں درج کیا گیا ہے۔ (ص: ۸۷) دلچسپ بات یہ ہے کہ خود ایک زمانے تک ڈاکٹر ابواللیث صدیقی بھی یہی سمجھتے رہے ہیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنی "جامع القواعد" (حصہ صرف لاہور ۱۹۷۱ء) میں یہی کچھ لکھا ہے۔ (ص: ۱۵۴)

جہاں تک اس کے لاطینی یا ڈچ میں ہونے کا تعلق ہے، تو آغا افتخار حسین کے اس بیان سے اس کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ کہ "اس کتاب کا اصل مسودہ ولندیزی زبان میں ہے اور ابھی تک ہیگ (HAGUE) کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ اس کا ترجمہ ڈیوڈ مل نے کیا اور اپنی کتاب "MISCELLANEA ORIENTALIA" میں شامل کر کے ۱۷۴۵ء میں شائع کیا کیٹلیر کی کتاب اس ترجمہ کے ذریعے منظر عام پر آئی۔"[۳]

گویا اصل مسودہ ڈچ زبان میں تھا اور مطبوعہ ترجمہ لاطینی میں۔

کیٹلر کے بارے میں مختلف ذرائع سے جو معلومات حاصل ہوئیں، ان کے بموجب یہ پرشیا کے شہر ELBING میں ۱۶۵۹ء میں پیدا ہوا۔ عقیدے کی رو سے پروٹسٹنٹ تھا، ڈنمارک کے دربار سے وابستہ تھا اور آج کی اصطلاح میں اسے کیریئر ڈپلومیٹ کہا جا سکتا ہے۔ اس ضمن میں بنجمن شلزے کی ہندوستانی گرامر کی پیش لفظ سے کیٹلر کے بارے میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ "ڈنمارک کی ایسٹ انڈیا کمپنی کے مغل اعظم کے دربار میں سابق سفیر تھے۔ جس زمانے میں وہ آگرہ میں مقیم تھے، انہوں نے ہندوستانی زبان کے باب میں اپنے مشاہدات ڈچ زبان میں قلمبند کیے۔ یقیناً انہیں یہ امتیاز حاصل ہے کہ انہوں نے اس زبان کو مشرقی زبانوں کے ماہر مستشرقین سے متعارف کروایا اور ان کی توجہ کا مرکز بنایا اور اس طرح ایک مبسوط رسالے کی تالیف کے لیے راہ ہموار کر دی جسے اب میں نے اضافہ کر کے مرتب کیا ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ وہی فاضل مصنف ہندوستانی الفاظ کو فارسی رسم الخط میں بھی تحریر کر گئے ہوتے اور کچھ امور اس تلفظ کے باب میں لکھ گئے ہوتے۔" (ص: ۴۰)

سفارتی ذمہ داری کے بعد کیٹلر کو ۱۷۱۲ء میں ڈچ ایسٹ انڈیا کمپنی کے تجارتی امور کا نگران (ڈائریکٹر) بنا دیا گیا۔ اسی حیثیت میں اس نے تین برس کام کیا۔ سفارتی اور تجارتی امور کے ضمن میں اسے ہندوستان کے کئی علاقے دیکھنے کا موقع ملا چنانچہ وہ لاہور تک آ چکا تھا۔ جبکہ مغل دربار سے تعلق کے دوران وہ دہلی اور آگرہ میں رہ چکا تھا۔ غالباً اہلِ زبان سے روابط کی بنا پر ہی اس نے اردو زبان سیکھی ہوگی۔ مولوی عبدالحق کی بموجب ہندوستانی قواعد اس نے ۱۷۱۵ء میں سورت میں تالیف کی۔ اس کی قواعد سے نصف صدی پیشتر بھی اس نوع کا کام ملتا ہے لیکن مخطوطات کی صورت میں۔ جبکہ کیٹلر کی قواعد طبع ہو چکی ہے۔ بنجمن شلزے کے بقول یوٹریکٹ (UTRACT) میں السنہ شرقیہ کی متبرک تحقیقات کے پروفیسر ڈیوڈ ملینو (DAVID MILLINO) نے اپنے متفرقات بابت ۱۷۴۳ء میں اسے شائع کرایا تھا۔[۵] اس کا انتقال ۱۷۱۸ء میں ایران میں ہوا۔ جہاں اسے سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا اگرچہ

گریرسن کے حوالے سے اس کی موت کا سبب بخار بتایا جاتا ہے۔ لیکن آغا افتخار حسین کے بموجب
۱۷۱۶ء میں اسے ایران کا سفیر بنا کر بھیجا گیا تھا اور جب ۳ برس کی ملازمت کے بعد اصفہان سے
واپس آ رہا تھا تو راستے میں ایرانی گورنر نے اس سے خواہش کی کہ وہ ولندیزی جہاز کو بعض عرب
حملہ آوروں کے مقابلے میں اس کے ساتھ ہو کر لڑنے کی اجازت دے۔ کٹیلر نے اس سے
انکار کیا۔ اس پر ایرانی حاکم نے اسے قید کر لیا۔ قید میں اس نے دو ہی روز گزارے تھے کہ
اس کا انتقال ہو گیا۔[6] وجہ بخار بتائی گئی۔ لیکن یہ قیاس شاید مبالغہ آمیز نہ ہو کہ کٹیلر کی موت
بخار سے نہیں بلکہ زہر خورانی سے ہوئی ہو گی کہ سیاسی قتل کا یہ آسان اور محفوظ ترین طریقہ سمجھا
جاتا ہے۔

ہندوستانی گرامر: قواعد کی دوسری کتاب

کٹیلر کی اردو کی پہلی قواعد کی اشاعت کے صرف ایک سال بعد جرمن مشنری بنجمن شلز نے
(BEN JAMIN SCHULTS) یا SCHULZINO نے قواعد کی دوسری کتاب
تالیف کی۔ ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے اس کا ترجمہ کر کے تحقیقی مقدمہ اور حواشی کے ساتھ شائع کرا
دیا ہے۔ کٹیلر کے برعکس بنجمن شلز ے مشنری تھا۔ ڈنمارک کے بادشاہ نے اسے کرناٹک کے دربار
میں بھیجا تھا۔ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے مدراس میں مشن کی بنیاد اسی نے رکھی تھی۔ ۳۰ جون ۱۷۴۱ء
کو قواعد پر لکھے گئے پیش لفظ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس قواعد کی تالیف سے ۱۲ سال قبل یعنی
۱۷۲۹ء میں وہ تلگو زبان (جس کا ایک نام وہ وردگی بتاتا ہے) کے مبادیات پر ایک مختصر رسالہ
قلمبند کر چکا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ ہندوستان کی زبانوں پر تحقیق کر رہا تھا۔
شلز ے اول سے آخر تک مشنری ہے۔ چنانچہ تلگو پر ابتدائی کام یا ہندوستانی گرامر کی تالیف خالص
مذہبی جذبے کے تحت تھی۔ وہ سمجھتا ہے کہ (مغل اعظم) کی سلطنت میں بولی جانے والی یہ ایک
مقبول زبان ہے۔ اس لیے مقامی آبادی سے گفتگو اور تبلیغ کے لیے اس کا جاننا ضروری ہے۔ اس

عہد کے عام مشنریوں کی مانند وہ خاصا متعصب معلوم ہوتا ہے اور اس میں مذہبی رواداری نام کو بھی نہیں۔ وہ یہاں کے ہندوؤں اور مسلمانوں کو "PAGAN" (کافر) قرار دیتے ہوئے ان کے لیے راہِ نجات مسیحت میں دیکھتا ہے۔ (ص: ۴۰) یہ ہے تو گرامر کی کتاب لیکن ایک مشنری کی نفسیات کے مطالعے کے نقطۂ نظر سے اس میں خاصا مواد مل جاتا ہے۔ قواعد کے نکات سمجھانے کے لیے مسیحت کی مثالیں پیش کرتا ہے۔ قارئین کی دلچسپی کے لیے چند مثالیں پیش ہیں۔

"جنت ڈھونڈنے کے واسطے اللہ ہمنا نوں عقل دیلے۔ اے نادانوں کو

انجیل کون فرمائے" (ص: ۱۲۹)

اسی طرح ضمیمہ میں مسیحی دعائیں اور "TEN COMMANDMENTS" کا ترجمہ دیا گیا ہے۔

(ص ۱۳۰۔ ۱۴۴) اسم نکرہ کی مثالیں عہد نامہ عتیق، عہد نامہ جدید کے اسما میں سے ہیں۔ (ص ۱۴۴)

اور یہ فقرہ تو یقیناً پر خشونت پادری کی سوچ کی عکاسی کرتا ہے:

"حرامی عاجزی کیے تو بھی خاوند اُوسے قبول کرتے نہیں۔" (ص: ۱۱۲)

بنجمن شلزے جنوبی ہند میں کرناٹک اور مدراس میں قیام پذیر رہا۔ اس لیے اس نے دکھنی زبان لکھی ہے۔ واضح رہے کہ اٹھارویں صدی کے وسط تک دکھن میں زبان اور ادب خاصی ترقی کر چکے تھے۔ نثر میں ملا وجہی کی سب رس (۱۶۳۵ء) لکھی جا چکی تھی۔ دکھنی ادب کی بعض اہم مثنویاں نظم بند کی جا چکی تھیں، جیسے ابن نشاطی کی پھول بن، غواصی کی طوطی نامہ اور سیف الملوک، نصرتی کی گلشنِ عشق اور ہاشمی کی یوسف زلیخا۔ جبکہ ولی جیسا شاعر دہلی میں غزل کی شمع فروزاں کرنے کے بعد وفات (۱۷۲۵ء) پا چکا تھا۔ الغرض جس زمانے میں شلزے دکن میں تھا، وہ دکنی ادب کے عروج کا زمانہ تھا لیکن مشنری ہونے کی بنا پر اسے کافروں کے ادب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اسی لیے اس کی گرامر میں اشعار یا تخلیقی نثر کی مثالیں نہیں ملتیں۔ تاہم اس گرامر کا ایک فائدہ یہ ہے کہ بطور مثال دیئے گئے الفاظ اور فقرات کی صورت میں اس زمانے کی عام بول چال کی زبان کے متعدد الفاظ قدیم املا میں مل جاتے ہیں۔ ایک اور اضافی خوبی مسیحی دعاؤں کے تراجم ہیں۔ ایسے تراجم جنھیں اردو میں

ترجمہ کی غالباً اولین مثال قرار دیا جا سکتا ہے۔ جہاں تک اس کے لسانی مطالعہ کا تعلق ہے تو ڈاکٹر ابواللیث صدیقی نے مقدمہ اور تعلیقات میں اچھا تجزیہ کیا ہے۔ یہ کتاب مدراس میں لکھی گئی تھی۔ مگر لاطینی سے انگریزی ترجمہ کرنے کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم حتیٰ کہ مترجم کا نام بھی نہیں معلوم ۱۷۴۵ء، ادریں بمقام حال سیکسنی طبع کی گئی۔ انگریزی ترجمہ کا مکمل نام یوں ہے۔

"A GRAMMER OF TE HINDOOSTAN LANGUAGE" جبکہ لاطینی نام یہ ہے۔

"GRAMMATICA INDOSTANICA"

انگریز قواعد نویس

اٹھارویں صدی کی چوتھی دہائی میں لکھی جانے والی قواعد کی ان کتابوں کے بعد یورپین اقوام کے اہل علم ہندوستانی قواعد سے دلچسپی ظاہر کرتے رہے اور ان کی تحریر کردہ قواعد کی کتابوں کے حوالے گریرسن وغیرہ کے ہاں مل جاتے ہیں۔ ان سے صرف نظر کرتے ہوئے ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز ملازمین کی تحریر کردہ کتب قواعد کا جائزہ لینے پر اندازہ ہو جاتا ہے کہ اس معاملے میں انگریز کوئی بہت زیادہ پیچھے نہیں رہے۔ محمد عتیق صدیقی نے اس ضمن میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ایک سول ملازم گلشن کے رسالہ قواعد کا ذکر کیا ہے جو گورنر ونسی ٹارٹ (VANSITTART) کا سیکرٹری اور فارسی مترجم تھا۔ اور ایک فساد کے دوران ہلاک ہو گیا۔ "ہندوستانی زبان کے قواعد پر اس نے انگریزی میں ایک مبسوط مقالہ لکھا تھا۔" بقول محمد عتیق صدیقی "اس نے اس میدان میں پہل کی تھی۔" اگرچہ نہ اس کے لکھنے کی تاریخ معلوم ہے اور نہ ہی یہ کبھی طبع ہوا۔ البتہ گل کرسٹ نے اس مقالے کی بے حد تعریف کی۔"

برطانوی مستشرقین کا باوا آدم

ڈاکٹر رضیہ نور محمد نے ہیڈلے کو "برطانوی مستشرقین کا باوا آدم" قرار دیتے ہوئے اس رائے کا

اظہار کیا۔" اس نے سنجیدہ علمی تحقیق کی جو داغ بیل ڈالی وہ آئندہ آنے والوں کے لیے راہنمائی کا باعث ہوئی۔ قدما میں بھی اس کی اہمیت مسلّم ہے۔ اور قواعد نویسی کی تاریخ لکھی جائے گی تو اس میں کٹیلر اور شلز کے بعد ہیڈلے کا ذکر ناگزیر ہوگا۔"[9]

مختلف ذرائع سے ہیڈلے کے بارے میں جو معلومات حاصل ہوئیں ان کے مطابق یہ ۱۷۶۳ء میں بنگال میں فوج سے منسلک ہوا۔ ۱۷۶۶ء میں کیپٹن بنا دیا گیا۔ ۲ نومبر ۱۷۷۱ء کو ملازمت سے فارغ ہونے کے لیے درخواست کی اور انگلینڈ آ گیا۔ ہیڈلے اور اس کے ماتحت سپاہیوں نے ہندوستانی سے عدم واقفیت کی بنا پر خاصی دقت محسوس کی ہوگی۔ چنانچہ خود آموزی کے لیے اس نے ایک قواعد مرتب کر لی اور پھر ۱۷۶۵ء میں سپاہیوں کے لیے قواعد تیار کر لی جو ۱۷۷۰ء میں لندن سے طبع ہوا۔ دو سال بعد نظر ثانی شدہ ایڈیشن طبع ہوا۔ اس کے بعد ۱۷۷۴ء، ۱۷۷۹ء، ۱۷۹۴ء، ۱۷۹۷ء، ۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۹ء تک اس کے ایڈیشن چھپتے رہے۔ یقیناً یہ اس عہد کی بیسٹ سیلر قواعد تھی۔ میرے خیال میں اتنی زیادہ مقبولیت کی یہی وجہ ہو سکتی ہے کہ اس نے ہندوستانی سیکھنے والے انگریزوں کے لیے نصابی حیثیت اختیار کر لی ہوگی۔ لندن سے بار بار چھپنے کا بھی یہی باعث ہے کہ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ملازمت اختیار کرنے والے انگریز زباندانی کے لیے اس سے استفادہ کرتے ہوں گے۔ کتاب کا مکمل نام یہ ہے: "A COMPANDIOUS GRAMMER OF THE CURRENT CURRUPT DIALECT OF JORON OF HINDUSTAN"

۱۸۰۲ء اور ۱۸۰۹ء کے ایڈیشن ہیڈلے کی وفات کے بعد چھپے تھے۔ مرزا محمد فطرت لکھنوی نے ۱۸۰۲ء والے ایڈیشن میں اضافے اور تصحیح بھی کی تھی۔ چنانچہ اس ایڈیشن کے سرورق پر ہیڈلے کے ساتھ فطرت لکھنوی کا نام بھی درج ہے۔

قواعد کے اردو الفاظ فارسی رسم الخط میں درج کیے گئے ہیں۔ اگرچہ بعد میں آنے والے مصنفین نے اس قواعد پر کچھ اعتراضات بھی کیے۔ ظاہر ہے کہ اس نوع کے ابتدائی کام میں کچھ نہ کچھ اغلاط تو رہ جاتی ہیں۔ تاہم انگریزی زبان کی پہلی باضابطہ قواعد ہونے کی بنا پر یہ تاریخی اہمیت کی حامل

رہے گی۔

گلکرسٹ کی قواعد

لغت کے ضمن میں ڈاکٹر گل کرسٹ کے بارے میں لکھا جا چکا ہے۔ یہاں اس کی قواعد کا ذکر مطلوب ہے۔ جو پہلی مرتبہ کلکتہ سے ۸ رمئی ۱۷۹۶ء اور دوسری مرتبہ ۱۸۰۹ء میں طبع ہوئی۔ پہلے ایڈیشن کے دو برس بعد اس نے اپنی لغت اور قواعد کا ضمیمہ (THE APPENDEX) بھی کلکتہ سے طبع کروایا۔ گلکرسٹ کی قواعد انگریزی زبان میں لکھی گئی تھی۔ کتاب کے سرورق کی نقل پیش ہے جس سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ گلکرسٹ نے ہندوستانی لسانیات پر تین جلدوں میں کام کرنے کا منصوبہ بنا رکھا تھا۔ (پہلا حصہ لغت، دوسرا حصہ لغت و قواعد کا ضمیمہ اور تیسرا یہ قواعد)

A

GRAMMER

OF THE

HINDUSTANEE LANGUAGE

OF PART THIRD

OF

VOLUME FIRST

OF A SYSTEM OF

HINDUSTANE LANGUAGE

BY JOHN GILCHRIST

اب سامنے میرے جو کوئی پیر و جواں ہے
دعویٰ نہ کرے یہ کہ میرے منہ میں زباں ہے
میں حضرت سودا کو سنا بولتے یارو
اللہ ہی اللہ کیا نظم و بیاں ہے

ہر جا کہ سہو و خطائے واقعہ شود و بہ ذیل کرم
بپوشند و قلم اصلاح بہ آں جاری دارند[11]

CALCUTTA

PRINTED AT THE CHRONICAL PRESS MDCCXCVI

گلکرسٹ کی ہندوستانی زبان کی قواعد خاصی ضخیم تھی اور طلباء کو اس سے استفادہ میں دقت ہوتی تھی۔ اس لیے بہادر علی حسینی نے اس کی تلخیص کر کے اسے رسالہ گلکرسٹ کا نام دیا۔ اگرچہ بالعموم اس کا سال اشاعت ۱۸۱۶ء (کلکتہ) بتایا جاتا ہے۔ مگر خلیل الرحمٰن داؤدی نے کتاب کا جو سرورق شائع کیا ہے اس پہ (۱۸۲۰ء) کلکتہ درج ہے۔ انہوں نے اسے پہلا ایڈیشن قرار دیا ہے[12]۔
شاملِ نصاب ہونے کی بناء پہ یہ متعدد مرتبہ طبع ہوئی ۱۸۳۱ء، ۱۸۴۶ء اور ۱۸۶۴ء میں کلکتہ سے جبکہ ۱۸۴۵ء میں آگرہ سے۔

شلزے کی قواعد کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ امر بطور خاص اجاگر کیا گیا تھا کہ اگرچہ اس کے قیام کے وقت دکنی ادب کی جملہ اصناف میں اہم تخلیقات معرضِ وجود میں آ چکی تھیں لیکن اس نے نثری ادب یا شاعری سے مثالیں دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔ شاید اس لیے کہ وہ مشنری تھا اور اسے ہیگن لٹریچر سے کسی طرح کی دلچسپی نہ ہوگی۔ اس کے برعکس گلکرسٹ کی قواعد ایک صاحبِ ذوق اور شعر و ادب کے دلدادہ شخص کی تحریر معلوم ہوتی ہے اور کیوں نہ ہو کہ زبان سیکھنے کے لیے اس نے فیض آباد کے دوران قیام ہندوستان وضع اپنا کر داڑھی بھی رکھ لی تھی۔ زبان سیکھنے میں اسے جن دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا اس نے ان کا بیان کیا ہے۔ لیکن یہ بھی لکھا ہے کہ صحیح معنوں میں زبان کلیاتِ سودا سے سیکھی تھی۔ یہ معنی خیز امر گلکرسٹ کے شعری ذوق کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے ایک غیر ملکی کے لیے سہل اسلوب کی بناء پہ میر کی شاعری مرغوب خاطر ہونی چاہیئے تھی لیکن گلکرسٹ میر کے مقابلے میں نسبتاً مشکل شاعر سودا کو پسند کرتا ہے۔ اس کا ایک باعث سودا کا

شاعرانہ لہجہ بھی ہو سکتا ہے۔ جس میں ایک خاص قسم کا جلال اور اسلوب میں شکوہِ لفظی ہے۔ اگر یہ محض شعری ذوق کا مسئلہ نہ تھا تو پھر سیدھی سی بات یہ ہوگی کہ میر کے مقابلے میں سودا کی غزل میں ذخیرۂ الفاظ نسبتاً زیادہ ہے۔ اور زبان سیکھنے والے غیر ملکی کو اس کی غزل سے زیادہ الفاظ مل سکتے ہیں۔ گلکرسٹ کو سودا سے جو عقیدت تھی اس کا اظہار گرامر کے سرورق سے بھی ہو جاتا ہے۔ وجہ کچھ ہی کیوں نہ ہو۔ لیکن اتنا طے ہے کہ سودا گلکرسٹ کا پسندیدہ شاعر تھا اور یہ شعری ذوق ہی ہے جس کی بناء پہ عام انگریزوں کی قواعدوں کے مقابلے میں گلکرسٹ کی قواعد نمایاں تر ہو جاتی ہے کہ اس نے قدم قدم پہ اشعار کی مثالیں پیش کی ہیں اور شعراء بھی کیسے کیسے۔ ولی، آبرو، یقین، حاتم، قائم۔ متقدمین میں سے جبکہ متاخرین میں سے اس کے معنوی استاد سودا کے ساتھ ساتھ درد، سوز اور میر حسن کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ ان پہ مستزاد ۱۸ بندوں پہ مشتمل عبداللہ مسکین کا مکمل مرثیہ جو مختلف مثالوں کی صورت میں نقل ہو گیا۔ قواعد کے اختتام پر اردو کے اُن صاحب دیوان شعراء کے اسماء درج ہیں جن کے مطالعے سے انگریز طلبہ اپنی زبان کو بہتر بنا سکتے تھے۔ یہ شعراء ہیں: ولی، سودا، میر، درد، فغاں، آبرو، مظہر جان جاناں، یقین، تاباں، حاتم، سوز، عشق، بیان، حسن، قدرت، ناجی، عیش، مسکین، سکندر، جرأت، حمد، قائم، دردمند، افضل، انجام، جعفر زٹلی، امین، جوشش، ذکی اور بیدار۔ (ص: ۱۴۱) اس کا مطلب یہ ہوا کہ گلکرسٹ ان سب شعراء کے کلام سے واقف تھا اور اسی سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس نے اردو شاعری کا کتنا گہرا مطالعہ کر رکھا تھا اور زبان شناسی کے لیے شاعری کا کتنا قائل تھا۔ ادبی نقطۂ نظر سے اس کتاب کی اضافی خوبی یہ بھی ہے کہ اس میں شیکسپیئر کے دو ڈراموں کے مکالمات کے ہندوستانی میں تراجم بھی درج کیے گئے ہیں۔ الغرض گلکرسٹ کی ہندوستانی زبان کے قواعد اس کے ماہر لسانیات ہونے کے ساتھ ساتھ اردو زبان اور ادب سے دلچسپی کی مظہر بھی ہے۔

اٹھارویں صدی میں قلمبند کی گئی قواعد کی ان کتابوں کی شاید آج اہمیت نہ ہو۔ لیکن اس

زمانے کے لحاظ سے یہ قابلِ قدر ہیں اور ان یورپین اور انگریزوں نے زبان آموزی کے ساتھ ساتھ زبان کی قواعد مرتب کر کے آنے والے اہلِ قلم کے لیے جادہ تراشی کی۔

انیسویں صدی میں یہ کام جاری رہا اور قواعد کی کتابوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہان پوری کی "کتابیات قواعد اردو"۔

"دریائے لطافت"

انیسویں صدی میں یورپین کے ساتھ ساتھ اہلِ زبان نے قواعد نویسی کی طرف رجوع کیا۔ اس ضمن میں اوّلیت انشاء کی "دریائے لطافت" کو حاصل ہے جو ۱۸۰۷ء میں لکھی گئی۔ مگر اشاعت ۱۹۱۶ء میں ممکن ہو سکی۔ جب پنڈت کیفی کا ترجمہ مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ انجمن ترقی اردو (اورنگ آباد) نے طبع کیا۔ اسے بالعموم انشاء سے منسوب کیا جاتا ہے لیکن ایسا نہیں کیونکہ انشاء کے ساتھ قتیل شریک مصنف تھے۔ اسے اردو کی پہلی قواعد سمجھا جاتا ہے۔ لیکن یہ صرف قواعد ہی کی کتاب نہیں بلکہ اس میں اردو زبان کی ماہیت کے ضمن میں لسانی مباحث کے ساتھ ساتھ مختلف بولیوں کا تجزیہ بھی کیا گیا ہے۔ علاوہ ازیں محاورات، علم عروض، شعر کے فنی رموز اور قواعد سے بھی بحث کی گئی ہے۔ یعنی کتاب کا دائرۂ کار خاصہ وسیع ہے۔ اس لیے اسے محض قواعد تک محدود نہ کرتے ہوئے لسانی امور کی پہلی کتاب قرار دینا چاہیئے۔

"آبِ حیات" میں مولانا آزاد نے انشاء کا جو ڈرامہ لکھا اس سے وہ ایک بے فکرا، بانکا، لطیفہ گو، عجیب و غریب شخص اور لوگوں کو اچنبھے میں مبتلا کرنے والا شاعر نظر آتا ہے۔ حالانکہ انشاء میں جتنی صلاحیتیں تھیں اگر وہ زوال پذیر لکھنو کے مردہ دربار سے وابستہ نہ ہوتا اور بہتر حالات میں جنم لیا ہوتا تو اپنی متنوع ذہنی دلچسپیوں کی بنا پہ آج وہ شاعر کے ساتھ ساتھ ماہر لسانیات کے طور پہ بھی مشہور ہوتا۔ جو شخص نصف درجن زبانیں جانتا ہو، "رانی کیتکی کی کہانی" اور "دریائے لطافت" لکھ سکتا ہو وہ محض عامیانہ غزلوں اور ریختی تک محدود ہو کر رہ جائے تو اس پہ سوائے افسوس کے

ادر کیا کیا جا سکتا ہے۔

قواعد: کتابیات

کچھ مقامی اہل قلم کی قواعد کی تفصیل درج ہے۔

احمد علی	قواعد صرف و نحو	دہلی	۱۸۴۵ء
مولوی امانت علی شیدا	صرف اردو	کلکتہ	۱۲۶۲ھ
مولوی محمد علی	مصدر فیوض کا خلاصہ	لاہور	۱۸۸۷ء
	مصدر فیوض	لاہور	۱۸۹۷ء
مولوی نور احمد چشتی	عجائبات چشتی	لاہور	۱۲۷۹ھ
مولوی نور احمد چشتی	تحفہ چشتی	لاہور	۱۸۵۴ء
امام بخش گورداسپوری	مفتاح الصرف کا خلاصہ بطور سوال و جواب	امرتسر	۱۸۹۳ء
پیارے لال	قواعد اردو	لاہور	۱۸۷۹ء
رائے درگاہ پرشاد	زبان القواعد (حصہ اوّل)	لکھنؤ	۱۸۸۳ء
منشی ونی چند	معاون الطلبہ یعنی قواعد اردو کا خلاصہ بطور سوال و جواب	لاہور	۱۸۸۸ء
راجہ شیو پرشاد	اردو صرف و نحو	کانپور	۱۸۷۵ء
امام بخش صہبائی	رسالہ قواعد صرف و نحو اردو	دہلی	۱۸۴۵ء
خواجہ ضیاء الدین	فوائد ضیا بیا	لاہور	۱۸۷۸ء
کریم الدین	قواعد المعدی	آگرہ	۱۸۵۸ء
منشی کنہیا لال	مفید القواعد	لاہور	۱۸۹۳ء
گوجر مل جالندھری	وکیل القواعد	لاہور	۱۸۹۰ء
شیو پرشاد	رسالہ صرف و نحو اردو	لکھنؤ	۱۹۸۱ء

مولوی محمد احسن	قواعد اردو (حصہ چہارم)	الہ آباد ۱۸۸۲ء
محمد حسن خان	منتخب قواعد اردو	مدراس ۱۸۷۳ء
محمد سکندر	منتخب القواعد اردو	مدراس ۱۸۷۴ء
منشی محمد یوسف خان	چار باغ (ترجمہ چار گلزار)	لکھنؤ ۱۸۸۳ء
محمد ابراہیم	تحفتہ النفس	کلکتہ ۱۸۲۷ء
مکھن سنگھ	شمس القواعد	ہوشیار پور ۱۸۹۸ء
منشی مول چند	قواعد اردو	دہلی ۱۸۴۵ء
مرزا نثار علی بیگ اور منشی فیض اللہ خاں۔	رسالہ قواعد اردو (حصہ اول) دکن، حیدرآباد	۱۸۶۰ء
حکیم نجم الغنی رام پوری	قواعد حامدی	بنارس ۱۸۹۶ء
پنڈت نوتن داس	مصباح القواعد	ڈیرہ اسماعیل خان ۱۸۹۸ء
ہیرا لال	موتی قواعد یعنی اردو زبان کی قواعد	لاہور ۱۸۹۲ء
	تکمیل القواعد (حصہ دوم)	کلکتہ ۱۸۹۵ء
	رسالہ صرف و نحو اردو تلخیص جدید (دوسرا حصہ)	لکھنؤ ۱۸۸۱ء
	قواعد اردو	لاہور ۱۸۷۰ء
	مقدمہ قواعد ہندوستانی برائے افادہ طلبہ	مدراس ۱۸۴۲ء

قواعد کی ان کتابوں کے بعض مولفین کے اسماء پر نظر ڈالنے سے فوراً یہ احساس ہوجاتا ہے کہ ان میں سے مولوی نور احمد چشتی، امام بخش صہبائی اور پیارے لال کے علاوہ شاید ہی کوئی اور معروف نام ہو۔ امکان یہ ہے کہ یہ تمام کتابیں درسی ضروریات کے لیے لکھی گئیں اور آج ان کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی کہ ان دنوں چھپنے والی اس نوع کی قواعد کی ہو سکتی ہے۔ ان کی اب محض کتابیاتی اہمیت ہے۔ اور بس، البتہ موجودہ صدی میں بعض محققین اور معروف اہل قلم نے جو کام کیا وہ محض درسی نہیں بلکہ اس کی جداگانہ افادیت بنتی ہے۔

مولوی عبدالحق	اردو قواعد	لکھنؤ ۱۹۱۴ء
مولوی عبدالحق	اردو صرف و نحو	دہلی ۱۹۳۴ء
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	اردو قواعد	کراچی ۱۹۶۹ء
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	جامع القواعد (حصہ صرف)	لاہور ۱۹۷۱ء
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی	ہندوستانی گرامر از بنجمن شولزے	لاہور ۱۹۷۷ء
علی حیدر طباطبائی	تعریف النحو	حیدرآباد ؟
ڈاکٹر غلام مصطفیٰ	جامع القواعد (حصہ نحو)	لاہور ۱۹۷۳ء
اسماعیل میرٹھی	قواعد اردو کی پہلی کتاب	حیدرآباد دکن
اسماعیل میرٹھی	قواعد اردو کی دوسری کتاب	حیدرآباد دکن
آرزو لکھنوی	نظام اردو (طبع دوم)	لکھنو ۱۹۷۹ء
جلال لکھنوی	قواعد المنتخب	لکھنو ۱۹۵۰ء
ڈاکٹر شوکت سبزواری	اردو قواعد	کراچی ۱۹۸۲ء
پنڈت برج موہن دتاتریا کیفی	کیفیہ[۱۴]	دہلی ۱۹۴۲ء
عصمت جاوید	نئی اردو قواعد	دہلی ۱۹۸۱ء
ڈاکٹر اقتدا حسین خان	اردو صرف و نحو	دہلی ۱۹۵۴ء
ڈاکٹر حبیب ضیاء	دکنی زبان کی قواعد	کراچی ۱۹۶۹ء
ڈاکٹر افتخار حسین خان	اردو صرف و نحو	دہلی
نسیم امروہوی	جدید آئینہ اردو	لاہور

مندرجہ بالا کے علاوہ وقار عظیم جیسے نقاد اور قدرت نقوی جیسے محقق نے بھی طلبہ کے لیے قواعد کی کتابیں تالیف کی ہیں۔

حواشی

۱۔ قلمی نسخہ موجودہ کتب خانہ سینٹ لزبوا (ST. LISBOA - BN) : حاشیہ مصنف۔

۲۔ "ہندوستانی گرائمر" ص: ۴، ۳

۳۔ "یورپ میں اردو" (ص: ۱۴۱) :

۴۔ بہ عہد بہادر شاہ اول اور جہاندار شاہ۔ ۱۲ - ۱۷۰۸ء

۵۔ "ہندوستانی گرائمر" ص: ۱۴

۶۔ "یورپ میں اردو" ص: ۱۴۰

۷۔ "گلکرسٹ اور اس کا عہد" ص: ۵۱

۸۔ ایضاً ص: ۵۲

۹۔ "اردو زبان اور ادب میں متشرقین کی علمی خدمات کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ" ص: ۲۷

۱۰۔ "گلکرسٹ اور اس کا عہد" ص: ۵۴

۱۱۔ "قواعد اردو زبان" مرتبہ خلیل الرحمٰن داؤدی ص: ۳۷

۱۲۔ "ایضاً ص: ۵۰

۱۳۔ بحوالہ "کتابیات قواعد اردو" از ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری

۱۴۔ آٹھ ابواب قواعد کے ہیں۔

۸۔ اُردو میں تراجم اور وضع اصطلاحات

مستعار روشنی :

ترجمہ مستعار روشنی ہے زبان جن علوم سے ناآشنا اور جن فنون کے رموز سے ناواقف ہوتی ہے۔ تراجم سے یہ کمی پوری کی جاتی ہے۔ کسی زبان کی بلند پایہ رجحان ساز اور آفاقی اہمیت کی تخلیقات کو اپنی زبان میں اس لیے منتقل کیا جاتا ہے تاکہ مانگے کے اجالے سے اپنا تخلیقی منظرنامہ منور کیا جا سکے۔ ترجمے کو مستعار روشنی یا مانگے کا اُجالا کہنے کا مطلب اس کی اہمیت کو کم کرنا اور اس کی ضرورت سے انکار نہیں۔ صرف اس امر کی طرف توجہ دلانا مقصود تھا کہ ترجمہ خواہ کتنا ہی ضروری اور کامیاب کیوں نہ ہو، اصل زبان کے مقابلے میں ترجمہ کی گئی زبان میں وہ مانگے کا اُجالا ہی رہے گا۔ مختلف اقوام میں لین دین کا جو عمل جاری رہتا ہے۔ اس کی معروف صورت تجارت اور درآمد برآمد ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ بھی اقوام میں لین دین کا ایک اور عمل جاری رہتا ہے جو تہذیبی اور تخلیقی سطح پر ہوتا ہے۔ اگرچہ درآمد و برآمد کی مانند اس کا واضح اور شعوری احساس نہیں ہوتا لیکن یہ بھی اتنا ہی اہم بلکہ بعض امور کے لحاظ سے تو کہیں زیادہ اہم اور دوررس نتائج کا حامل ثابت ہوتا ہے کہ اس تہذیبی لین دین کے سلسلے میں اشیاء اور الفاظ سے لے کر خیالات اور تصورات تک سب کی درآمد اور برآمد ہوتی ہے آج بین الاقوامیت کے باعث اس عمل میں بہت تیزی نظر آتی ہے تراجم نے بلاشبہ اب ایک بین اللسانی فن اور بین الاقوامی ضرورت کی صورت اختیار

کرلی ہے اس کا افادی پہلو اقوام متحدہ میں تقاریر کے فوری تراجم اور مختلف زبانوں میں رپورٹوں
کے تراجم سے واضح ہو جاتا ہے اقوام متحدہ کا مجلہ "پیامی" اور اس کے ساتھ ساتھ "ریڈر
ڈائجسٹ" متعدد زبانوں میں ترجمہ ہوتے ہیں - دنیا کے بڑے بڑے اشاعتی ادارے
بھی مختلف زبانوں کے تراجم طبع کرتے رہتے ہیں جو علمی اور تحقیقی ہر دو نوعیت کے
ہوتے ہیں

یورپ کی مختلف حکومتوں نے بھی تراجم کے مراکز قائم کر رکھے ہیں۔
تراجم انفرادی شوق اور شخصی سعی سے بڑھ کر ٹیکنالوجی کے دور میں داخل ہو چکے ہیں
یعنی کمپیوٹر کے ذریعے سے تراجم کیے جا رہے ہیں - اصطلاحات اور متن کے تراجم کے لیے

CAT: COMPUTER AIDED TRANSLATIONS

پر انحصار میں
اضافہ ہوتا جا رہا ہے یہی نہیں تراجم کے کام میں بین الاقوامی سطح پر رابطہ پیدا کرنے اور معلومات و
کوائف کا تبادلہ کرنے کے لیے انگریزی، فرانسیسی جرمنی اور بعض دیگر زبانوں میں تراجم کے
لیے وقف جرائد بھی شائع ہو رہے ہیں - مزید معلومات کے لیے ملاحظہ ہوں "مغربی ممالک
میں ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز" از عطش درانی (اسلام آباد ۱۹۸۶ء)

لسانی لین دین :

اگرچہ قدیم دور کے مترجمین کو جدید ٹیکنالوجی کی سہولت حاصل نہ تھی، لیکن ذرائع
نقل و حمل کی دشواریوں کے باوجود تہذیبی لین دین کا یہ عمل کسی نہ کسی طور پر جاری رہتا
تھا جس کا دیگر امور کے ساتھ ساتھ لسانی سطح پر بھی مطالعہ کیا جا سکتا ہے - لسانی سطح
پر اس کا مظاہرہ ایک زبان سے مختلف زبانوں کے الفاظ، اصطلاحات اور محاورات کی
صورت میں ملتا ہے اور یہ صرف اردو ہی سے مخصوص نہیں بلکہ دنیا کی تمام بڑی اور ترقی یافتہ
زبانوں میں اس لسانی لین دین کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کبھی زبان کے حروف تہجی کی بنا پر دہ

الفاظ بعینہ رہ جاتے ہیں تو کبھی زبان بولنے والوں کے آلاتِ سماعت اور آلاتِ نطق کی مخصوص نوعیت کی بنا پر آواز و انداز بدل کر کچھ کے کچھ بن جاتے ہیں چنانچہ مفرس، معرّب اور مہند جیسی اصطلاحات اسی کی غماز ہیں اور اشتقاقیات نے لسانی مباحث میں جو اتنی اہمیت حاصل کرلی وہ بھی اسی باعث ہے اور دخیل الفاظ اور غریب الفاظ جیسے مباحث بھی اسے لیے معرضِ وجود میں آئے۔

کیا کوئی یہ اندازہ کرسکتا ہے کہ انگریزی کی معروف صنف ESSAY کا نام فرانسیسی کی بجائے عربی الاصل ہے۔ فرانس کے مونٹین نے جب اپنی تحریروں کو ۱۵۸۰ء میں "ASSAI" کے نام سے شائع کیا تو فرانسیسی زبان میں نئی صنف اور ادبی اصطلاح معرضِ وجود میں آگئی۔ بقول محمد ارشاد دراصل یہ "فرانسیسی زبان کا لفظ نہیں بلکہ عربی زبان کا لفظ ہے، عربی میں سعی کے معنی کوشش اور کوشش کرنا کے ہیں اور السعی کے معنی کرانا کے ہیں یہی "ASSAI" کے بھی بیان کیے جاتے ہیں۔ مونٹین جنوبی فرانس کا رہنے والا تھا اور جنوبی فرانسیسی میں بولی جانے والی بولی۔۔۔۔ میں عربی الفاظ کی بہتات ہے۔ جنوبی فرانس عربوں کی نوآبادی رہ چکا ہے اور محققین نہ صرف وہاں کی زبان پر عربی زبان کے اثرات تسلیم کرتے ہیں بلکہ گستاؤلی بان وہاں کی آبادی کو بھی عربی النسل بتاتا ہے"[1] اسی طرح والٹیر کی تصنیف "ZADIG" دراصل عربی لفظ صدیق ہے[2] اس انداز کی لاتعداد مثالیں عالمی ادبیات سے تلاش کی جاسکتی ہیں:۔

تہذیبی لین دین:

جس طرح لسانی سطح پر الفاظ کا لین دین ہوتا ہے اسی طرح تہذیبی سطح پر خیالات، تصورات، علوم و فنون، دانش و حکمت اور معلومات و کوائف کا لین دین بھی ترجمے کی صورت میں ہوتا رہتا ہے۔ آج ہی سے

نہیں بلکہ صدیوں پہلے سے تراجم ملتے ہیں چنانچہ اہل علم بادشاہوں کے ضمن میں مورخین یہ بھی بتاتے ہیں کہ انہوں نے غیر ملکی زبانوں کے ماہرین کو اپنے دربار میں بلوایا اور ان سے تراجم کرائے وہ خلیفہ بغداد ہوں، اندلس کے حکمران یا ہندوستان کے مغل شہنشاہ۔ سب نے اہم علمی و ادبی کتابوں کے تراجم کرائے۔ چنانچہ آج یونانی لاطینی، عبرانی سنسکرت جیسی زبانوں کے علمی ذخائر جو محفوظ رہ گئے تو اس کا ایک بہت بڑا باعث مسلم بادشاہوں کی علم دوستی اور تراجم سے دلچسپی بھی ہے۔ آج یورپ کے لیے اگر یونانی فلسفہ اور رومن دانش محفوظ رہ گئی تو یہ صرف عربی تراجم کی بدولت ممکن ہوا۔ چنانچہ گستاؤلی بان کے بموجب "قدمائے یونان کی تصانیف کا علم ان کے عربی ترجمے ہی کے ذریعے سے پھیلا تھا۔ ان ہی ترجموں کی بدولت وہ تصانیفِ قدیم ہم تک پہنچی ہیں جن کی اصلیں بالکل تلف ہو گئیں... صرف عربوں کی بدولت نہ کہ ان راہبوں کی وجہ سے جو زبان یونان کا نام بھی نہ جانتے تھے تصانیف قدیم ہم تک پہنچی ہیں اور دنیا کو ان کا ممنون رہنا چاہیئے کہ انہوں نے ذخیرۂ بے بہا کو تلف ہونے سے بچایا۔ موسیو لی بری لکھتے ہیں کہ اگر عربوں کا نام تاریخ میں سے نکال دیا جائے تو یورپ کی علمی نشاۃ الثانیہ کئی صدی تک پیچھے ہٹ جاتی۔"[۳]

گستاؤلی بان جیسے دیگر غیر متعصب محققین جیسے گب، حتی، آربری۔ سب نے اس نوع کی کاوشوں کو کھلے دل سے سراہا ہے۔

ادھر ہندوستان میں اکبر ایسا پہلا مغل بادشاہ ہے جس نے باقاعدہ دارالترجمہ قائم کر کے دیگر زبانوں کے تراجم عربی اور فارسی میں کرائے۔ ملاحظہ ہو ابوالفضل کی "آئین اکبری جلد اول" (ص ۹۲ - ۱۹۱) اور مولانا محمد حسین آزاد کی "دربار اکبری" (ص ۱۸ - ۱۱۵) جس میں ترجمہ شدہ کتب کی تفصیلات درج ہیں:

مغرب ۔ مشرق کے زیر اثر:

یہ تسلیم کہ مغرب نے سائنس اور ٹیکنالوجی کی مدد سے مشرق پر سیاسی تفوق حاصل کیا لیکن جہاں تک تخلیقات کے ذریعے سے ذہنی اثرات قبول کرنے کا تعلق ہے تو حکمت و دانش کی کتب کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب کے تراجم کے ذریعہ سے بھی مغرب نے ذہنی آفاق کو وسعت دینے کی کوشش کی اس میں انہیں کتنی کامیابی ہوئی اور وہ اثرات کتنے گہرے تھے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے یورپ میں مشرق سے دلچسپی نے اورنٹیل ازم ("ORIENTALISM") اور انڈیالوجی ("INDIALOGY") جیسی اصطلاحات جنم دیں اور یہ رجحان عربی فارسی ترکی اور سنسکرت کی معروف کتب کے تراجم کی بنا پر ممکن ہو سکا۔ فرانس میں وکٹر ہیوگو اور والٹیر "مشرقیت" کے حامی تھے جب کہ جرمنی میں تو "مشرقی تحریک" ایک باقاعدہ ادبی رجحان کی صورت میں ملتی ہے۔ جرمنی میں اس کا آغاز گوئٹے سے سمجھا جاتا ہے جو فارسی شاعری اور غزل کے تراجم سے اتنا متاثر ہوا کہ ان کی بنا پر اس نے ایک عالمی ادب ("WELT'- LITERATUR) کا تصور پیش کیا۔ کالی داس کا ڈرامہ "شکنتلا" یورپ کی متعدد زبانوں میں ترجمہ ہو کر خراجِ تحسین حاصل کر چکا ہے۔ فٹز جیرلڈ نے عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ کر کے اہل انگلستان کے لیے گویا دائمی میخانہ مہیا کر دیا ادھر محققین یہ بھی بتاتے ہیں کہ دانتے کی طربیہ خداوندی ("DIVINE COMEDY") ایک ہسپانوی عرب مصنف کی تصنیف "کتاب المعراج" کے لاطینی ترجمہ سے متاثر ہو کر لکھی گئی۔ بوکاچو کی "DECAMERON" پر الف لیلہ کے اثرات نمایاں تر ہیں اور یہ سو کہانیاں ۵۳-۱۳۴۸ء میں لکھی گئیں۔ اسی طرح چاسر بھی الف لیلیٰ سے متاثر تھا اور اس کی "CANTERBURY TALES" پر محققین نے الف لیلیٰ کے اثرات ثابت کیے ہیں بالخصوص اس کی کہانی "PARDNER" پر۔[۴۲]

اُدھر جب فرانس میں گلستانِ سعدی (مترجم: آدم اولیاریوس۔ ۱۶۵۴ء) کے بعد حافظ کے تراجم (ہامر ۱۸۱۲ء) ہوئے تو انہوں نے گوئٹے اور اس کے بعد آنے والے جرمن شعرا کو بطورِ خاص متاثر کیا خود گوئٹے حافظ سے بہت متاثر تھا گوئٹے کے لیے حافظ نے وہی حیثیت اختیار کر لی تھی جو علامہ اقبال کے لیے مولانا رومی نے۔ اس نے اپنے ایک شعری مجموعے کا نام "مشرقی مغربی دیوان" ("WEST - OSTLICHER DIVAN" 1819) رکھا اس کے بعض ابواب کے عنوانات "زلیخا نامہ" "تیمور نامہ" اور "پارسی نامہ" ہیں۔ اس کی ایک نظم کا عنوان "فتویٰ" ہے جب کہ ایک اور نظم "نغمہ محمد" میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے۔

گوئٹے کے بعد پلاٹن نے فارسی غزل کے انداز پر جرمنی میں غزلیں کہیں، چنانچہ اس کا مجموعہ "GHASELEN" ۱۸۲۱ء میں طبع ہوا جب کہ تیسرے مجموعہ کلام کا نام "آئینہ حافظ" ("SPIEGEL DES HAFIZ" 1822) اور پھر اگلے برس "نئی غزلیں" ("NEUE GHASELEN") طبع ہوا۔ پلاٹن نے غزل کو اس کی ہیئت کے مطابق لکھا یعنی قافیہ اور ردیف کے ساتھ اس نے رباعی اور قصیدہ میں بھی طبع آزمائی کی۔

اس کے ساتھ آدکرٹ کا نام لیا جاتا ہے جو حافظ کے ساتھ ساتھ مولانا رومی سے بھی متاثر تھا اس نے بھی غزلیں لکھیں بلکہ اس معاملہ میں تو اسے پلاٹن پر بھی فوقیت حاصل ہے اس نے قافیے کی پیروی کی اور رُباعیاں بھی لکھیں۔[۵]

جرمنی میں مشرقی تحریک تراجم کے ذریعے سے معرضِ وجود میں آئی اس انداز پر دیگر یورپین زبانوں میں بھی مشرقی تخلیقات کے تراجم سے وہاں کی زبان و ادب پر تہذیبی اور لسانی اثرات کے سراغ لگائے جا سکتے ہیں۔ جرمنی یا یورپ کا تذکرہ اس لیے کیا گیا تاکہ یہ واضح ہو سکے کہ تراجم کیسے بین الاقوامی حیثیت اختیار کر سکتے ہیں اور ہماری مانند دیگر اقوام بھی تراجم سے تخلیقی آفاق میں وسعت پیدا کرتی رہی ہیں۔

"ایں ہمہ مضامینِ فارسی.....!

اُردو کے نقطہ نظر سے دیکھیں تو یہاں بھی تراجم اہم ترین کردار ادا کرتے نظر آتے ہیں تام ترقی کے باوجود فارسی زبان اور اربابِ اہلِ اُردو کے لیے مثالی نمونہ تھے۔ اس لیے اہلِ قلم کسی نہ کسی طور پر تراجم سے اُردو کا دامن مالا مال کرنے کی سعی کرتے رہتے تھے۔ جہاں تک لسانی محققین کی تحقیقات کا تعلق ہے تو دکن کے صوفی حضرت میراں صاحب یا شاہ میراں جی خدانما (وفات ۱۰۷۰ھ/۱۶۵۹ء) کے ابوالفضائل عبداللہ بن محمد عین القضاۃ ہمدانی کی عربی تالیف "تمہیدات ہمدانی" کے اُردو ترجمہ کو ترجمے کی اوّلین مثال تسلیم کیا جاتا ہے[۴] احسن مارہروی نے اسے "شرحِ تمہید ہمدانی" یا "شرحِ شرح تمہید" لکھا ہے۔ نمونہ عبارت پیش ہے:

"خواب میں پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم قاضی عین القضات کو کہے کہ تمہیں کہے سو کتاب مجھے دکھلاؤ تو کتاب دیکھ کر بہوت خوش ہوئے ہور کہے کیا خوب بیان میرے نور کا ہور خدا کے نور کا کیے۔ ہور اے کہنا بھی میرا اچھ ہے اے کیمین ایک ملے ہیں تمہیں جوں پاتا ہے یوں پائے وے ہر کسی کوں اے نکو کہو جسے اس کی قدر معلوم ہوگی اُسے کہو ہور بھی کوئی طلب رکھے گا تو اسے بھی کہو، وے اس جنس سوں تعلیم دیو، یوں دودھ پتیا سوں۔ ہنواں کوں ہیڑا روٹی کھانے کے لائق کرتے ہیں یوں کرو رجیوں میں کیا ہوں"۔[۵]

حضرت شاہ میراں جی قطب شاہی عہد کے تھے۔ اس ترجمے کی قطعی تاریخ کا تعین نہیں کیا جاسکا۔ تاہم حامد حسن قادری کے بموجب ۱۶۰۳ء کا ایک مخطوطہ ملتا ہے گویا اُسے سب

رس" پر ۳۲ برس کی فوقیت حاصل ہو جاتی ہے۔

ادبی لحاظ سے ملا وجہی کے ترجمہ "سب رس" (۱۶۳۵ء) کی بہت اہمیت ہے جو محمد یحییٰ سیبک فتاحی نیشاپوری کے منظوم فارسی قصہ" دستورِ عشاق المعروف قصہ حسن و دل" کا آزادی نثری ترجمہ ہے۔ اس تمثیلی قصے کی عبارت مقفیٰ اور مسجع ہے یہ ترجمہ دکنی ادب کی اہم ترین کتب میں شمار ہوتا ہے۔

شمالی ہند میں نثر کی پہلی باقاعدہ تصنیف کی کربل کتھا" (۱۱۴۵ھ/۳۳-۱۷۳۲ء) فارسی کی روضۃ الشہداء (از کمال الدین حسین بن علی واعظ کاشفی) کا آزاد ترجمہ ہے۔

جب ولی ۱۷۰۰ عیسوی میں دہلی وارد ہوئے تو کلام سن کر مشہور صوفی سعد اللہ گلشن نے یہ مشورہ دیا تھا:

" ایں ہمہ مضامین فارسی کے بے کار افتادہ اند در ریختہ خود بکار بید از تو کہ محاسبہ خواہد گرفت "۔

سعد اللہ گلشن کا یہ مشورہ اس لحاظ سے بہت معقول اور بر وقت تھا کہ غزل میں دکنی الفاظ و محاورات کے ساتھ ساتھ مقامی رنگ بھی شامل تھا جو مفرس اسلوب اور فارسی اساتذہ کے خیالات کے تراجم کے ذریعہ سے غزل میں نئے آہنگ کا محرک بنا۔

دیکھا جائے تو ان کی یہ نصیحت ترجمے کے بارے میں تھی۔ شاعری میں ترجمہ دو طرح کا ہو سکتا ہے یا تو کسی استاد کا شعر سامنے رکھ کر شعوری کاوش سے اس کا ترجمہ کرنا یا پھر اساتذہ کے مضامین اور خیال کو اپنے الفاظ کے سانچے میں ڈھالنا۔

ہمیں یہ تو نہیں معلوم کہ ولی نے فارسی کے اساتذہ کے اشعار کا ترجمہ کیا یا کسی حد تک مضامین اخذ کیے تاہم اتنا ہے کہ اردو غزل گو شعرا کے ہاں بعض اوقات فارسی شعرا کے ساتھ جو توارد مضمون نکل آتا ہے وہ غالباً اسی باعث ہوگا اسے سرقہ نہ سمجھنا چاہیے۔ اس عہد میں ترجمے وغیرہ کے بارے میں کتابیاتی قواعد درج کرنے کا رواج نہ تھا اس لیے لفظی

ترجمہ یا خیال کا ترجمہ جائز تھا۔ اسے اصطلاح میں "متبدل ہندی" کہتے تھے۔ چند مثالیں ملاحظہ ہوں:

رستی آلودہ برلب رنگ پان است
تماشہ کن تہہِ آتش دخان است (بیدلؔ)

رستی مالیدہ لب پہ رنگ پاں ہے
تماشہ ہے تہہِ آتش دھواں ہے (سوداؔ)

گفتہ بودم غمِ دل باتو بگوئم چہ بیائی
چہ بگوئم کہ غم از دل بے رود چوں تو بیائی (سعدیؔ)

ان کے دیکھے سے جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے (غالبؔ)

مرحبا اے عشق خوش سودائے ما
اے طبیبِ جملہ علت ہائے ما (رومیؔ)

عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی درد بے دوا پایا (غالبؔ)

بگوشم ایں سدا از مقری تسبیح می آیا
کہ صد دل مضطرب گردد چو یک دل ما بہ آرامے (غنیؔ)

شمارہ سبحہ مرغوب بتِ مشکل پسند آیا
تماشائے بیکف بردن صد دل پسند آیا (غالبؔ)

آفریں بر دلِ نرم تو کہ از بہر ثواب
کشتۂ غمزہ خود را بہ نماز آمدہ (حافظؔ)

کی میرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا[9]
(غالب)

بخدا کہ رشک آید کہ نظر کنم بروئش
کہ نظر دریغ باشد بہ چنین لطیف روئے
(حافظ)

دیکھنا قسمت کہ آپ اپنے پہ رشک آ جائے ہے
میں اسے دیکھوں بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے
(غالب)

آئینِ تقویٰ ما نیز دانم
لیکن چہ چارہ بابخت گمراہ
(حافظ)

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی
(غالب)

تراجم کے دو دور:

اُردو میں تراجم کی روایت کا تجزیہ کرنے پر تراجم کی غایت کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ان دو ادوار سے وابستہ رجحانات کی زمانی تقسیم کا تعلق ہندوستان کے سیاسی حالات سے مشروط نظر آتا ہے۔ انگریزوں کی سیاسی بالادستی سے پہلے جو تراجم کیے گئے وہ سیاسی مقاصد کی خاطر نہ تھے بلکہ تہذیبی۔ مذہبی اور تخلیقی نوعیت کے تھے۔ عربی سے زیادہ تر اسلام، عقائد اور تصوف کے بارے میں کتب کے تراجم کے ساتھ ساتھ طب، نجوم۔ ریاضی۔ ہیئت، فلسفہ اور دیگر علوم کی کتب مترجمہ کی گئیں جبکہ فارسی سے تصوف کے ساتھ ساتھ تخلیقی ادب اور شاعرانہ تصورات کے تراجم کیے گئے۔ اگرچہ موضوعات کی یہ تقسیم قطعی نہیں کہ ہر زبان سے ہر موضوع کی کتاب کا ترجمہ کیا جا سکتا تھا اور کیا گیا ہو گا لیکن بحیثیت مجموعی تراجم کا کچھ یہی انداز نظر آتا ہے۔ اگرچہ علم دوست بادشاہوں،

نوابوں، وزیروں اور متمول حضرات کی سرپرستی کے باعث ہی کتابوں کے تراجم ہوتے تھے لیکن ان تراجم سے کسی قسم کے سیاسی مقاصد وابستہ نہ تھے۔ یہ ترجمے علمی ضروریات کے تحت کرائے جاتے تھے اور بنیادی مقصد علمی جستجو ہوتا تھا۔ ان تراجم میں موضوعات کا کتنا تنوع ملتا ہے۔ اس کا اندازہ صرف اسی وقت ہو سکتا ہے جب کتابیات مرتب کی جاسکیں۔ پاک و ہند کی بڑی بڑی لائبریریوں کے علاوہ برطانیہ فرانس، جرمنی اور بعض دیگر یورپی ممالک کی مرکزی لائبریریوں میں مخطوطات کی فہرستوں کا جائزہ لینے پر تراجم میں موضوعاتی تنوع کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

تراجم کا دوسرا دور، انگریزی سیاست کی بالادستی سے مشروط نظر آتا ہے اور اگر قطعی طور سے اس کی زمانی حدود کا تعین مقصود ہو تو فورٹ ولیم کالج (۱۰ رجولائی ۱۸۰۰ء) سے آغاز کرتے ہوئے "باغ و بہار" پہلی کتاب قرار دی جاسکتی ہے جو کہ "نوطرز مرصع" پر استوار تھی اور وہ خود ترجمہ تھی سید عطا حسین تحسین کے ۱۷۹۸ء کے فارسی قصے کی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی پالیسی کس طرح سیاسی عزائم میں تبدیل ہوگئی۔ اس سے سب آگاہ ہیں۔ فورٹ ولیم کالج کمپنی کے اہل کاروں کو دیسی زبانیں اور بالخصوص ہندستانی سکھانے کے لیے قائم کیا گیا تھا۔ کالج کے نصاب کے لیے کتابیں نووارد انگریزوں کی مخصوص ضروریات کو مدنظر رکھ کر ترجمہ کروائی گئیں ان سے کسی طرح کے ادبی یا تخلیقی مقاصد وابستہ نہ تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ اس وقت اُردو نثر برائے نام تھی اس لیے داستانوں کے تراجم نصابی ضروریات سے قطع نظر انفرادی صورت میں مقبول ہو کر سلیس نثر کا نقطۂ آغاز قرار پاگئے۔ تراجم کے اس منصوبے کے لیے بہر حال گل کرسٹ کو داد دینی پڑتی ہے جس نے صدر شعبہ اُردو کی حیثیت سے جو نصابی منصوبہ بندی کی اُس کے دور رس نتائج ظاہر ہوئے۔ محمد عتیق صدیقی کی تالیف "گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں فورٹ ولیم کالج کے زیر اہتمام طبع کی گئی (اور بوجوہ طبع نہ ہو سکی) تمام کتابوں کی تفصیل درج کی ہے (ص ۱۹۳ تا ۱۹۷)

کل مطبوعہ زیرِ طبع اور غیر مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۶۰ بنتی ہے۔ دیوناگری رسم الخط کی دس کتابیں چھوڑ کر باقی ۵۰ اردو میں تھیں، جبکہ ۴۲ مقامی حضرات فورٹ ولیم کالج کے باقاعدہ ملازم (منشی) تھے، مگر یہ سبھی اہل قلم نہ تھے۔ فورٹ ولیم کالج کے زیرِ اہتمام کیے گئے تراجم میں بلاشبہ باغ و بہار حسن بیان اور طرزِ ادا کے لحاظ سے مقبولیت میں سرِ فہرست قرار پاتی ہے۔ ہر چند کہ کمپنی حکام کا مقصد اُسے اردو میں سلاست نگاری کا نقطۂ آغاز بنانا نہ تھا۔ لطیفہ یہ ہے کہ ۱۸۵۷ء سے پہلے اُردو سیکھنے کے لیے خود انگریز تگ و دو کرتے تھے اور مقامی لباس پہن کر داڑھیاں رکھ کر مقامی لوگوں سے گھلنے ملنے کی کوشش کرتے، قواعد اور لغت مدون کرتے اور تراجم سے اُردو سیکھتے مگر سقوطِ دہلی کے بعد حالات بدلے، انگریز حاکم ہو گئے تو اب صورتِ حال برعکس ہو گئی۔ یعنی "نیٹو" انگریزی سیکھنے کی تگ و دو میں مصروف ہو گئے۔ جب ہمارے اہل قلم اور اہل علم کو جدید علوم اور نئے فنون کے معاملہ میں اُردو کی تنگ دامانی کا احساس ہوا تو انگریزی سے اُردو میں تراجم کا آغاز ہوا۔ صدی بیت گئی مگر ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے بلکہ اب تو انگریزی کے ساتھ فرانسیسی، جرمنی، روسی اور لاطینی امریکہ تک سے تراجم ہو رہے ہیں۔

پہلا ترجمہ:

جہاں تک انگریزی سے اُردو میں تراجم کا تعلق ہے تو اس سلسلے میں جزوی سعی کا آغاز جو شوا کیٹلر کی "لاطینی میں ہندوستانی زبان کے قواعد و لغت" سے سمجھا جاتا ہے ..... جس میں انجیل کے اوامرِ عشرہ کا ہندوستانی ترجمہ بھی شامل تھا۔ جو ہندوستانی زبان میں کسی یورپین زبان کا پہلا ترجمہ تھا۔[۵] اس کے بعد بنجمن شلزے کا نام آتا جس کی "A GRAMMER OF HINDOO STANI LANGUAGE" (مدراس ۱۷۴۱ء)۔ اس انداز کے ترجمے کی ثانوی مثال ہے۔ یہ گرامر طبع ہو چکی ہے اور گذشتہ باب میں اس کا مفصل تعارف کرایا جا چکا ہے۔ شلزے

کیونکہ پادری تھا۔ اس لیے گرامر کے ضمیمہ میں جن مذہبی دعاؤں کے تراجم دیئے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

اعتباریکا دُعا ایچ	"THE APPOSTLES CREED"
خاوند کی بندگی ایچ	"LORD'S PRAYER"
روبیکا کا مذکور ایچ	"BAPTISM"

"TEN COMMANDMENTS" کے علاوہ "THEDIALOGUE" کو کا عنوان دے کر جوار دو میں ترجمہ کیا گیا۔

اس کی صورت میں دکھنی نثر کا ایک قدیم نمونہ بھی مل جاتا ہے لہذا یہ ترجمہ اور نہیں تو صرف اسی بنا پر قابل توجہ ہے۔ اس ضمن میں سلیم الدین قریشی نے یہ معلومات بہم پہنچائی ہیں "۱۷۴۴ء میں اپنی پہلی اردو کتاب شائع کرنے کے بعد شلز نے کا ارادہ پرانے عہد نامہ کے ترجمہ کو مکمل کرنے کا تھا۔ لیکن یہ کام داؤد کے گیت (THE BOOK OF PSLAMS) کے ترجمے سے آگے نہ بڑھ سکا۔ اس کے بعد شلز نے پوری توجہ نئے عہد نامہ کے ترجمے کی طرف کر دی۔ نئے عہد نامہ کے مختلف حصوں کے ترجمے ۱۷۴۹ء اور ۱۷۵۸ء کے درمیان شائع ہوئے۔ ۱۷۵۸ء میں جب نئے عہد نامہ کے تمام حصوں کا ترجمہ مکمل ہو کر شائع ہو گیا تو ان مطبوعات کو ایک نئے سرورق عنوان اور دیباچے کے ساتھ یکجا کر کے جلد بندی کر دی گئی۔ انجیل کے ترجموں کے علاوہ شلز کی دو اور کتابیں بھی ہیں۔ ان میں سے پہلی "اللہ کے لائق" ہے تو "ایمان کی تعلیم کا کیتاب ایچ" ہے جو ۱۷۴۴ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اسلام اور عیسائیت کی تعلیم کا موازنہ کیا گیا ہے اور عیسائی عقائد کو سچا ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔" [۱۱]

محمد عتیق صدیقی "نے گل کرسٹ اور اس کا عہد" میں گل کرسٹ کی ہندوستانی زبان کے کوائف (۱۷۹۶ء) کے ضمن میں یہ بتایا ہے کہ شیکسپیئر کے دو ڈراموں کے کچھ اجزا (ہیملٹ اور ہنری ہشتم) گل کرسٹ نے ترجمے کئے تھے اور اسے "اولیت کا فخر" [۱۲] قرار دیا۔ لیکن جیسا کہ

مندرجہ بالا سے واضح ہو جاتا ہے۔ یہ اوّلین کوشش نہیں۔

اس انداز کی مزید مثالیں بھی مل سکتی ہیں لیکن جہاں تک باقاعدہ کتاب کے ترجمے کا تعلق ہے تو ڈاکٹر سیموئل جانسن کے تمثیلی قصہ "تواریخ واسلس شہزادہ حبشی کی" (۱۷۵۹ء) کا کمال الدین حیدر عرف محمد میر حسن الحسینی نے جو اردو ترجمہ (۱۸۲۹ء) کیا۔ اب تک کی معلومات کی رو سے یہ ترجمے کی پہلی کتاب ثابت ہو سکتی ہے۔ اس ترجمہ کی نظر ثانی پادری جان جیمز مور اور منشی فتح اللہ خاں اکبر آبادی نے کی تھی اس کا انگریزی دیباچہ جان جیمز مور نے قلم بند کیا تھا اور گرین وے پریس آگرہ سے ۱۸۲۹ء میں طبع ہوئی ہے[۱۳]

معلوم ہوتا ہے کہ سید محمد میر حسن الحسینی پیشہ ور مترجم تھے۔ کیونکہ انھوں نے سائنسی موضوعات پر انگریزی اور کتب کے متعدد تراجم کیے۔ مرزا حامد بیگ نے اپنی کتابیات تراجم (اسلام آباد: جلد اوّل ۱۹۸۶ء جلد دوئم ۱۹۸۷ء) میں ان کی پانچ کتابوں کے اندراج کے بعد متذکرہ مقالہ میں مزید گیارہ کتب ترجمہ کی نشاندہی کی ہے۔ تفصیل درج ہے، یہ سبھی گرین وے پریس آگرہ سے چھپی تھیں

۱۔ "رسالہ علوم طبیعہ" مصنف ؟ ۱۸۲۸ - ۱۸۲۹ء

۲۔ "رسالہ ہیئت" از ڈاکٹر ولسن ۱۸۲۸ - ۱۸۲۹ء

۳۔ "رسالہ دیگر ہیئت" از ڈاکٹر برنگلی ۱۸۲۸ - ۱۸۲۹ء

۴۔ "رسالہ علم کیمیا" از ریورنڈ چارلس ۱۸۲۸ء

۵۔ "رسالہ علم المناظر" " " ۱۸۲۸ء

۶۔ "رسالہ قوت مقناطیس" " " ۱۸۲۸ء

۷۔ "رسالہ علم الما" " " ۱۸۲۸ء

۸۔ اصولِ منطق مصنف ؟ دہلی مطبع العلوم ۱۸۴۴ء

۹۔ "رسالہ علم الہوا" از ریورنڈ چارلس آگرہ ۱۸۲۸ء

۱۰۔ رسالہ علم الحرارۃ　　از ریورنڈ چارلس　　آگرہ ۱۸۲۸ء

۱۱۔ رسالہ مقاصد العلوم　　از لارڈ براہم　　کلکتہ ۱۸۴۱ء

"تھوڑی کوشش":

۱۸۵۷ء کے بعد برعکس صورت حال کے باعث اب انگریزوں کو ہندوستانی سیکھنے کی ضرورت نہ رہی۔ کیونکہ اب تو خود ہندوستانی انگریزی سیکھنے پر مجبور تھے۔ یہ معاشی ضرورت تھی جس کے نتیجے میں انگریزی جزو نصاب بنی اور اب تک جزو نصاب ہی بنی چلی آ رہی ہے۔

انگریزی سے نصابی سطح کی دلچسپی کے ساتھ ساتھ سرسید احمد خاں اور ان کے رفقاء کو شدت سے یہ احساس تھا کہ اردو کی روایتی غزلیہ شاعری، مشرق کا پس ماندہ ادب اور تازہ ترین علمی تحقیقات سے عاری اور ذہنی طور پر جامد فنون جدید زندگی کے تقاضوں کے لیے ناموزوں ہیں ان کا ایک حل تو وہی انگریزی زبان کی تحصیل تھا، لیکن بنیادی دقت یہ تھی کہ نہ تو وسیع پیمانے پر انگریزی کی تحصیل ممکن تھی اور نہ ہر شخص اس پر قادر۔ جب مولانا محمد حسین آزاد نے یہ کہا:

> "اے جوہر زبان کے پرکھنے والو! میں زبان انگریزی میں بالکل بے زبان ہوں اور اس ناکامی کا مجھے بھی احساس ہے"۔ [۱۴]

تو یہ ان کا ذاتی المیہ تھا مگر شاید وہ انگریزی سے نابلد متعدد ایسے افراد کی بھی ترجمانی کر رہے تھے جن کے لیے اب انگریزی میں استعداد بہم پہنچانا ناممکن تھا۔ آزاد نے انجمن پنجاب لاہور میں دیئے گئے مشہور لیکچر میں ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا:

> "تمہارے بزرگ اور تم ہمیشہ سے نئے مضامین اور نئے انداز کے موجد رہے، لیکن نئے انداز کے خلعت و زیور جو آج کے مناسب حال ہیں وہ انگریزی صندوقوں میں بند ہیں کہ ہمارے پہلو میں دھرے ہیں اور ہمیں خبر نہیں۔ ہاں

صندوقوں کی کنجی ہمارے ہم وطن انگریزی دانوں کے پاس ہے۔[15]

"دیکھتا ہوں کہ آجکل ہماری گورنمنٹ اور ان کے اراکین کو اس طرف توجہ ہوئی ہے۔ جن کے دل ہماری تعلیم کا ذمہ اُٹھائے ہوئے ہیں۔ حق پوچھو تو ہماری انشا کے ستارے اقبال کی مبارک ساعت بنے۔ اس موقع پر ہماری تھوڑی کوشش بھی بہت سا اثر کرے گی۔"[16]

اور اس "تھوڑی کوشش" میں تھوڑی سی کوشش ترجمے کی بھی تھی۔ یوں دیکھیں تو انگریزی سے اُردو تراجم ایک طرح کا علمی شارٹ کٹ قرار پاتے ہیں۔ انفرادی کوششوں سے قطع نظر تراجم کے لیے باضابطہ اور منظم کوششیں بھی کی گئیں۔ اس مقصد کے لیے ادارے بھی قائم کیے گئے کالجوں اور یونیورسٹیوں نے بھی اپنی سی سعی کی۔ اس ضمن میں سرفہرست تو سر سیّد احمد خان ہیں جنھوں نے سائنٹیفک سوسائٹی (غازی پوری: ۱۸۶۲ء) قائم کی جس میں سائنسی موضوعات پر مقالات لکھے اور ترجمہ کیے جاتے تھے۔ اُن کے "تہذیب الاخلاق" (اجرا: ۲۴ دسمبر ۱۸۷۰ء) نے بھی اس سلسلے میں خاصا اہم کردار ادا کیا۔

ان کے علاوہ یہ ادارے بھی قابل ذکر ہیں!

دارالترجمہ شاہانِ اودھ

"دہلی کالج" (۱۸۵۴ء میں ٹرانسلیشن سوسائٹی دارالترجمہ قائم کی گئی)

"آگرہ کلب سوسائٹی"۔ آگرہ ۱۸۴۳ء

"انجمن پنجاب" لاہور ۱۸۶۴ء

"انجمن ترقی اردو۔ اورنگ آباد ۱۹۰۳ء

"جامعہ عثمانیہ" حیدرآباد دکن

(شعبہ تالیف و ترجمہ ۱۹۱۶ء میں قائم ہوا)

نواب شمس الاحرار فخر الدین کا تصنیف تالیف و ترجمہ کے لیے

مطبع و مدرسہ فخریہ حیدر آباد دکن ۱۸۳۴ء

"مدرسہ طبابت" حیدر آباد دکن ۱۸۴۵ء

"انجمن مجمع علم و ہنر" سائنٹیفک سوسائٹی مدراس ۱۸۵۳ء

"میڈیکل سکول" آگرہ ۱۸۵۴ء

"انجنیئرنگ کالج" رڑکی ۱۸۵۶ء

سائنٹیفک سوسائٹی مظفرپور بہار ۱۹۶۸ء

"دفتر مترجم السنہ شرقیہ" (اورینٹل ٹرانسلیٹر آفس بمبئی)

"دارالمصنفین" اعظم گڑھ" ہندوستان اکیڈمی" "اُردو اکیڈمی" جامعہ ملیہ دہلی وغیرہ۔

ان اداروں کی مساعی کے نتیجہ میں اُردو زبان میں فلسفہ، منطق، کیمیا، طب، طبیعیات نفسیات، ریاضی، جیومیٹری، ہیئت، نجوم، جغرافیہ، تاریخ اور معاشیات جیسے اہم علمی موضوعات پر تراجم ہوتے رہے۔

اتنے کہ بلاشبہ اس عہد کو عہدِ تراجم قرار دیا جاسکتا ہے۔ [۵۸]

تراجم کی اقسام

اصولاً تو تراجم کی بھی اتنی ہی اقسام بن جاتی ہیں جتنی کہ اصنافِ ادب یا علوم کی ہوتی ہیں تاہم سہولت کے لیے تراجم کو تخلیقی تراجم اور علمی تراجم دو بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ان دو شعبوں کی مزید نوعی اقسام بھی ہوجاتی ہیں جیسے تخلیقی تراجم میں شاعری ڈراما افسانہ ناول وغیرہ اور علمی تراجم میں سماجی علوم اور سائنس کی

مختلف شاخیں شامل سمجھی جاسکتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ بنیادی بات واضح رہے کہ جس طرح تخلیقی ادب سے وابستہ تخلیقی عمل جداگانہ ہے۔ یا تحقیقی موضوعات پر تحریر کا انداز الگ ہوتا ہے۔ اس طرح سے ترجمہ نہیں ہوتا، جہاں تک تخلیقی ادیب کے تخلیقی عمل کا تعلق تو مترجم اس معاملے میں "باہر والا" ثابت ہوتا ہے اور وقتِ تخلیق ادیب کی تخلیقی شخصیت میں لاشعوری محرکات کی

کارفرمائی نے موضوع کو کتنی گہرائی بخشی اور اسلوب میں کیا جوت جگائی۔ مترجم کو اس سے غرض نہیں۔ اسی طرح غیر تخلیقی موضوعات کے لیے لکھنے والے نے فراہمیٔ معلومات کیلئے کن کن دروازوں پر دستک دی۔ کتنی لائبریریوں کی خاک چھانی کتنے مخطوطات کی دھول پھانکی مترجم کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں کہ ترجمے کی صورت میں اسے تکمیل شدہ کتاب، مقالہ یا تخلیق ملتی ہے۔ اس لیے مصنف کی مانند تحریر سے اس کی جذباتی دلچسپی نہیں ہو سکتی، بلکہ مصنف کے برعکس اس کا کام تو خاصا ٹیکنیکل ثابت ہوتا ہے یعنی رواں ترجمہ کے لیے مناسب الفاظ و محاورات کی تلاش اور علمی ترجمے کی صورت میں موزوں اصطلاحات کی جستجو۔

علمی کتابوں کے مقابلے میں تخلیقات کا ترجمہ مشکل ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ تخیل یا تصورات کی عکاسی کا ہوتا ہے اور جذبات احساسات کی تصویرکشی مقصود ہوتی ہے۔ لہذا علمی کتب کی مانند یہاں لفظ پر لفظ کی چول بٹھانے سے بات نہیں بن سکتی۔

مترجم کی بنیادی الجھن۔ ایسی الجھن جو اس بنیادی مسئلے سے جنم لیتی ہے کہ مفہوم کا ترجمہ کیا جائے یا اسلوب کا۔ متعدد تراجم جو ناکام ثابت ہوئے تو اس کا بنیادی سبب یہی ہے۔ شاعرانہ تخلیق میں یہ الجھن نمایاں تر صورت میں نظر آتی ہے کہ یہاں تو بعض اوقات کیفیت یہ ہوتی ہے:

آبگینہ تندیٔ صہبا سے پگھلا جائے ہے!!
مترجم آبگینہ کی عکاسی کرے یا تندیٔ صہبا کی؟

ترجمہ بھی ایک فن ہے اور ہر فن کی مانند اس کی بھی کچھ مبادیات، مخصوص تقاضے اور ان سے متعلق فنی رموز ہیں۔ اردو میں ترجمے کی دو صدیوں پر محیط جو روایت ملتی ہے وہ نامور اہل قلم کی کہکشاں پر مشتمل ہے اور اسی لیے یہ بے حد توانا بھی ہے۔ اس ضمن میں یہ بھی ملحوظ رہے کہ ترجمہ صرف پیشہ ور مترجمین ہی نے نہیں کیا۔ بلکہ وہ حضرات بھی ملتے ہیں

جو خود تخلیقی فنکار بھی تھے، بلکہ زیادہ بہتر تراجم بھی انہی ادیبوں نے کیے جو تخلیق کے رمز آشنا بھی تھے۔ میرامن سے جس کام کا آغاز ہوا وہ دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا نظر آیا۔ دراصل ایسے تراجم ہی تخلیقی ترجمہ کہلانے کے اہل ہیں جن کے مترجمین تخلیق کار بھی تھے۔

ترجمہ تخلیق کبھی بھی نہیں بن سکتا لیکن مترجم اگر صاحبِ تخلیق کی اس ذہنی فضا تک جا پہنچے جو تخلیقی عمل سے مشروط ہوتی ہے تو ایسا ترجمہ تخلیق نہ ہوتے ہوئے بھی تخلیق کے اوصاف سے عاری نہیں ہوگا۔ اور اسی پر رشید احمد صدیقی (مراسلہ بنام مشفق خواجہ) نے بھی زور دیا۔ انہوں نے تخلیقی اصناف کے تراجم پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا:

"ہم اصل تصنیف کے مطلب و مفہوم کو تو اردو میں منتقل کر سکتے، اصل کے مضمرات و مزعومات اور اُن کی فضا اور اس کی بازگشت کامیابی کے ساتھ اپنی زبان میں نہ لا سکے۔ انگریزی جرمن فرنچ اور سنسکرت وغیرہ کی ادبیات کے جو ترجمے اردو میں ہوئے ان میں اکثر ایسے معلوم ہوں گے جیسے وہ ترجمہ نہ ہوں۔ اُردو ہی کی کوئی تصنیف ہو۔ عام طور پر اسے ترجمہ کی بہت بڑی خوبی سمجھتے ہیں۔ مجھے ایسا ماننے میں تامل ہے۔ مغرب کے ہر ادب کے اختصاصی مترجم ہوتے ہیں جن کا کمالِ فن یہ ہے کہ جس زبان سے ترجمہ کرتے ہیں اس کی پوری آب و ہوا، نوک پلک اور رنگ و بو ترجمے میں منتقل کر دیتے ہیں۔ پڑھنے والا زیادہ تر یہ محسوس کرتا ہے کہ وہ کس زبان کا ترجمہ پڑھ رہا ہے اور کمتر یہ کہ کس زبان میں پڑھ رہا ہے۔ اچھا ترجمہ بڑا پائیدار و دلکش لیکن اتنا ہی دشوار وسیلہ ہوتا ہے۔ غیر زبانوں کی ممتاز و مفید خصوصیات کو اپنی زبان میں ڈھالنے کا۔ جو لوگ انشا پردازی کے رموز سے واقف ہیں وہ جانتے ہوں گے کہ غیر زبان کی جینئس (GENIUS) کو اپنی زبان کی جینئس کے پہلو بہ پہلو جلوہ گر کرنا کتنا مشکل کام ہے۔" [۵۱]

تراجم اور تخلیقی روّیے:

اردو کی علمی تنگ دامنی کے احساس نے تراجم (بالخصوص) علمی تراجم کو فروغ دیا۔ اس نقطۂ نظر سے مترجمین کی مساعی قابلِ ستائش ہے کہ اُن کی بدولت ہمارے ہاں نئے علمی تصورات متعارف ہوئے۔ نصابی ضروریات پوری کی گئیں، سنجیدہ علمی موضوعات سے عمومی دلچسپی بڑھی۔ لیکن تخلیقی نقطۂ نظر سے بھی تراجم کی اہمیّت خالی از دلچسپی نہیں۔ جہاں تک اُردو میں تخلیقات کی ترقی کا تعلق ہے تو ہماری تمام شعری اصناف فارسی سے مستعار ہیں جبکہ ڈراموں اور داستانوں کی استثنائی مثالوں سے قطع نظر جملہ نثری اصناف جیسے ناول افسانہ انشائیہ رپورتاژ، خاکہ۔ انگریزی سے درآمد شدہ ہیں اور اس ضمن میں بھی تراجم کا کردار اساسی رہا ہے۔ مثلاً ڈاکٹر محمد صادق کے بموجب نذیر احمد کا "بنات النعش" تھامس ڈے کے ہسٹری آف سن فورڈ اینڈ میٹرن ("HISTORY OF SANFORD AND METRON", 1783) اور "توبتہ النصوح" ڈینیئل ڈیفو کے فیملی انسٹرکٹر (۱۷۱۵ء) سے مستعار ہیں۔ افسانہ میں سجاد حیدر یلدرم کا مقام واضع کرنے کی ضرورت نہیں کہ اب تو زمانی لحاظ سے انہیں پریم چند پر فوقیت دی جاتی ہے اُن کے افسانوں کا مجموعہ "خیالستان" ترکی افسانوں کے تراجم پر مشتمل ہے۔ اب تک یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے افسانے کس کے ترجمے تھے لیکن اب ترکی کے ایک اُردو داں پروفیسر ڈاکٹر ایرکن ترکمان کی تحقیق سے یہ معلوم ہو گیا کہ "خیالستان وگلستان" "حجِ ناجنس" اور ثالث بالخیر۔ احمد حکمت او غلو کے ترکی افسانوں کے تراجم ہیں[۱۹]۔

اسی طرح انشائیہ بھی انگریزی "ESSAY" کے تراجم کے ذریعے سے یہاں متعارف ہوا۔ اس معاملے میں اگرچہ سرسید کو اوّلیت دی جاتی ہے، لیکن اُن سے بھی پہلے ماسٹر رام چندر ملتے ہیں جنھوں نے انگریزی کے معروف ESSAYS لکھنے والوں جیسے بیکن اور ایڈیسن کے بعض "ESSAY" کے آزاد ترجمے کیے اور بقول ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی:

"اُردو نثر کی تاریخ میں رام چندر کی یہ تقدیمی حیثیت بھی لائق احترام ہے کہ انہوں نے اُردو کو مضمون یعنی "ESSAY" سے روشناس کرایا۔" [۲۰]

اسی طرح ڈاکٹر سیدہ جعفر نے بھی اپنی تالیف "ماسٹر رام چندر اور اُردو نثر کے ارتقا میں ان کا حصہ" میں انہیں "ESSAY" کا بانی قرار دیتے ہوئے اس کا باعث تراجم کو بتایا۔ وہ لکھتی ہیں "انہوں نے کئی انگریزی مضامین کا ترجمہ بھی کیا تھا اور متعدد موضوعات پر انگریزی ترجمے مضامین لکھنے کی کوشش کی تھی"۔(ص ۳۷) ڈاکٹر صاحبہ نے ترجمہ شدہ انشائیوں کے حوالے بھی دیئے ہیں۔

ان کے بعد سرسیّد آتے ہیں جنہوں نے "لندن کے پیغمبروں اور سولائزیشن کے دیوتاؤں سر رچرڈ سٹیل اور مسٹر ایڈیسن" کے تراجم بھی کیے اور ان کے رنگ میں انشائیے بھی لکھے اور اس اعتراف کے ساتھ "ہم نے یورپ کے نامی عالموں ایڈیسن اور سٹیل کے مضامین کو بھی اپنی طرز اور اپنی زبان میں لکھا ہے کہ جہاں ہم نے اپنے نام کے ساتھ اے۔ڈی اور ایس ٹی کا اشارہ کیا ہے اور اپنی قوم کو دکھایا ہے کہ مضمون لکھنے کا کیا طرز ہے۔" [۲۱]

ان کے بعد مولانا محمد آزاد ہیں جن کی "نیرنگِ خیال" کے مضامین جانسن۔ ایڈیسن۔ سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے بعض "ESSAYS" کے آزاد تراجم ہیں۔ ڈاکٹر محمد صادق کی تحقیق سے پیشتر انہیں طبع زاد سمجھا جاتا تھا مگر ڈاکٹر صاحب نے اصل "ESSAYS" کا کھوج لگا کر یہ کیا:

" درحقیقت نیرنگِ خیال کے تمام انشائیہ انگریزی سے ترجمہ شدہ ہیں۔" [۲۲]

الغرض اُردو میں انشائیہ نگاری کا آغاز کرنے والے (ماسٹر رام چندر) بحیثیت صنف اسے تقویت دینے والے (سرسیّد احمد خاں) اور اس میں اسلوب کی نزاکت شامل کرنے والے (محمد حسین آزاد) تینوں ہی تراجم کے مرہونِ منت ہیں، یوں دیکھیں تو صنفِ انشائیہ کا آغاز ہی تراجم پر استوار نظر آتا ہے۔

تراجم کے بارے میں مزید معلومات، مباحث اور فن سے آگاہی کے لیے مندرجہ ذیل کتب مقالات سے رجوع کیا جاسکتا ہے:

ڈاکٹر قمر رئیس۔ "ترجمہ کا فن اور روایت" دہلی نثار احمد قریشی (مرتب) ترجمہ روایت اور فن" اسلام آباد ۱۹۸۵ کل پاکستان اہل قلم کانفرنس (اسلام آباد ۱۹۸۳ء) میں ایک نشست ادب میں تراجم کی افادیت" کے موضوع کے لیے مخصوص کی گئی تھی۔ اس کے مقالہ نگاروں میں یہ اہل قلم شامل تھے:

اے۔ کے بروہی۔ خطبہ صدارت "ادب میں ترجمہ کی اہمیت اور قدر قیمت"
(ترجمہ مقالہ نظیر صدیقی)

دلشاد کلانچوی "ادب میں تراجم کی افادیت"

عبداللہ جان جمال دینی "ادبی تراجم کی افادیت"

غلام ربانی آگرو "ادب میں ترجمے کی افادیت"

ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری "ادب میں تراجم کی اہمیت"

یہ تمام مقالات "ادبی زاویے" (اسلام آباد ۱۹۸۴ء) میں شامل ہیں۔

اصطلاح کیا ہے؟

کسی علمی نظریہ، تصور، وقوعہ، کیفیت یا نتیجہ کے جوہر کو مختصر ترین الفاظ میں بیان کرنا اصطلاح ہے۔ ہر شعبہ علم اور اس سے وابستہ مخصوص تصورات یا ایجادات و اختراعات اپنے اپنے وجود کے ساتھ اپنی ذات سے مخصوص اصطلاحات بھی لے کر آتی ہیں۔ جس طرح بچہ پیدا ہوکر مخصوص نام پاتا ہے اور پھر یہ نام عمر بھر اس کی پہچان کا باعث بنتا ہے۔ اسی طرح تصورات یا ایجادات بھی معرض وجود میں آکر اصطلاحات سے اپنا تشخص برقرار رکھتی ہیں یوں کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ جب اصطلاح اور اس سے متعلق شے یا تصور ایک

ہوکر یوں لازم ملزوم ہو جاتے ہیں کہ تصور یا شے اور لفظ کی دوئی مٹ جاتی ہے اور اس تصور یا شے کی مقبولیت اصطلاح کے قبول عام پر منتج ہوتی ہے۔ جس کے نتیجے میں وہ بالآخر لسانی اور زمانی حدود پار کر جاتی ہے۔ اس حد تک کہ بعض اوقات تو یہ ہوتا ہے کہ وہ تصور علمی حیثیت سے متروک ہو گیا یا شے دائرہ استعمال سے خارج ہو گئی مگر ان سے متعلق اصطلاحات باقی رہ جاتی ہیں۔ اس ضمن میں یہ اساسی امر ملحوظ رہے کہ ہر زبان کے مخصوص مزاج اور اس کے لسانی ڈھانچے کے تناظر میں اصطلاح تشکیل پاتی ہے اور اس لحاظ سے جیسی بھی اصطلاح بنے گی۔ ٹھیک ہی ہو گی۔ یہی نہیں بلکہ اصطلاح جن الفاظ پر مشتمل ہوتی ہے ان کے لغوی مفہوم کی اس تصور یا شے سے مطابقت بھی لازم نہیں۔ بعض اوقات تو یہ بھی ہوتا ہے کہ لفظ اور شے کے برعکس ہونے کے باوجود اصطلاح مقبول ہو جاتی ہے۔ اسے علامہ اقبال کے فلسفے کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے جنہوں نے اپنے افکار کا مرکزی نکتہ خودی کو قرار دیا۔ خودی کا یہ مفہوم خودی کے روایتی مفاہیم اور ان سے وابستہ متصوفانہ تصورات کے برعکس ہے۔

جب یورپ کے مترجمین اس کا ترجمہ ایگو کرتے ہیں. تو اس میں وہ انائی مفہوم بھی شامل ہو جاتا ہے جس کی علامہ اقبال کے تصورِ خودی سے توثیق نہیں ہوتی۔ اسی طرح انہوں نے غزل کے روایتی تصور کے برعکس اپنی شاعری میں عشق کو یقین محکم عمل پیہم کے مفہوم میں استعمال کیا اور اس اصطلاح پر اپنے فلسفۂ عمل کی اساس استوار کی مگر اسے انگریزی الفاظ LOVE, PASSION, GRAND PASSION. یا فرانسیسی کے LAMORE سے واضح نہیں کیا جا سکتا۔ اس طرح علامہ اقبال کے جنون کو نفسیات کی عام اصطلاحات PSYCHOPATH. یا MANIA. وغیرہ سے نہ صرف یہ کہ درست ترجمانی ممکن نہیں بلکہ یہ اصطلاحات برعکس مفہوم کا باعث بنتی ہیں۔ اسی طرح فرائڈ نے تحلیل نفسی میں لڑکے اور لڑکی کی ماں باپ سے جنسی رغبت کی وضاحت

کے لیے یونان کے مشہور المیوں کے کرداروں سے ایڈیپس اور الیکٹرا کمپلیکس کی جو اصطلاحات
ساخت کیں۔ وہ اس کے تصورِ جنس کی درست ترجمان نہیں، مگر ان تصورات سے یہ اس حد
تک مخصوص ہو چکی ہیں کہ اصل ڈراموں کے عدم مطالعوں کے باوجود بھی یہ اصطلاحات کارآمد
ثابت ہو رہی ہیں۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر اصطلاح کے الفاظ لغوی مفہوم شے یا تصور کی
نمائندگی کر سکیں تو بہت اچھا۔ لیکن برعکس صورت میں بھی اصطلاح کارآمد ثابت ہو سکتی ہے۔

وضعِ اصطلاح:

سوال یہ ہے کہ اصطلاح کی تشکیل کس نوع کے الفاظ سے ہوتی ہے۔ اس ضمن میں
سید وحیدالدین سلیم نے اس خیال کا اظہار کیا ہے:

"دنیا کی ہر علمی اور ترقی یافتہ زبان میں دو قسم کے الفاظ پائے جاتے
ہیں جو اصطلاحات کے نام سے موسوم کیے جاتے ہیں۔ (اول) مفرد الفاظ
یا مفرد اصطلاحیں (دوئم) مرکب الفاظ یا مرکب اصطلاحیں۔ اگرچہ مرکب الفاظ
علمی زبانوں میں زیادہ اہم ہوتے ہیں اور ان کی تعداد بھی زیادہ ہے۔ تاہم
مفرد الفاظ کی ایک بڑی تعداد ہر علمی زبان میں پائی جاتی ہے۔ یہ مفردات
یا تو ایسے ہیں جن سے ترکیب الفاظ کے وقت کام نہیں لیا گیا، اور
مفرد ہونے کی حالت میں بدستور باقی ہیں، علمی زبان میں مرکب اصطلاحیں بلاشبہ
زیادہ اہم ہیں۔ تاہم مفردات ہماری بحث سے خارج نہیں ہو سکتے۔"[۲۳]

اصطلاح سازی سے وابستہ فنی مباحث کے ضمن میں یہ امر قابلِ توجہ ہے کہ کسی خاص زبان
میں اصطلاح وضع کرنا کوئی مسئلہ نہیں۔ دنیا کی بیشتر ترقی یافتہ زبانوں کے پاس وافر ذخیرۂ الفاظ
ہوتا ہے جس سے اصطلاح سازی ممکن ہو جاتی ہے۔ اپنی زبان میں موزوں الفاظ کی عدم
دستیابی کی صورت میں دیگر زبانوں سے رجوع کر لیا جاتا ہے جیسے انگریزی میں یونانی اور لاطینی

سے مدد لیتے ہیں اور ہم عربی اور فارسی سے ۔ اچھی بری، موزوں اور ناموزوں جیسی بھی اصطلاح ساخت ہوتی ہے وہ چل نکلتی ہے ۔ مگر اردو کے نقطہ نظر سے ایک الجھن یہ ہے کہ ہمارے ہاں اصطلاح اختراع کرنے کے مقابلے میں اصطلاحات کے تراجم بہت زیادہ ہوتے ہیں اس حد تک کہ اصطلاح سازی کے حوالے سے معرض وجود میں آنے والے بیشتر مباحث، اساسی طور پر اصطلاحات کے تراجم سے وابستہ ہوتے ہیں ۔ یہ مسئلہ اردو کا ہی نہیں بلکہ ان تمام زبانوں کا بھی ہے جن کا یہ مسئلہ ہے کہ اصطلاحات کے موزوں ترین تراجم کیسے کیے جائیں اُدھر آج کی دنیا میں جس رفتار سے انکشافات اور ایجادات ہو رہی ہیں اور جس تیزی سے عملی تصورات وضع کیے جا رہے ہیں ۔ اس کی بنا پر ''بے بی بوم'' کی مانند ''ٹرم بوم'' کہنا غلط نہ ہوگا ۔ تراجم خواہ کتنی ہی تیز رفتاری سے کیوں نہ ہوں اور ان کے لیے منظم سعی کی علمی اساس کتنی ہی مستحکم کیوں نہ ہو، مگر تراجم کا اصطلاحات کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا ممکن نہیں ۔ اصطلاح کے وجود میں آنے اور اس کے ترجمے کے عمل میں جو بُعد ملتا ہے ۔ اسے ریاضی سے یوں واضح کیا جا سکتا ہے ۔ اصطلاحات کی اختراع یا غیر ملکی اصطلاحات کی آمد GEOMETERICAL PROGRESSION کے مطابق ہوتی ہے ۔ یعنی ایک دو چار آٹھ، سولہ کی رفتار سے ۔ جبکہ تراجم کی رفتار ARITHMATICAL PROGRESSION کے مطابق ہوتی ہے ۔ یعنی ایک دو تین چار پانچ چھ سات آٹھ ۔۔۔ لہذا کتنی ہی کوشش کیوں نہ کی جائے ۔ اصطلاحات کی تیز رفتاری کا ساتھ دینا ممکن نہیں قطع نظر اس امر کے کہ ترجمہ شدہ اصطلاح موزوں ہے بھی یا نہیں اور علمی حلقوں میں اسے سندِ قبولیت ملتی بھی ہے یا نہیں ۔

اردو میں اصطلاح سازی کو دو ادوار میں تقسیم کیا جا سکتا ہے ۔ ایک دور انگریزی اثرات سے پہلے کا ہے جب اردو میں فارسی عربی اور کسی حد تک سنسکرت الفاظ کی امداد سے اصطلاحات تشکیل پاتی تھیں ۔ دربار کی زبان فارسی تھی اسی لیے امور مملکت اور

تہذیبی معاملات میں فارسی سے مدد لی جاتی تھی جبکہ دینی مسائل کے لیے عربی کی طرف رجوع کیا جاتا تھا۔ رہے سائنسی علوم بالخصوص طب، ہیئت، نجوم، جغرافیہ وغیرہ تو ان کے لیے بھی مسلم محققین اور ان کی سائنسی کتابوں کے ساتھ ساتھ قدیم سنسکرت کتب موجود تھیں۔ اس لیے بجا طور پر اصطلاحات کی حد تک خود کفیل تھے۔ مخصوص نصاب تھا۔ مخصوص علوم اور مخصوص اصطلاحات مگر انگریزوں کی آمد نے صورت حال کو بتدریج تبدیل کرنا شروع کر دیا۔ اب تک اپنے علوم سے مطلق تھے۔ چونکہ تقابل کے لیے کچھ نہ تھا، لیکن انگریزی کی صورت میں جب تقابل کی ایک صورت پیدا ہو گئی تو پھر دونوں زبانوں میں علوم کے بُعد کا اندازہ ہوا اور اسی کو "ختم" کرنے کے لیے تراجم کا آغاز ہوا۔ گذشتہ صفحات میں تراجم کے سلسلے میں جو کچھ لکھا گیا اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں بس اتنا ہے کہ اصطلاح سازی کا دوسرا دور جو اب تک جاری ہے تراجم سے مشروط ہے۔ تراجم کی رفتار میں تیزی نے اصطلاح سازی کے مسئلہ کو انفرادی اور اجتماعی صورت میں نمایاں کیا۔ اس لیے اب ہمارے لیے اصطلاح سازی اختراع کے معنوں میں "سازی" ہونے کے برعکس ترجمے کے مترادف ہے۔ انیسویں صدی میں اداروں کی صورت میں منظم طور پر تراجم کیے گئے۔ جن کی بدولت اصطلاحات کے تراجم میں تیز رفتاری پیدا ہوئی۔

متغیر اصطلاح:

اصطلاح کے ایک مرتبہ ترجمہ یا وضع ہو جانے کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ پتھر پر لکیر ثابت ہوتی ہے۔ علمی تصورات میں تغیرات کا ساتھ دینے کے لیے بعض اوقات اصطلاح بھی تغیر آشنا ہو جاتی ہے، چنانچہ وضع کردہ اور ترجمہ شدہ اصطلاحات تبدیلیوں سے آشنا ہوتی رہتی ہیں۔ بقول پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی "اہل فرنگ کے ساتھ ہم کو بھی

اپنی اصطلاحوں میں ترمیم کرنا پڑی۔ انگریزی میں پہلے پولیٹیکل اکانومی ایک علم کا نام تھا۔ ہم اسے سیاست مدن کہتے تھے۔ اب یورپ میں اس علم کی وضع قطع کے ساتھ اس کا نام بھی بدل گیا اور ہم اکنومکس کو معاشیات کہنے لگے۔ حالانکہ پرانی اصطلاح ملّا جلال الدین دوانی کی وضع کی ہوئی تھی"[۲۴] کیفی صاحب نے ۱۹۲۴ء میں یہ بات ایک لیکچر میں کہی تھی۔ مگر اب نصف صدی کے بعد معاشیات کی جگہ اقتصادیات مروج ہے۔ خود اقتصادیات کو بھی علم الاقتصاد کی ترقی یافتہ صورت سمجھنا چاہیئے۔

اصطلاح میں عمل تغیر کو سائیکولوجی کے لیے نفسیات کی مثال سے بھی سمجھا جا سکتا جو کبھی علم النفس ("القواعد" مترجم شیخ انعام علی بی اے ۱۸۸۵ء) تھی تو کبھی "روحانی" ("تمدن عرب" مترجم سید علی بلگرامی ۱۸۹۶ء) لیکن ۱۹۲۷ء کے بعد نفسیات رائج ہو گیا ("معاشرتی نفسیات" مترجم مرزا محمد ہادی رسوا)[۲۵]

الغرض علوم کے مفاہیم میں تبدیلیوں کی نسبت سے اصطلاحات بھی تغیر آشنا ہوتی ہیں۔ البتہ تبدیلی کا یہ عمل خاصا سست رفتار اور غیر محسوس کن ہوتا ہے۔

اصطلاح: نفسیاتی تناظر:

اصطلاح کے اختراع یا ترجمہ کی صورت میں عمرانی۔ تہذیبی اور تمدنی امور کے ساتھ لسانی پہلو بھی تشکیلی کردار ادا کرتا ہے۔ اصطلاح کے تشکیلی عناصر کے تجزیہ و تحلیل میں ان سب کی انفرادی کارفرمائی اہم ہوتی ہے۔ کرداری نفسیات کے نقطۂ نظر سے اگر اصطلاح کی مقبولیت یا عدم مقبولیت کا جائزہ مقصود ہو تو اسے CONDITIONING سے سمجھا جا سکتا ہے جو وسیع پیمانے پر بلکہ قومی سطح پر ہوتی ہے جو اصطلاح زبان زد عوام ہو گئی اسے شعوری تبدیلی یا احکام سے عوام کی زبان سے اتارنا آسان نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ ٹیلی ویژن کے لیے "دوردرشن" یا "دورنما" زبان پر نہیں چڑھتا، نہ ہی ریڈیو کو کوئی "آکاش وانی" کہتا

ہے۔ ایوب خاں نے ٹیلی ویژن اور ریڈیو کی خبروں میں پاکستان کو "پورپو پاکستان" کہلوانا شروع کیا تھا، مگر اسے بھی عوام نے قبول نہ کیا۔ اس کی وجہ تعصب نہیں بلکہ یہی ہے کہ جو اصطلاح زبان پر چڑھ گئی وہ کنڈیشنگ کی بنا پر سماعی اور گویائی اعصاب سے مشروط ہو جاتی ہے۔ اس کی جگہ نئی اصطلاح استعمال کرنے کی شعوری کاوش کا مطلب ہے DECONDITIONING اور یہ عمل آسان نہیں ہوتا۔ اگر موجد نے ٹیلی ویژن کا نام "دور درشن" یا "دور نما" یا کچھ ہی کیوں نہ رکھا ہوتا تو ایجاد کے ساتھ یہ نام بھی مقبول ہو کر زبان زد عوام ہو جاتا۔ یہی وجہ ہے کہ لغوی طور پر درست ہونے کے باوجود بھی "دور درشن"، "دور سماعت" (ٹیلی فون) "دور شبیہ" (ٹیلی فوٹو) یا "دور تحریر" (ٹیلی گرام) مقبول نہیں ہو ہو سکتے۔ یہ تو عام اشیاء سے متعلق اصطلاحات کی بات ہے، لیکن معاملہ جب مذہبی یا تہذیبی امور کا ہو تو ان سے وابستہ شدید جذبات کی بنا پر تبدیلی سے متعلق ذہنی عمل مزید دشوار ہو جاتا ہے۔ اصطلاح سازی ہمارا ہی مسئلہ نہیں کہ ایشیا کی بیشتر زبانوں کا یہی مسئلہ ہے۔ بلکہ ترقی یافتہ ممالک بھی کسی نہ کسی حد تک اس مسئلہ سے دوچار ہوتے ہوں گے۔ گویا یہ ایک بین الاقوامی مسئلہ ہے۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ ہر زبان کے اپنے مخصوص لسانی ڈھانچے کے اندر رہتے ہوئے اور اپنی مخصوص مذہبی، تہذیبی، ثقافتی روایات اور ضروریات کو ملحوظ رکھتے ہوئے اصطلاح سازی کی جاتی ہے۔ ہم معرّب اصطلاحات بے شک نہ وضع کریں، لیکن ہم غیر اسلامی اصطلاحات مروج نہیں کر سکتے۔ خنزیر سے پاکستانی مسلمانوں کی نفرت اور کراہت عیاں ہے۔ اس لیے اس سے متعلق کسی طرح کے الفاظ کی اصطلاح ناپسندیدہ ہو گی۔

اب ایران کی مثال لیجیے۔ جہاں ہمارے برعکس عربی الفاظ پر مشتمل اصطلاحات ناقابل قبول ہوں گی وہ فرانسیسی۔ انگریزی یا دیگر زبانوں کے الفاظ کو تو مُفرّس بنا لیتے ہیں۔ جیسے پوسٹ کا پُست مگر عربی سے لفظ نہ لیں گے یہ ان کا قومی تعصب ہے۔ جب سرکاری

سطح پر تراجم اور اصطلاحات میں معیار بندی کے لیے اپریل ۱۹۳۵ء میں "فرہنگستان" کے نام سے وزارتِ تعلیم کے زیرِ اہتمام ادارہ کی تشکیل کی گئی تو انہوں نے تخلیق، تحقیق، ترجمہ اور اصطلاحات کے ضمن میں جو اصول وضع کیے ان میں سے دو اصول یہ بھی تھے: "جہاں تک ممکن ہو۔ زندگی کے ہر شعبہ میں فارسی اصطلاحات و الفاظ اختیار کرنا۔ اور "ناپسندیدہ خارجی الفاظ سے زبان کو پاک کرنا"[26]

چنانچہ فرہنگستان نے فرانسیسی اور دیگر یورپین الفاظ کو تو قبول کر لیا لیکن "ان کے غیر ہونے کا تصور عربی الفاظ کو نکالنے پر منحصر تھا"[27]۔ اس لیے فرہنگستان کا بیشتر وقت عربی کلمات کو فارسی زبان سے خارج کرنے اور فارسی مترادفات کے چناؤ کی نذر ہو گیا"[28]۔ خود فرہنگستان کے طے کردہ طریق کار کے لیے رہنما اصولوں میں "عربی الفاظ کو ترک کرنا" بھی شامل تھا۔ اس کا علمی سطح پر جو منطقی نتیجہ نکلا ہوگا اُسے واضح کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس معاملے میں ایرانیوں کے رویے کا اندازہ ایک اور مثال سے بھی لگایا جا سکتا ہے۔ جب شہنشاہ ایران نے اپنی تاجپوشی کا اہتمام کیا تو صرف ایک کمیٹی اس لیے تشکیل دی گئی کہ وہ ملکہ کا فارسی مترادف تلاش کرے۔ جس نے شاہ بانو تجویز کیا اور سرکاری طور پر بھی اپنایا گیا اسی طرح اُردو کے تعصب میں ہندوستان میں عربی فارسی الفاظ ترک کر کے اُن کی جگہ سنسکرت اصطلاحات اور الفاظ لانے کی سرکاری پالیسی کے نتیجے میں وہ سرکاری زبان کو اجنبی زبان بنا لینے میں یقیناً کامیاب ہو گئے ہوں گے، لیکن کیا اِسے عوامی مقبولیت بھی حاصل ہو سکی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ کیا ایک بہت بڑی قدیم اور جامع زبان سے تعلق منقطع کر لینے سے وہ خود کتنا بڑا لسانی زیان کرتے ہیں۔ اسے بھی مدِنظر رکھا گیا کہ نہیں؟ یہ ایران کے لیے بھی اتنا ہی درست ہے، جتنا بھارت کیلئے۔ ان ممالک پر نکتہ چینی مقصود نہیں بلکہ حکومتوں میں زبانوں کے بارے میں پائے جانے والے تعصبات کی طرف اشارہ مقصود تھا۔ دوسری طرف یہودی ہیں جنہوں نے مردہ عبرانی کو زندہ کر کے اسے مملکت دفاتر تعلیم اور روزمرہ کے معمولات کی

زبان بنا دیا۔

اردو میں اصطلاح سازی

اردو میں وضع اصطلاحات اور اس سے وابستہ مسائل کو تراجم جتنا ہی قدیم سمجھا جانا چاہیئے۔ جس مترجم نے پہلی مرتبہ کسی علمی کتاب کا ترجمہ کیا ہوگا اسی دن سے اصطلاح سازی کا آغاز ہو گیا ہوگا۔ یہ انفرادی سطح پر ہو یا اجتماعی سطح پر اس سے فرق نہیں پڑتا۔ البتہ اجتماعی صورت کیوں کہ کسی ادارہ سے وابستہ ہوتی ہے۔ اس لیے معیار بندی ممکن ہو جاتی ہے۔ قیامِ پاکستان سے قبل جامعہ عثمانیہ اور انجمن ترقی اردو کی اصطلاحات معیاری تصور کی جاتی تھیں۔

وضع اصطلاحات اور پھر ان کی افادیت کے بارے میں یہ بات غور طلب ہے کہ لسانی اصولوں سے مطابقت کے باوجود بھی کسی اصطلاح کا زبانِ زدِ عوام ہو جانا لازم نہیں کیونکہ عوام کی زبان پر چڑھنے کے لیے اصطلاح کا سہل اور مختصر ہونا بنیادی شرط ہے اسی لیے دقیق اصطلاحات ماہرین کی تحریروں میں تو جگہ پا سکتی ہیں، لیکن عوام کی زبان سے بالعموم دور ہی رہتی ہیں۔ اسے اس مثال سے سمجھئے: اکاؤنٹنٹ جنرل کا دفتر ایسا ہے جس سے ہر سرکاری ملازم کو کام پڑتا ہے حتیٰ کہ بعض اوقات تو مرنے کے بعد بھی اس دفتر سے پیچھا نہیں چھٹتا اکاؤنٹنٹ جنرل کے لیے مندرجہ ذیل اصطلاحات وضع کی جا چکی ہیں:

"ناظم حسابات، ناظم اعلیٰ حسابات، محاسب اعلیٰ، صدر محاسب، منہیب اعلیٰ، مہتمم اعلیٰ، میر محاسب، میر بخشی، محتسبِ اعلیٰ، حساب دار اعلیٰ"۔[۲۳]

مگر ان میں سے ایک اصطلاح بھی عوام کی زبان پر نہ چڑھ سکی وہ تو اکاؤنٹنٹ جنرل بلکہ اے جی کہنا ہی پسند کرتے ہیں۔ یوں عوامی سطح پر جب اصطلاحات مسترد ہوں تو پھر سارا عمل ہی بے مصرف نظر آتا ہے اور یہ انگریزی یا غیر ملکی الفاظ کے معرّب یا مفرّس ترجمے کے

صورت میں ہوتا ہے اور اسی استدلال سے تقویت ملتی ہے کہ اصطلاحات اصل صورت میں استعمال ہونی چاہئیں۔

اصطلاح سازی کے لیے مقرر کیے گئے راہنما اصولوں کی اہمیت مسلّم ـــ ان سب مباحث کی اساس ان دو بنیادی نکات پر استوار نظر آتی ہے:

۱۔ کیا انگریزی یا دیگر زبانوں سے مستعار اصطلاحات کو بعینہٖ استعمال کیا جانا چاہیئے؛

۲۔ یا ان کا معرّب یا مفرّس ترجمہ ہونا چاہیئے؛

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو غالباً اس سے کسی کو بھی اختلاف نہ ہوگا کہ اُردو زبان کے لسانی ڈھانچے میں اتنی لچک پائی جاتی ہے کہ وہ ہر نوع کے الفاظ کے درست املا پر قادر ہے اور اُردو بولنے والے ان کے درست تلفظ کے اہل ہیں تو کیوں نہ تمام اصطلاحات کو ان کی اصل صورت میں قبول کر کے ترجمے اور بالخصوص غلط، ناموزوں اور گمراہ کن تراجم کے نتیجہ میں جنم لینے والی الجھنوں سے نجات حاصل کر لیں۔ رہا اصطلاحات کے مفرّس یا معرّب تراجم کا مسئلہ تو اگرچہ عربی زبان الفاظ و اصطلاحات اور مترادفات کی صورت میں وسیع ذخیرۂ الفاظ کی حامل ہے اور پھر اس سے ہمارا مذہبی رابطہ بھی ہے۔ ادھر فارسی سے ہمارا تہذیبی اور ادبی تعلق رہا ہے لیکن معرّب اور مفرّس تراجم کے سلسلے میں یہ اہم حقیقت بالعموم فراموش کر دی جاتی ہے کہ عربی اصطلاحات آج سے چار پانچ صدیوں پہلے کے علوم و فنون سے متعلق ہیں اور اپنی تمام ترجامعیت کے باوجود عربی جدید دور کی سائنسی اور تکنیکی ضروریات کا ساتھ دینے کی اہل نہیں یہی وجہ ہے کہ خود مصر، شام اور عراق میں بھی تازہ ترین اصطلاحات کے تراجم کا مسئلہ درپیش ہے۔ اس لیے آج محض عربی یا فارسی کے تراجم پر انحصار چنداں سود مند نہیں دیکھا جائے تو اصطلاح سازی سے وابستہ بیشتر مباحث محض عربی فارسی تراجم کے باعث ہی پیدا ہوئے۔ انگریزی اصطلاحات اصل صورت میں تسلیم کر لی جائیں تو تمام بحثیں، الجھنیں اور مسائل خود بخود ختم ہو جاتے ہیں گذشتہ صفحات میں اکاونٹنٹ جنرل

کی مثال سے واضح کیا جا چکا ہے کہ ماہرین کی وضع کردہ اصطلاحات نامقبول رہیں رہیں اور عوام اصل انگریزی لفظ کے استعمال ہی کو ترجیح دیتے رہے۔ یہ محض ایک مثال ہے ورنہ اس انداز کی لاتعداد مثالیں مل سکتی ہیں۔ اُردو کے اہلِ علم و فکر، محققین، مترجمین اور ماہرین لسانیات نے ایک صدی ان تراجم میں تراجم میں صرف کردی مگر اصلاحات کے تراجم کا تنوع ہی عدم معیار کا منظہر بھی ہے۔

وضع اصطلاحات سے متعلق اصول و قواعد کے ضمن میں سید وحیدالدین سلیم کی تالیف "وضع اصطلاحات" (حیدرآباد دکن ۱۹۲۱ء) اس موضوع پر اولین اور بنیادی کتاب تصوّر ہوتی ہے اور اس موضوع پر کام کرنے والے حضرات کے لیے اس سے صرفِ نظر ممکن نہیں۔ ۱۹۹۳ء میں اس کتاب کی اشاعت ۷۲ برس ہونے کو آئے ہیں۔ ان کے بعد مولوی عبدالحق، برج موہن۔ دتاتریا کیفی۔ سید سلیمان ندوی، مسعود حسن رضوی ادیب۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم اور متعدد اہلِ قلم نے خامہ فرسائی کی۔ پاکستان میں ڈاکٹر سیّد عبداللہ، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر مان فتح پوری جیسے اصحاب نے قلم اٹھایا اور اب اس مد میں خاصہ کام ہو گیا ہے۔

پاکستان میں اصطلاح سازی کے ضمن میں ہمیں اپنے مخصوص حالات کی روشنی میں ایک لائحہ عمل مرتب کرنے کی ضرورت ہے۔ پاکستان میں اس وقت مترجمین کی انفرادی کوششوں کے ساتھ ساتھ سرکاری سطح پر کئی ادارے فعال ہیں مثلاً اردو کالج (کراچی ۱۹۴۹ء) مجلسِ ترقی ادب لاہور ۱۹۵۰ء)، سائنٹیفک سوسائٹی (کراچی ۱۹۵۵ء)، مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی (لاہور ۱۹۵۶ء)، ترقی اُردو بورڈ (کراچی ۱۹۵۸ء)، مرکزی اُردو بورڈ اب سائنس بورڈ (لاہور ۱۹۶۲ء) - مجلس زبان دفتری حکومت پنجاب (لاہور ۱۹۴۹ء) مقتدرہ قومی زبان (اسلام آباد ۱۹۷۹ء)، ادارہ تالیف و ترجمہ پنجاب یونیورسٹی (لاہور) شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ یونیورسٹی (کراچی ۱۹۵۶ء)۔

اس ضمن میں مفصل معلومات کے لیے ملاحظہ کیجیے :
"پاکستان میں اُردو کے ترقیاتی ادارے" از پروفیسر ایوب صابر۔
اصطلاحات کے موضوع سے دلچسپی رکھنے والے حضرات مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کر سکتے ہیں :

مولوی عبدالحق " اردو زبان میں علمی اصطلاحات کا مسئلہ" کراچی ۱۹۴۹ء
سیّد وحیدالدین سلیم "وضع اصطلاحات" حیدر آباد دکن ۱۹۲۱ء
ڈاکٹر سیّد عبداللہ "وضع و استنادِ اصطلاحات" (پمفلٹ) اسلام آباد ۱۹۸۴ء
اعجاز راہی "تحقیق اور اصول وضع اصطلاحات پر منتخب مقالات"، اسلام آباد ۱۹۸۶ء
ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہانپوری "اُردو اصطلاحات سازی : کتابیات" اسلام آباد ۱۹۸۴ء
محمد طاہر منصوری "عربی اصطلاحات سازی کتابیات" اسلام آباد ۱۹۸۵ء
عارف نوشاہی " فارسی اصطلاحات سازی :
ڈاکٹر مہر نور محمد خان " کتابیات" اسلام آباد ۱۹۸۵ء
ڈاکٹر مہر نور محمد "ایران میں وضع اصطلاحات کے اصول" (پمفلٹ) اسلام آباد ۱۹۸۵ء
شکیل منگلوری " مقتدرہ قومی زبان اور اصطلاح سازی" (پمفلٹ) اسلام آباد ۱۹۸۷ء
طارق محمود " جامعہ کراچی میں اُردو" (پمفلٹ) اسلام آباد ۱۹۸۶ء
ڈاکٹر سید سلطان محمود "مغربی ممالک میں ترجمے کے قومی اور عالمی مراکز" اسلام آباد ۱۹۸۶ء
خورشید یوسف " مشینی ترجمے کا ماضی اور مستقبل" (پمفلٹ) اسلام آباد ۱۹۸۶ء
ڈاکٹر ابواللیث صدیقی " لسانی مطالعے میں شماریاتی امدادی طریقوں کا استعمال" (مقالہ) سیپ شمارہ ۶ کراچی
ڈاکٹر سلیم اختر "اردو اصطلاح سازی : تاریخ، مسائل، مباحث" لاہور ۱۹۹۳ء
ڈاکٹر عطش درانی "اردو اصطلاحات سازی" اسلام آباد ۱۹۹۳ء

حواشی

۱۔ "مومنین انشائیہ اور انشائیہ نگاری" فنون، لاہور۔ جولائی اگست ۱۹۸۲ء

۲۔ "ایران اور ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر"۔ ص ۳۲

۳۔ "تمدنِ عرب" ص ۵۱۳

۴۔ "ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر" دیباچہ از مترجم ص ۲۰

۵۔ تمام کوائف "ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر" سے ماخوذ

۶۔ "داستانِ تاریخ اردو" طبع سوم ص ۲۴

۷۔ "نمونۂ منشورات" ص ۴۶

۸۔ اس نقطہ نظر سے غالب پر بعض اوقات اعتراضات بھی کیے گئے جن کے جواب کے لیے سید بے خود موہانی کی "گنجینۂ تحقیق" ملاحظہ ہو۔

۹۔ "گنجینۂ تحقیق" ص ۲۶، ۱۱۲

۱۰۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" ص ۲۷۲

۱۱۔ "اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب" ص ۱۷

۱۲۔ "گل کرسٹ اور اس کا عہد" ص ۹۶

۱۳۔ "اردو دنیا کا پہلا بین الاقوامی شہری" از ڈاکٹر مرزا حامد بیگ مطبوعہ "ماہ نو" لاہور ستمبر ۱۹۸۸ء

۱۴۔ "نیرنگِ خیال" دیباچہ ص ۱۰

۱۵۔ "نظم آزاد" ص ۴۶

۱۶۔ " " ص ۵۰

۱۷۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو:

۱۔ احمد عبداللہ قدوسی۔ "مملکت حیدر آباد ایک علمی ادبی اور ثقافتی ادارہ" کراچی ۱۹۶۷ء

۲۔ محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی "الفہرست" حیدر آباد دکن ۱۹۳۲ء

۳۔ میر حسن ایم اے: "مغربی تصانیف کے اُردو تراجم" حیدر آباد دکن ۱۹۳۹ء

۴۔ ڈاکٹر مرزا حامد بیگ "کتابیات تراجم" اسلام آباد ۱۹۸۶ء، ۱۹۸۷ء

۱۸۔ "خطوط رشید احمد صدیقی" مرتبہ لطیف الزمان خاں، ص ۲۴۹ - ۲۵۰

۱۹ "سجاد حیدر یلدرم اور اُن کے ترکی تراجم" مطبوعہ "ماہ نو" لاہور جون ۱۹۸۸ء

۲۰ صدیق الرحمٰن قدوائی "ماسٹر رام چندر" مقدمہ ص ۴۶

۲۱۔ "مقالاتِ سرسیّد" (حصّہ دہم) مرتبہ محمد اسماعیل پانی پتی ص ۸۶

۲۲۔ ڈاکٹر محمد صادق "محمد حسین آزاد احوال و آثار" ص ۷۶۔ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے کے لیے راقم کی کتاب "انشائیہ کی بنیاد" کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

۲۳۔ "وضع اصطلاحات": ص ۱۷۱

۲۴۔ "منشورات" ص ۳۷

۲۵۔ مزید تفصیلات کے لیے ملاحظہ ہو راقم کی کتاب "نفسیاتی تنقید" لاہور ۱۹۸۶ء

۲۶۔ ڈاکٹر مہر نور محمد "ایران میں وضع اصطلاحات کے اصول" ص ۱۰

۲۷۔ ایضاً " ص ۱۸

۲۸۔ ایضاً " ص ۲۱

۲۹۔ اس ضمن میں رشید احمد صدیقی نے آج سے ۴۵ برس قبل بڑے پتے کی بات کی۔ انہوں نے کل ہند اردو کانگرس حیدر آباد دکن کے تیسرے اجلاس "اصلاحِ زبان و مصلحات اردو" میں خطبہ صدارت دیتے ہوئے کہا:

"خالص علمی اصطلاحات کو اگر عوام نہ سمجھیں تو کوئی مضائقہ کی بات نہیں ہے

اور عوام کی اصطلاحات خواص کو نہ بھائیں تو اس کا ماتم بھی نہ کرنا چاہیے، البتہ یہ نہ ہونا
چاہیئے کہ علمی اصطلاحات خود خواص کی سمجھ میں نہ آئیں تو عوام کی اصطلاحات مضحکہ خیز
بن جائیں۔ نئی اصطلاحات کے بنانے کے لیے اٹھارویں اور انیسویں صدی کا ذہن
نہیں بلکہ بیسویں صدی کا ذہن درکار ہے جو نہ ہندی کو اچھوت سمجھتا ہے اور نہ
خالص عربیت کا مداح ہے۔" (ادبی دنیا لاہور ستمبر ۱۹۴۴ء)

۳۰۔ "اخبار اردو" اسلام آباد ستمبر ۱۹۸۵ء۔

اُردو لسانیات: نگاہِ بازگشت اور مستقبل

افعی کی زبان

قصہ آدم کو رنگینی اگرچہ افعی سے ملتی ہے۔ مگر کیا اس سوال نے آپ حضرات کو کبھی بے چین نہیں کیا کہ گہری نیند سے بیداری کے بعد جب آدم نے حوّا کو پہلو میں پایا تو کلمہ استعجاب، حرف تحسین اور لفظ شناسائی کا کیسے اظہار کیا ہوگا؟ باغ عدن میں سیر گل سے لطف اندوز ہوتے ہوئے آدم حوّا سے کسی اسلوب میں محو کلام ہوتا ہوگا۔ حوّا کو بہکاتے وقت سانپ نے کیسی چکنی چپڑی زبان استعمال کی ہوگی کہ حوّا بہکاوے میں آگئی اور پھر عریانیٔ تن پر خُدا کے حضور کن الفاظ میں طالب عفو ہوئے ہوں گے۔

یہ اور اس نوع کے سوالات گو آج ہمیں بہت دور، بہت ہی دور محسوس ہوتے ہوں بلکہ پُرشور لاؤڈ سپیکروں کے پیدا کردہ "صوتی دھماکہ" کے عہد میں شاید بے محل اور بے سود بھی نظر آئیں۔ مگر ایسے سوالات کی اہمیت ایک طرف ان کے اساسی ہونے میں مضمر ہے تو دوسری جانب ایسے سوالات کا تعلق اساسی لسانی سانچوں اور مرد عورت کی نفسیات سے بھی بنتا ہے یوں ان سے صرف نظر ممکن نہیں۔ عہد نامۂ عتیق کے بموجب:

" ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا......
کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی اس میں زندگی تھی اور وہ زندہ آدمیوں کا نور تھا اور نور تاریکی میں چمکتا ہے"۔ (یوحنا: باب اوّل)

آدم مسجود ملائک کیوں بنا؟ اس لیے کہ تمام اشیاء کے ناموں سے واقف تھا۔ غارِ حرا میں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پہلی وحی کا اوّلین لفظ کیا تھا...... " اقراء!"

زبان مطالعۂ زبان اور لسانیات کے ضمن میں لفظ سے وابستہ مسائل و مباحث کے ساتھ قدامت لفظ اور حرمت لفظ جیسے مباحث بھی شامل ہو جاتے ہیں۔ دنیا کی بیشتر قدیم تہذیبوں اور عتیق تمدنوں میں زبانوں کی اساطیری اساس ملتی ہے۔ چنانچہ زبان تخلیق اور فنون لطیفہ کی سرپرست خصوصی دیویاں یا دیوتا ہوتے تھے جیسے یونانیوں میں "میوز" (MUSE) ہندوؤں میں سرسوتی، مصریوں میں تحوت (THOTH) یہودیوں میں حضرت ادریس علیہ السلام سے رسم الخط کی ایجاد منسوب کی جاتی ہے۔)

قدیم زمانہ کے ناخواندہ افراد کے لیے الفاظ کے متنوع اور تخلیقی استعمالات پر قادر شخصیات بھی اسی لیے کسی حد تک پراسرار یا مافوق الفطرت حیثیت اختیار کر جاتی ہوں گی۔ پجاری مندر میں اشلوک پڑھ کر دیوتا سے ہمکلام ہوتا۔ ساحر منتروں کی شکتی سے ناممکن کو ممکن کر دکھاتا جبکہ شاعر الفاظ کی حسن ترتیب اور استعارہ کے تحیّر سے دل کی اُمنگیں بیدار کر دیتا۔ ایسے میں اگر افلاطون نے تخلیق کا باعث "القائی دیوانگی" (INSPIRED MADNESS) کو قرار دیا اہل ایمان نے شعراء کو تلمیذ الرحمٰن کہا اور غالب نے یہ دعویٰ کیا۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

تو اسے غلط نہ سمجھنا چاہیئے کہ لفظ میں بڑی تاثیر ہے۔ بڑی قوت ہے اور بڑا طلسم ہے۔ لفظ کا حسن استعمال تلوار کی دھار پر چلنے کا عمل ہے اور یہ جو فصاحت اور بلاغت کے مباحث ملتے ہیں تو یہ گویا لفظ کی دھار کی تیزی کی پرکھ کے معیار ہیں

صریر خامہ: شاعر نے عناصر کے ظہور ترتیب کو زندگی قرار دیا تھا، اسی طرح الفاظ کے ظہور ترتیب میں حسن ترتیب اور ترتیب نو کے سلسلوں کو زبان قرار دیا جا سکتا ہے جبکہ لفظ اور لفظ شناسی سے وابستہ فنی امور لسانیات کے علم کی تشکیل کا باعث بنتے ہیں۔ یہی ہے لسانیات کی مختصر ترین الفاظ میں تعریف۔ اور یہ جو زبان

سے متعلق دیگر مباحث ملتے ہیں. جیسے زبان کا آغاز، نشو و نما، ارتقائی مدارج، اشتقاقیات، متروکات، دخیل الفاظ، غریب الفاظ، اصوات، مخارج، تلفظ، املا، اعراب وغیرہ تو یہ سب لفظ کی مختصر ترین حکایت میں طویل فٹ نوٹس کی حیثیت رکھتے ہیں.

عالمی لسانی تناظر میں اردو لسانیات خاصی کم عمر نظر آتی ہے اور ایسا ہی ہونا چاہیئے تھا جس زبان میں ۱۹۹۵ء تک سلیس نثر کی عمر ۱۹۴ برس (باغ و بہار" سنہ اشاعت ۱۸۰۱ء) ناول کی عمر ۱۲۶ برس (مراۃ العروس" سنہ اشاعت: ۱۸۶۹ء) اور تنقید کی عمر ۱۰۳ برس (مقدمہ شعر و شاعری" سنہ اشاعت ۱۸۹۳ء) اور دیگر اصناف کی صدی سے بھی کم عمر بنتی ہو تو لسانیات کی عمر ان سے کم ہی ہونی چاہیئے تھی تاہم تذکروں میں منتشر بعض لسانی اشارات، سراج الدین علی خان آرزو کی لغت "نوادر الالفاظ" (۱۱۶۵ھ/۱۷۵۶ء) شیخ ظہور الدین حاتم کے "دیوان زادہ" (۱۱۶۹ھ/۱۷۶۰ء) اور انشاء/ مرزا قتیل کی فارسی تالیف "دریائے لطافت" (تحریر: ۱۸۰۸ء اشاعت ۱۸۴۹ء) کو ملحوظ رکھتے ہیں تو یہ دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ اردو میں مغربی محققین جیسا مربوط لسانی علم نہ ملتا ہو پھر بھی ہمارے شعراء اور ہمارے زبان داں حضرات لسانی شعور سے قطعاً بے بہرہ نہ تھے. لفظ کی ذائقہ شناسی کے بغیر اچھی شاعری ممکن نہیں، اور الفاظ کا دسترخواں کیا ہے؟ لسانیات!

تاہم یہ بھی تسلیم کہ بطور علم اردو لسانیات کا جلد ظہور اس لیئے بھی ممکن نہ تھا کہ پرانے زمانے میں زبان و بیان سے وابستہ جملہ مباحث کے لیے علم بیان اور بدیع موجود تھے. جو اس عہد کے مخصوص شعری تقاضوں کی تسکین کے لیے مناسب اور موزوں تھے. اس کے ساتھ لغت اور تشبیہ و استعارہ کی بحثیں زبان کے تخلیقی استعمال کے حوالے سے خاصی مفید ثابت ہوتی ہوں گی. زبان و بیان، لفظ و معنی اور اسلوب کے حوالہ سے بعض معروف شعراء کی تعلیاں بھی لسانی نقطہ نظر سے قابل توجہ ہیں جیسے قائم کا یہ دعویٰ:

قائم میں غزل طور کیا ریختہ ورنہ
اک بات لچر سی بزبانِ دکنی تھی

ایہام کے سلسلے میں حاتم کا یہ کہنا :

کہتا ہے صاف و شستہ سخن بس کہ ہے تلاش
حاتم کو اس سبب نہیں ایہام پر نگاہ

آتش کا اسلوب سازی کے بارے میں یہ تصوّر :

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتشِ مرصّع ساز کا

کلاسیکی غزل میں "لفظ تازہ" کی تلاش، متروکات کا عمل، اسلوب کا بتدریج مفرس بننا اور لفظ و معنی کے مباحث، یہ سب کسی نہ کسی طرح کے لسانی شعور کے بغیر ناممکن تھے ہر چند کہ اصطلاح کے معروف اور مروج مفہوم میں یہ لسانیات کا علم بھی نہیں قرار پاتا۔ ہمارے شعراء کا لسانی شعور انفرادی ذوق سخن کے ساتھ ساتھ زبان سے وابستہ عصری تقاضوں اور لفظ کے بارے میں اجتماعی رویوں کے عین مطابق ہوتا ہے۔ لفظ کی سیتا کے لیے لچھمن ریکھا الانگنی آسان نہ تھی۔ دہلی اور لکھنؤ کے حوالہ سے زبان و بیان اور اظہار و اسالیب کے ضمن میں جن مباحث نے جنم لیا ان کا بنیادی سبب بھی لفظ کے بارے میں مروج اجتماعی رویّہ ہی تھا۔ جب میرامن کے" ولی کا روڑہ" ہونے پر رجب علی بیگ سرور نے تاؤ میں آکر" باغ و بہار" کی سلاست کا جواب "فسانہ عجائب" کی مرصع، مقفیٰ اور مسجع نثر کی صورت میں دیا تو محرک یہی احساس تھا۔ علامہ اقبال کی زبان پر اہل زبان کے اعتراضات کا بھی یہی باعث تھا۔

اپنے تخلیقی سرمایہ پر نگاہ ڈالنے سے احساس ہوتا ہے کہ معروف شعری اصناف فارسی سے مستعار ہیں جبکہ زیادہ تر نثری اصناف انگریزی راج کی برکتوں میں سے ہیں۔ ناول، افسانہ، تنقید وغیرہ اساسی طور سے انگریزی سے درآمدہ ہیں اسی لیے صدی سے زیادہ عرصہ بیت

جانے کے باوجود بھی اُردو ناقدین انگریزی پیمانوں سے ان اصناف میں تخلیقی کاوشوں کی تحسین کرتے اور وہاں کے دانشوروں اور ناقدین کی آراء سے اپنا مقالہ سجاتے ہیں اور یہی حال لسانیات کا بھی ہے کہ اس ضمن میں اوّلین اور اساسی کام بھی انگریزوں ہی کا ملتا ہے جیسے سر جارج ابراہیم گریرسن کی "LINGUISTIC SURVEY OF INDIA" (1901) جو آج بھی اس موضوع پر بنیادی ماخذ کی حیثیت رکھتی ہے اس میں ہندوستان کی ۱۷۹ زبانوں اور ۵۴۴ بولیوں کا تجزیاتی مطالعہ کیا گیا ہے۔

بنیادی لسانی مباحث

اُردو کے مولد، آغاز، نشوونما اور نام کے ضمن میں کی گئی تحقیقات نہ صرف اُردو لسانیات کی بنیاد فراہم کرتی ہیں بلکہ سب سے بڑا نظریاتی سرمایہ بھی یہی ہے اس نقطۂ نظر سے اُردو میں لسانیات کے ابتدائی نقوش کے طور پر میر امن کی "باغ و بہار" (۱۸۰۱ء) اور محمد حسین آزاد کی "آبِ حیات" (۱۸۸۰ء) قابلِ ذکر ہیں کہ دونوں نے اُردو کی جنم بھومی کے بارے میں اظہارِ خیال کیا ہے. میر امن نے اس کا آغاز اکبرِ اعظم کے عہد سے کیا تو آزاد کے بقول:

" اُردو زبان برج بھاشا سے نکلی ہے ."

گویا میر امن کی صورت میں ہم اُردو لسانیات کے ابتدائی نقوش کی تلاش میں ۱۸۰۱ء تک جا سکتے ہیں، ہر چند کہ خود میر امن کے ادبی مقاصد میں لسانی تحقیق شامل نہ تھی۔

انشاء اور مرزا قتیل کی " دریائے لطافت" اگرچہ فارسی میں ہے تاہم انشاء نے جودتِ طبع اور اُپج سے کام لیکر اُردو زبان کے الفاظ، محاورات، روزمرہ، بیگمات کی مخصوص بولی، دہلی اور لکھنؤ کا لسانی موازنہ اور ان سے وابستہ بعض تمدنی امور کے بارے میں جو نکتہ آفرینی کی وہ آج بھی قابلِ توجہ ہے "دریائے لطافت" اُردو زبان کے بارے میں ایسے لکھنوی کی کتاب ہے جو وجدانی طور پر لفظ کا ذائقہ شناس تھا اسے زبان فہمی کا ذوق تھا اور وہ اسلوب کی جمالیات کا سلیقہ بھی رکھتا تھا اس لیے لکھنوی ہوتے ہوئے بھی وہ میرؔ سے یوں متاثر ہو سکتا تھا:

سُنا یارات کو قصّہ جو ہیر رانجھا کا
تو اہلِ درد کو پنجابیوں نے لوٹ لیا

انشاء نے "دریائے لطافت" میں لفظ کے بارے میں جس وسیع النظری کا ثبوت دیا وہ اس عہد کی مخصوص شہروں سے مشروط لسانی فضا کے مقابلے میں جدت آفرین بھی ہے اور حیران کو بھی. دیکھئے آج سے ۱۸۷ برس قبل انشاء نے کیسی انقلابی بات کی :

" جاننا چاہیئے کہ جو لفظ اُردو میں آیا وہ اُردو ہو گیا خواہ وہ لفظ عربی ہو یا فارسی ترکی ہو یا سریانی، پنجابی ہو یا پوربی، اصل کی رُو سے غلط ہو یا صحیح، وہ لفظ اُردو کا لفظ ہے اگر اصل کے موافق مستعمل ہے تو بھی صحیح اور اگر اصل کے خلاف ہے تو بھی صحیح، اس کی صحت اور غلطی اس کے اردو میں رواج پکڑنے پر منحصر ہے کیونکہ جو چیز اردو کے خلاف ہے وہ غلط ہے گو اصل میں صحیح ہو اور جو اردو کے موافق ہے وہی صحیح ہے. خواہ اصل میں بھی صحیح نہ ہو ۔"

(ص : ۵۵-۳۵۴)

ہمارے بعض دانشوروں، زبان کے محققین اور لسانی ماہرین میں زبان و بیان، الفاظ کے محل استعمال، تذکیر و تانیث اور واحد جمع وغیرہ کے سلسلہ میں " اصل کی جانب مراجعت " اور طہارت پسندی کا جو رویّہ ملتا ہے. انشاء تقریباً دو صدیاں پیشتر اِس کی نفی میں، اردو زبان کے وسیع النظری پر مبنی تناظر کی تشکیل کی سعی کر رہا تھا. اگرچہ اب لسانیات کے ضمن میں خاصہ کام ہو چکا ہے مگر "دریائے لطافت" کی تاریخی اہمیت ہنوز برقرار ہے اور انہیں تو صرف اس وجہ سے ہی کہ کتاب کے مترجم پنڈت برجموہن دتا تریہ کیفی کے الفاظ میں " یہ پہلی کتاب ہے جو اردو کے علم بیان، گرامر، انشا اور محاورے اور روزمرّہ پر کسی ہندی نے تصنیف کی ":

" دریائے لطافت " کے ۱۱۵ برس کی لمبی چپ کے بعد ۱۹۲۳ء " دکن میں اُردو " اور اس کے پانچ برس بعد " پنجاب میں اُردو " طبع ہوتی ہیں ۔ چنانچہ نصیر الدین ہاشمی اور حافظ محمود شیرانی

کی اس سے ہی اردو لسانیات کا بطور علم اور جدید لسانی تحقیقات کا آغاز سمجھا جا سکتا ہے ۔

ان کے بعد آنے والے ماہرین لسانیات اور زبان کے محققین میں مولوی عبدالحق، سید سلیمان ندوی، پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی، مسعود حسن رضوی ادیب، محی الدین قادری زور، ڈاکٹر مسعود حسین خان، قاضی عبدالودود، ڈاکٹر شوکت سبزواری، رشید حسن خان، ڈاکٹر گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر خلیق انجم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر وحید قریشی، ڈاکٹر فرمان فتحپوری، ڈاکٹر سہیل بخاری، پروفیسر خلیل صدیقی، سید قدرت نقوی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، مشفق خواجہ، جابر علی سید اور عین الحق فرید کوٹی..... الغرض ! تابندہ کی کہکشاں ملتی ہے. ان محققین اور ماہرین کی مساعی سے مخطوطات اور نایاب کتب کی دریافت تو ہوئی. قلمی مسودات DECIPHER کر کے ان کی تدوین حواشی اور تعلیقات سے ان کی قدر و قیمت میں اضافہ کیا گیا. اس تمام مساعی کا ثمر ایسے لسانی مواد، ادبی کوائف، تحقیقی شواہد اور زبان کے بارے میں ایسے مسالہ کی فراہمی ہے جس سے ایک طرف محققین کے لیے خام مواد فراہم ہو گیا تو دوسری طرف تاریخ ادب کے آفاق میں وسعت پیدا ہو گئی ۔

جدید لسانی تحقیقات

اردو لسانیات میں اگرچہ مخطوطات، بیاظین اور قدیم مسودات، ہی لسانی محققین کی کاوشوں کا مرکز و محور نظر آتے ہیں لیکن جدید لسانی تحقیقات کے وسعت پذیر ہوتے ہوئے دائرہ کار میں اب قدیم تاریخ، آثار قدیمہ، خطوط، کتبے، سکے، قدیم مصوری، شاہی فرامین، خطاطی کے مختلف اسالیب، روشنائی اور املا کے متغیر انداز اور اسی نوع کے دیگر شواہد کی اہمیت، ضرورت اور قدر و قیمت بھی تسلیم کی جا رہی ہے ۔ یہی نہیں بلکہ اس نوع کا قدیم تاریخی مواد استعمال کرنے والے محقق سے اس کی توقع بھی رکھی جاتی ہے کہ وہ قلمی مسودات سکوں، کتبوں، خطاطی، فرامین، تصاویر اور املا کی پرکھ کے لیے سائنٹفک معلومات کیساتھ ساتھ تکنیکی مہارت بھی رکھتا ہو تاکہ جعلی شواہد کی چھان پھٹک کر کے ان کے حقیقی ہونے کے ساتھ ساتھ درست زمانہ کا تعین بھی کر سکے ۔ اس مقصد کے لیے محقق کاغذ سازی اور جلد سازی تک کے

بارے میں کچھ نہ کچھ جانتا ہو۔ گویا لسانی محقق کا بھی میر تقی میر کے عاشق جیسا ہی حال ہو جاتا ہے:

اُٹھیں میر تجھ سے ہی یہ خواریاں

نہ بھائی ہماری تو ہمت نہیں

اس معیار پر صرف حافظ محمود شیرانی ہی پورے اترتے ہیں۔ جنہیں آثار قدیمہ، مخطوطہ، کاغذ سازی اور سکوں کی پرکھ کے علاوہ دیگر امور پر بھی دست گاہ حاصل تھی۔ شاید اسی لیے کوئی بھی ماہر لسانیات حافظ محمود شیرانی کی اپج اور اعلیٰ تحقیقی صلاحیتوں تک نہ پہنچ پایا۔ وہ آنے والے محققین کے لیے روشنی کا مینار قرار پائے۔

جدید لسانی تحقیقات میں اب اساطیر اور علم الانسان بھی شامل ہیں کہ ان کی روشنی میں کسی بھی خاص خطہ میں آباد نسل کے افراد کے ان اجتماعی رویوں کو سمجھا جا سکتا ہے زبان جن کی مظہر، عکاس، علامت بن جاتی ہے۔ یورپ کے بعض ممالک (جیسے اسپین، رومانیہ، جرمنی) کے خانہ بدوشوں کی مخصوص زبان میں اردو، ہندی اور پنجابی تک کے الفاظ آج بھی صوتی روپ بدل کر ملتے ہیں تو اُسے حسن اتفاق یا پھر لسانی اتفاق نہیں قرار دیا جا سکتا۔ بلکہ اس کا باعث طویل زمانی فاصلوں پر پھیلے لسانی روابط میں تلاش کیا جا سکتا ہے۔ محی الدین قادری زور "اردو لسانیات" میں لکھتے ہیں کہ "یورپین جپسیوں کی بولیاں ان پراکرتی زبانوں سے مشتق ہیں جو شمال مغربی ہندوستان میں بولی جاتی تھیں ان کا کچھ تعلق پشاچہ زبان سے بھی ہے جپسیوں کے آبا و اجداد پہلی مرتبہ غالباً پانچویں صدی عیسوی میں ہندوستان سے نکلے۔ ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانوں اور جپسیوں کی بولیوں میں ماخذ و اشتقاق کے لحاظ سے نہایت قریبی تعلق ہے" (ص: ۸۱) تمدنی، زمانی اور جغرافیائی بُعد کے باوجود (یا پھر ان کی وجہ سے) اسی نوع کی لسانی تساہتیں غور طلب ہوتی ہیں۔ چنانچہ تقابلی لسانیات ایسے ہی مطالعات کے لیے وقف ہوتی ہے۔

جدید اور جدید تر کے بعد لسانیات کے آلات میں جدید ترین کی بات کریں تو کمپیوٹر سر فہرست نظر آتا ہے۔ روزمرہ کے حساب کتاب سے لے کر خلائی سفر تک میں کمپیوٹر کس کس

طرح سے استعمال ہو رہا ہے۔ اس کی وضاحت کی ضرورت نہ ہونی چاہیئے۔ بہرحال لسانیات کی جدید ترین تکنیک میں کمپیوٹر بھی کارآمد ثابت ہو رہا ہے۔ بالخصوص مسودات کی قدامت اور لفظ شماری جیسے پیچیدہ کاموں میں۔ اگرچہ اس ضمن میں بہت زیادہ کام تو نہیں ہوا۔ تاہم ڈاکٹر ابواللیث صدیقی کے مقالہ" زبانوں کے مطالعہ میں جدید شماریاتی تکنیک کا استعمال کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے" باغ وبہار" کی عبارت کا اس انداز میں جو تجزیاتی مطالعہ کیا وہ خوب ہے (ملاحظہ ہو" ادب اور لسانیات ")

لفظ کا سفر

لفظ کس طرح صدیوں کا سفر طے کرتے ہوئے اپنا صوتی وجود برقرار رکھ کر متغیر تمدنی و تہذیبی اور لسانی معیارات سے ہم آہنگی کی خاطر صوت اور سیرت میں تبدیلی پیدا کرتا جاتا ہے۔ یہ دلچسپ بحث ہے بہت زیادہ دور کی مثالوں کے برعکس اردو حروف تہجی کے مطالعہ سے یہ امر اجاگر ہو جاتا ہے کہ کتنا طویل زمانی اور تہذیبی سفر طے کر کے الف اور بے یا دیگر حروف ہم تک موجودہ صوت میں پہنچ پائے الف یا اے (A) اپنی اصل صوت میں علامتی حیثیت میں بیل کا سر تھا۔ واضح رہے قدیم تہذیبوں اور عتیق زرعی معاشروں میں بیل قوت و توانائی، بارآوری اور جنسی زرخیزی کی علامت سمجھا جاتا رہا ہے۔ اسی لیے قدیم زمانوں میں زرخیزی اور بارآوری کی اجتماعی رسوم کیساتھ ساتھ اسے اساطیری اہمیت بھی حاصل رہی ہے۔ بیل کا قدیم سامی نام" الفا" تھا تصویری رسم الخط میں سر اور سینگوں سمیت اس کی شبیہ بنائی جاتی تھی۔ چنانچہ تین ہزار قبل مسیح مصری ہیرو غلافی میں سینگوں سمیت بیل کا سر بنایا جاتا ہے۔ بعدازاں قدیم قیتانی، فنیقی، عبرانی، سریانی، آرامی، نبطی جیسی قدیم زبانوں میں اختصار کی خاطر ترمیمی عمل سے گزرنے کے بعد عربی کے توسط سے الف اپنی موجودہ صورت میں ہم تک پہنچا ادھر یونانی اور لاطینی زبانوں کے ذریعے سے مغرب میں اے (A) کا سفر جاری رہا۔ آج بھی الف کے مقابلے میں اے بیل کے سر سے زیادہ مشابہت رکھتا ہے اسی طرح ب گھر کی علامت ہے جو فونیقی میں" بیٹا" اور یونانی

میں "بیٹ"، تھا۔ یونانی کے توسط سے حروف تہجی کے لیے حاصل ہونے والی اصطلاح "الفابیٹا" اپنی اصل میں فونیقی ہے۔[۲۲]

یہ تو تھے حروف تہجی اسی انداز پر دنیا کی مختلف زبانوں میں بعض اوقات جو مشترک الصوت الفاظ مل جاتے ہیں تو یونہی اٹکل پچو طریقہ پر نہیں ہو جاتا۔ بلکہ اس کے پیچھے بھی صدیوں کا لسانی تال میل ہوتا ہے۔ اس پر گفتگو کرتے ہوئے ہم آریاؤں اور ہزاروں برس قبل دنیا کے مختلف خطوں میں ان کی آمد اور آبادکاری جیسے نزاعی مسئلہ سے دوچار ہو جاتے ہیں۔ تاہم اب بیشتر لسانی محققین کے بموجب INDO-EUROPEAN/INDO-GERMANIC زبانیں مشترک الاصل ہیں۔ ادھر اردو، سنسکرت، فارسی، یونانی، اور لاطینی کے بعض الفاظ کی صوتی مشابہت خالی از علت نہیں۔ چند مثالیں پیش ہیں۔

اردو	سنسکرت	فارسی	یونانی	لاطینی
ماں	ماتر / ماتا	مادر	میتر	ماتر
باپ	پتیر / پیتا	پدر	پاتر	پتیر
بھائی	بھواتر	برادر	بھراتر	فواتر
بیٹی	دوھتر	دختر	تھنختر	
دانت	دانت	دندان	دنتوس	دینت
پاؤں	پد	پاء	پاؤس	پیس

یہ تو تھی تقابلی لسانیات کی ایک بہت ہی ہلکی سی جھلک۔ جہاں تک اردو زبان کا تعلق ہے تو اس کے بہت سے ایسے الفاظ جو دن رات ہماری گفتگو کا حصہ بنے رہتے ہیں مگر ہمیں یہ علم نہیں کہ یہ الفاظ ہزاروں برس قبل کی زبانی مسافت طے کرنے کے بعد ہماری

---

[۲۲] "اردو زبان کی قدیم تاریخ" ص ۔ ۲۱۰)

زبان کا مستقل حصہ بننے کے اہل ثابت ہوئے جیسے نانا، نانی، ماما، مامی، پھوپھا، پھوپھو، سالا، سالی، بر (دولہا)، پیڑھی (نسل) نتھ، گہنا، آنچل، دھنّہ، توڑا، کوس، بڑ، دھتورا، ککڑی، کریلا، نیم، آوا، بھٹی، پلیدا، ڈنڈا، برچھا، ڈھال، بوھنی، کھوجی، جھونپڑی، پھاٹک، جھاڑو، چھیلا، چتر، ڈھیل، ڈھارس، ڈھیٹ، مورکھ، منڈل، (اردو زبان کی قدیم تاریخ" ص: ۳۱۵-۱۰۶) اور ان جیسے متعدد الفاظ آج کے بھی نہیں، ہندی کے بھی نہیں، سنسکرت کے بھی نہیں۔ داروڑی کے بھی نہیں بلکہ چھ ہزار برس قبل پنجاب میں آباد ہونے والے منڈا قبائل کی زبان کے الفاظ ہیں۔ چھ ہزار برس قبل آباد ہونے والے یہ منڈا کون تھے۔

رشید اختر ندوی" ارض پاکستان کی تاریخ میں لکھتے ہیں۔

" ارض پاکستان کے آباد کار وہ سیاہ فام لوگ تھے جو برفانی عہد میں افریقہ اور ملیشیا سے یہاں پہنچے اور کسی ایک حصے پر نہیں بلکہ پورے ملک میں پھیل گئے..... ارض پاکستان کی سب سے پہلی آبادیاں ان لوگوں کی تھیں جو کہ میری یا منڈا زبانیں بولتے تھے اور جوانڈوچائنا نسل کے ایک گروہ مون کھمبیر سے متعلق تھے" (ص: ۱۷)

جبکہ محمد مجیب کے بموجب" ہندوستان کے وحشی قبیلے دو حصوں میں تقسیم کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو منڈا زبانیں بولتے ہیں۔ چھوٹا ناگپور، سنتھال پرگنوں، مہادیو پہاڑیوں اور صوبہ مدراس کے بعض شمالی خطوں میں ملتے ہیں۔ جیسے کہ سنتھال، گونڈا بھیل، منڈا ھو، دوسرے وہ ہیں جو مون خمیر زبانیں بولتے ہیں اور آسام میں کھاسی پہاڑیوں میں آباد ہیں۔ جیسے کہ ناگ اور کھاسی" (تاریخ تمدن ہند" ص: ۲۴)

دیکھا آپ نے داخلی توانائی کی بنا پر لفظ کیسے ہزاروں برس کی مسافت طے کر کے اپنا وجود برقرار رکھتا ہے اور اسی سے لسانیات کے جدید محقق کی سعی کی وسعت اور حدود کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اردو لسانیات کے ماہرین اور محققین اس چیلنج سے بطریق احسن عہدہ برآ ہو رہے ہیں۔ قدیم تاریخ، اساطیر، عتیق تمدنوں اور آثار قدیمہ سے وابستہ جدید ترین

انکشافات اور تحقیقات کی بنا پر اب ماہرین لسانیات کے پاس لفظ کی ساخت اور زبان کے تشکیلی عناصر کے تجزیاتی مطالعہ کے لیے زیادہ بہتر، کارآمد اور قابل اعتماد آلات موجود ہیں اور ان ہی کے ذریعہ سے اُردو زبان کے نام، آغاز، نشو ونما اور مدارج ارتقاء کے بارے میں چھان بین ہو رہی ہے۔

لسانی نظریات

اُردو لسانیات کے سلسلہ میں اگرچہ خاصا کام ہو چکا ہے اور مسائل و مباحث کے ضمن میں خاصہ تنوع بھی ملتا ہے۔ تاہم ماہرین کی تحقیقی کاوشیں زیادہ تر اُردو زبان کے مختلف ناموں، جائے پیدائش اور آغاز و ارتقاء تک ہی محدود رہی۔ چنانچہ بیشتر اہم اور قابل ذکر محققین کی تحقیقی مساعی کا مرکز و محور یہی مسائل نظر آتے ہیں اس حد تک کہ کبھی کبھی تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ اُردو کے نام اور پیدائش سے متعلق مباحث خارج کر دینے کے بعد لسانیات کے پاس باقی کچھ بھی نہ بچے۔

اُردو زبان کے آغاز کے بارے میں تمام نظریات کو دو گروہوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے

۲۔ اردو زبان کا کسی اور زبان/ بولی سے رشتہ جوڑنا۔ اوّل الذکر گروہ میں حافظ محمود شیرانی (پنجاب میں اُردو) نصیر الدین ہاشمی (دکن میں اردو) اور سلیمان ندوی (نقوش سلیمانی: سندھ) کے نظریات خصوصی شہرت کے حامل ہیں جبکہ موخر الذکر کے ضمن میں محمد حسین آزاد (برج بھاشا) ڈاکٹر شوکت سبزواری (قدیم ویدک بولی) ڈاکٹر مسعود حسین خان (ہریانوی) ڈاکٹر سہیل بخاری (مراٹھی) اور عین الحق فرید کوٹی (دراوڑی) کے اسماء گنوائے جاسکتے ہیں اور ان دونوں گروہوں سے متعلق محققین کی مساعی سے اُردو لسانیات کے تحقیقی ورثہ کی قدر و قیمت طے پاتی ہے۔

تاہم ان تمام نظریات میں شہرت اور اہمیت کے لحاظ سے حافظ محمود شیرانی کا "پنجاب میں اُردو" سرفہرست قرار پاتا ہے۔ اس سلسلہ میں دلچسپ بات یہ کہ جب نصیر الدین ہاشمی نے علامہ اقبال کی خدمت میں "دکن میں اُردو" پیش کی تو انہوں نے اس خیال کا اظہار کیا:

" غالباً پنجاب میں کچھ پرانا مسالہ موجود ہے۔ اگر اس کے جمع کرنے میں

کسی کو کامیابی ہو گی تو مؤرخ اُردو کے لیے نئے سوالات پیدا ہوں گے۔"

(مکتوب، مئی ۱۹۲۵ء)

اگرچہ علامہ اقبال کے خط سے ایک برس قبل شیر علی خان سرخوش کی "اعجاز سخن" (حصہ اوّل) طبع ہو چکی تھی جس میں مؤلف نے اردو زبان پر اہل پنجاب کے حقوق ثابت کئے تھے۔ مگر تحقیق کے برعکس یہ جذباتی کتاب تھی۔ اسی لئے "پنجاب میں اُردو" کا نظریہ حافظ محمود شیرانی ہی سے منسوب ہو کر رہ گیا۔ ہر چند کہ خود شیرانی نے بھی "اعجاز سخن" کا حوالہ دیا ہے

حافظ محمود شیرانی نے "پرانا مسالہ" سے جو نظریہ مدوّن کیا وہ اُردو لسانیات کا سدا بہار نظریہ ثابت ہوا۔ چنانچہ بعد کے تمام لسانی محققین نے جزوی اختلافات کے باوجود بھی ڈاکٹر شوکت سبزواری کی مانند کھلے دل سے ان کی مساعی کا اعتراف کیا:

"..... مولانا شیرانی مرحوم کا اردو دان طبقہ کو شکر گزار ہونا چاہیئے کہ انہوں نے غالباً اُردو میں سب سے پہلے اردو کے چہرہ سے نقاب اٹھا کر اس کے خدّو خال کا گہرا حکیمانہ مطالعہ کیا۔ پنجابی، ہریانوی، برج بھاشا سے اس کا مقابلہ کر کے اردو دان طبقے کو تقابلی لسانیات کی ہلکی سی جھلک دکھائی"[۴]

جبکہ ڈاکٹر خلیق انجم ان الفاظ میں حافظ شیرانی کو خراج تحسین پیش کرتے ہیں:

"اُردو کے پہلے باقاعدہ محقق ہونے کا شرف حافظ محمود شیرانی کو حاصل ہے آپ اعلیٰ ترین تحقیق کے لیے کوئی بھی مغربی یا مشرقی معیار قائم کریں۔ حافظ محمود شیرانی اس پر پورے اُتریں گے۔ ادبی تحقیق کی حافظ صاحب میں جو صلاحیتیں تھیں اور جو علم انہوں نے حاصل کیا تھا۔ وہ ان سے پہلے کسی کو نصیب ہوا اور نہ ان کے بعد۔"[۵]

حافظ محمود شیرانی کی "پنجاب میں اُردو" کے سنہ اشاعت ۱۹۲۸ء سے آغاز کرنے پر ۱۹۹۵ء تک جدید اُردو لسانیات کی عمر محض ۶۷ برس بنتی ہے جو اُردو زبان کی عمر یا اس کی تخلیقی

عمر کے لحاظ سے کوئی بہت زیادہ نہیں تاہم اس عرصہ میں لسانی محققین نے مخطوطات اور مسودات کی جستجو اور متون کی صحت واصلاح اور پھر ان پر تحقیقی حواشی اور تعلیقات کے سلسلے میں جو مساعی کی وہ قابل قدر بھی ہے اور قابل توجہ بھی۔ لیکن اس سے بھی بڑھ کر اہم اور دوررس نتائج کی حامل اردو زبان کے ناموں، آغاز اور تشکیلی مراحل کے بارے میں لسانی محققین کی ایسی نظریہ سازی ہے جو پُر تنوع ہونے کے ساتھ ساتھ اختراعی صلاحیتوں کی مظہر اور خوب سے خوب تر کی جستجو کی عکاس ہے۔ دیکھا جائے تو ان ہی سے داستان اُردو دلچسپ اور رنگین بنتی ہے۔ تاہم تقریباً نصف صدی کے بیت جانے کے بعد اب تو یوں محسوس ہو رہا ہے گویا اُردو کی ابتدا اور احوال کے سلسلہ میں تازہ نظریات کا در بند ہو چکا ہے۔ اگرچہ پنجاب، دکن اور سندھ کو اُردو کا مولد قرار دینے کے بعد (" بنگال میں اُردو" (وفا راشدی) مدراس میں اردو" (نصیر الدین ہاشمی) بلوچستان میں اُردو "ڈاکٹر انعام الحق کوثر) کشمیر میں اُردو" (حبیب کیفوی)" سلہٹ میں اُردو (عبد الجلیل بسمل)" ریاست میسور میں اُردو (ڈاکٹر آمنہ خاتون/ محمد خان) بمبئی میں اُردو" (ڈاکٹر میمونہ دلوی) اور" بہار میں اردو زبان کا ارتقا۔ (ڈاکٹر اختر اورنیوی) جیسی کتابیں بھی چھپتی رہی ہیں لیکن انہیں اور اس نوع کی دیگر کتابوں کو مخصوص خطہ سے منسوب ادب اور تخلیقات کی تدوین سے زیادہ اور کچھ نہ سمجھنا چاہیئے۔ ان کا اُردو کے آغاز سے وابستہ نظریہ سازی سے کوئی تعلق نہیں۔

جہاں تک اُردو لسانیات میں (کم از کم پاکستان کی حد تک) جدید رجحانات کا تعلق ہے تو اس ضمن میں یہ اساسی امر ذہن نشین رہے کہ لسانیات یا اس نوع کے کسی بھی علم میں جدید تجرباتی یا پیش رو (AVANT GUARDE) قسم کے کام کی تخلیقات کے مقابلے میں رفتار اور کم گنجائش ہوتی ہے جس کی وجہ علم کے مخصوص حدود وامکانات اور پھر ان سے مشروط خام مواد کی کمیابی ہوتی ہے۔ تخلیق اور تحقیق کے باہمی تعلق اور ان میں ترقی کی رفتار کو مالتھس کے فارمولہ کی امداد سے یوں سمجھا جا سکتا ہے کہ تخلیقات کی رفتار "GEOMETRICAL PROGRESSION" یعنی ۱، ۲، ۴، ۸، ۱۶، ۳۲، ۶۴ کی رفتار سے ہوتی ہے

جبکہ ان پر تنقید یا ان کے حوالہ سے تحقیق "MATHEMATICAL PROGRESSION"
یعنی ۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷، ۸، کے مطابق ہوگی۔ مخصوص صلاحیتوں کے حامل ماہرین اور تربیت یافتہ محققین کی بالعموم عدم دستیابی کی بناء پر لسانیات جیسے محدود اور مخصوص شعبہ میں ریاضیاتی رفتار مزید سست ہو جاتی ہے اسی لیے اب فی الحال نظریہ سازی اور اوریجنل تحقیقات کا دروازہ بند نظر آرہا ہے در نظریہ کب تک بند رہتا ہے اور کب کوئی بڑا تخلیقی اور اوریجنل نظریہ ساز آکر کھل جا سم سم کہتا ہے اس کی پیشگوئی ممکن نہیں۔ تاہم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اردو میں لسانی تحقیق کا عمل مکمل طور پر رک چکا ہے میں نے صرف اوریجنل نظریات کے حوالہ سے تعطل کی بات کی تھی ورنہ کسی بھی شعبہ علم میں کارکردگی کا مکمل طور پر کبھی بھی خاتمہ نہیں ہوا کرتا صرف معیار میں نشیب و فراز آیا کرتے ہیں اور تصورات نو میں مد و جذر ! لہٰذا یہ کہا جا سکتا ہے کہ فی الحال اردو لسانیات میں جذر ہے۔

پاکستان کے مقابلہ میں زیادہ تر قدیم درباری اور تہذیبی مراکز بھارت میں ہونے کی وجہ سے مخطوطات اور مسودات کے کھوج و تصحیح متن اور تدوین کے ضمن میں بھی بھارت کے مقابلے میں ہمارے یہاں اوریجنل کام کم ہو رہا ہے۔ اس کمی کو انڈیا آفس (لندن) میں محفوظ قلمی نوادر کی چھان پھٹک سے پورا کیا جا سکتا ہے لیکن مالی امور سمیت اس سلسلے میں متعدد رکاوٹیں موجود ہیں لہٰذا یہ دریچہ بھی بند ہی سمجھئے۔

لسانیات میں تصورِ نو

اب جبکہ اردو لسانیات میں بظاہر نئے کام تصورات اور نظریات کی گنجائش نظر نہیں آتی تو ایسے میں جدید علوم سے اردو لسانیات کو نئی جہات سے روشناس کرایا جا سکتا ہے۔ مضمون کی ابتدا میں اساطیر اور علم الانسان کا تذکرہ کیا تھا ان میں تاریخ عمرانیات اور نفسیات کا مزید اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ ہمارے یہاں گزشتہ چند برس سے صوتیات، اسلوبیات اور ساختیات کا خاصا چرچا ہو رہا ہے یہ سب بھی کسی نہ کسی طرح سے زبان، اس کی اساس اور اس کے متنوع تخلیقی استعمالات

سے تعلق رکھتے ہیں۔ لہٰذا ان کی امداد سے لسانیات میں نیا خون شامل کیا جاسکتا ہے۔

مغرب میں اب لسانیات کا قدیم تصور متروک قرار پاچکا ہے ہمارے ہاں بھی مسائل اور مباحث تعطل کا شکار نظر آرہے ہیں اُردو کی پیدائش کے ضمن میں جتنی موشگافیاں ممکن تھیں تمام ہوئیں ان حالات میں امکانات نو کی دریافت سے لسانیات کے آفاق میں وسعت پیدا کی جاسکتی ہے۔ میں ذاتی طور پر یہ محسوس کر رہا ہوں کہ پاکستان میں لسانیات کی نئی جہت رونما ہو رہی ہے اور یہ ہے اردو اور مختلف خطّوں سے مخصوص قومی زبانوں میں مشترک لسانی امور اور مشترک ذخیرۂ الفاظ کی دریافت اور قومی تناظر میں ان کا مطالعہ، اس ضمن میں کچھ کام ہُوا ہے جیسے یہ کتابیں :-

۱. "اُردو سندھی کے روابط" از شرف الدین اصلاحی۔

۲. "ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلق" از ڈاکٹر مہر عبدالحق۔

۳. "لسانی روابط" از پروفیسر پریشان خٹک۔

۴. "اُردو کے خوابیدہ الفاظ" مرتبہ ادارہ مرکزی اُردو بورڈ لاہور۔

ان چند کتابوں کے پہلو بہ پہلو ڈاکٹر فرمان فتحپوری سے لے کر ڈاکٹر طاہر تونسوی تک متعدد اصحاب نے اردو اور دیگر قومی زبانوں میں اشتراک عمل کو موضوع بنا کر خاصی خیال افروز باتیں کی ہیں تاہم اس سلسلے میں مزید تحقیقات کی توقع بے جا نہ ہوگی۔ بلکہ میں تو اس حد تک جانے کو بھی تیار ہوں کہ محض اردو اور دیگر قومی زبانوں تک خود کو کیوں محدود رکھا جائے۔ اُردو اور دیگر غیر ملکی زبانوں کے مشترک ذخیرۂ الفاظ اور لسانی اشتراک کو کیوں نہ موضوع تحقیق بنایا جائے۔ انصار الدین ابراہیم کی "اُردو ازبیک الفاظ کی مشترک لغت" (۱۹۹۰ء) دیکھی تو خوشی ہوئی کہ ایسا کام بھی ہو رہا ہے۔ تہذیبی، ثقافتی اور تخلیقی سطح پر بین الاقوامی تعلقات کے نقطۂ نظر سے اس نوع کے کام کی اور بھی زیادہ ضرورت ہے۔

آج پاکستان میں لسانی صورت حال کچھ ایسی ہے کہ ایک ایسا طبقہ۔ گو اقلیت ہی

ہیں بھی۔ ملتا ہے جو زبان میں طہارت پسندی کا قائل ہے۔ جس کے بموجب (اور انشاؔ کے برعکس) عربی اور فارسی الفاظ کی املا، تلفظ اور محل استعمال اہل زبان کے اصول و قواعد ہی کے مطابق ہونا چاہیئے اور یہی اُردو کو ضرورت سے زیادہ مفرس اور معرّب بناتے رہتے ہیں۔ یوں یہ لوگ اس بھارتی رویّہ کے متوازی نظر آتے ہیں۔ جس کیمطابق اردو کو سنسکرت نما بناکر" دیوبانی" میں تبدیل کیا جا رہا ہے اس رجحان کا محرک تہذیبی کے برعکس ماضی پرستی اور مذہبیت ہے۔

اس طبقہ کے برعکس اور خاصی تعداد میں مُلّا رموزی کی" گلابی اُردو" بولنے والے لوگ ہیں۔ ان کی گفتگو میں انگریزی الفاظ کی اتنی بھرمار ہوتی ہے کہ مُلّا رموزی کے زمانہ کی" گلابی اردو" اب "آتشی گلابی" اردو میں تبدیل ہو چکی ہے۔

ان دو انتہاؤں کے درمیان ہی، نیم خواندہ یا ناخواندہ افراد کی اکثریت ملتی ہے جن کی زبان میں اُردو کیساتھ ساتھ ان کے علاقہ کی زبان/ بولی اور اس سے متعلق مخصوص الفاظ، ضرب الامثال اور تلمیحات وغیرہ بکثرت ملتی ہیں۔ گویا عرب، ایران، فرانس، انگلستان اور چین وغیرہ کے برعکس ہم عملاً کثیر اللسان ثابت ہو رہے ہیں۔ غالباً اسی لیئے" ہفت زبانی لُغت" کی ضرورت محسوس کی گئی تھی اور اسی سے آج کے لسانی محققین اور ماہرین کے کام کی نوعیت، حدود اور مشکلات کا بھی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ نالہ پابندِ لے نہیں ہے!

حواشی

۱۔ انجمن ترقی اُردو (اورنگ آباد) نے ۱۹۱۴ء میں فارسی متن شائع کیا۔ جبکہ پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی کا اُردو ترجمہ ۱۹۳۵ء میں طبع کیا گیا۔

۲۔ اہلِ دکن کو پنجابیوں نے اور بھی کئی طرح سے لوٹا ہے۔ ملاحظہ ہو۔ بہادر شاہ ظفر کی کلیات جس میں کئی غزلیں نہ صرف پنجابی نما اسلوب میں ملتی ہیں۔ بلکہ بعض غزلوں میں تو سرائیکی الفاظ بھی مل جاتے ہیں۔ مثلاً:-

سُونگھوں جا کر باغ میں جو پھلاں دی بوباس
تیندا باغ بہار دا آنسو نیّں اے میندڑے پاس

۳. مزید معلومات کے لیے عتیق احمد کی "فن تحریر کی تاریخ" ملاحظہ ہو جس میں دیئے گئے چارٹ سے مختلف زبانوں میں حروف کی متغیّر اور مختصر ہوتی صورتوں کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

۴. اُردو زبان کا ارتقاء" صفحہ ب.

۵. مقالہ بعنوان "ہندوستان میں اُردو تحقیق اور تدوین کا کام" مشمولہ "اردو میں اصولِ تحقیق" مرتبہ ڈاکٹر ایم سلطانہ بخش: ص: ۲۲۴ -

— — — — — — —

کتابیات

آرزو، سراج الدین علی خاں — "نوادر الالفاظ" (مرتب ڈاکٹر سید عبداللہ) کراچی، انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۵۱ء

آرزو لکھنوی، سید انوار حسین — "نظام اردو" لکھنؤ اتر پردیش اردو اکادمی - ۱۹۷۹ء

آزاد، جگن ناتھ — "اردو" نئی دہلی مکتبہ جامع طبع ششم ۱۹۶۶ء

آزاد، محمد حسین — "آب حیات" لاہور شیخ مبارک علی ۱۹۵۰ء

"دربارِ اکبری" لاہور سنگ میل پبلی کیشنز۔

مقالات محمد حسین آزاد (مرتبہ آغا محمد باقر) جلد سوم لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۸۷ء

"نظم آزاد" لاہور مکتبہ عالیہ ۱۹۷۸ء

آغا افتخار حسین — "یورپ میں اردو" لاہور مرکزی اردو بورڈ ۱۹۶۸ء

"یورپ میں تحقیقی مطالعے" لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۶۷ء

ادیب، سید مسعود حسن رضوی — "اردو زبان اور اس کا رسم خط" لکھنؤ دانش محل ۱۹۴۸ء

ابن حنیف — "تخلیق کائنات" ملتان دانش کدہ ۱۹۶۶

"جلجامش کی داستان" لاہور مکتبہ معین الادب ۱۹۹۱ء

"مصر کی قدیم مصوری" ملتان، کاروان ادب ۱۹۸۱ء

"ابوریحان البیرونی" لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ؟

ابوالفضل — "آئین اکبری" (ترجمہ مولوی فدا علی طالب) لاہور سنگ میل پبلیکیشنز

ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر — "جامع القواعد حصہ صرف" لاہور مرکزی اردو بورڈ ۱۹۷۱ء

(بطور مرتب) — "ہندوستانی گرامر از بنجمن شلزے" لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۷۷ء

ابوسلمان شاہ جہانپوری، ڈاکٹر — "اردو اصطلاحات سازی؛ کتابیات" اسلام آباد۔ مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۴ء

"کتابیات: قواعد اردو" اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۵ء

احتشام حسین / ڈاکٹر آغا سہیل — "اردو لسانیات کا مختصر خاکہ" لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۷۷ء

احسن مارہروی — "نمونہ منثورات" اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء

احسن عبد الشکور (مرتب) — "پاکستانی ادب" لاہور ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب ۱۹۸۱ء

؟ (مرتب) — "ادبی زاویے" اسلام آباد اکادمی ادبیات پاکستان ۱۹۸۴ء

احمد بیخود موہانی، سید — "گنجینۂ تحقیق" لکھنؤ اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۷۹ء

ادیب، اویس احمد — "تنقیدی مطالعے" لکھنؤ؟

امداد صابری — "تلامذۂ میر" راولپنڈی ۱۹۶۵ء

اقتدار حسین خان، ڈاکٹر — "اردو صرف و نحو" نئی دہلی ترقی اردو بیورو ۱۹۸۵ء

انعام الحق کوثر، ڈاکٹر — "براہوئی سے اردو تراجم و توضیحی کتابیات" اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان پمفلٹ ۱۹۸۶ء

انیس اشفاق، ڈاکٹر — "انتخاب غزلیات قائم چاندپوری" لکھنؤ اترپردیش اردو اکادمی ۱۹۸۳ء

ایم سلطانہ بخش، ڈاکٹر (مرتب) — "اردو میں اصول تحقیق" اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان جلد اول ۱۹۸۶ء، جلد دوم ۱۹۸۸ء

ایوب صابر، پروفیسر — "پاکستان میں اردو کے ترقیاتی ادارے" اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۵ء

پریشان خٹک، پروفیسر — "لسانی رابطہ" اسلام آباد۔ مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۷ء

پریم چند — "مضامین پریم چند (مرتبہ عتیق احمد) کراچی انجمن ترقی اردو پاکستان ۱۹۸۱ء

تاثیر، محمد دین — "نثر تاثیر" (مرتبہ: فیض احمد فیض) بہاول پور اردو اکاڈمی ۱۹۶۳ء

تاراچند، ڈاکٹر — "اسلام کا ہندوستانی تہذیب پر اثر" دلی آزاد کتاب گھر طبع دوئم ۱۹۷۲ء

تبارک علی نقشبندی، ڈاکٹر سید — "مرزا مظہر جان جاناں (ان کا عہد اور اردو شاعری)" نئی دہلی۔ انجمن ترقی اردو ۱۹۸۸ء

ثریا حسین، پروفیسر — "گارسین دتاسی اردو خدمات علمی کارنامے" لکھنؤ اترپردیش اردو اکادمی ۱۹۸۴ء

جابر علی سید — "کتب لغت کا تحقیقی و لسانی جائزہ" (جلد اوّل) اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۴ء

جمیل جالبی، ڈاکٹر — "تاریخ ادب اردو" لاہور مجلس ترقی ادب جلد اوّل ۱۹۷۵ء جلد دوئم ۱۹۸۲ء

"قدیم اردو کی لغت" لاہور مرکزی اردو بورڈ ۱۹۷۳ء

حاتم، شیخ ظہور الدین — "دیوان زادہ" (مرتبہ ڈاکٹر غلام حسین ذوالفقار) لاہور، مکتبہ خیابان ادب ۱۹۷۵

حسرت موہانی، سیّد فضل الحسن — "نکات سخن" حیدر آباد دکن طبع ششم ۱۹۲۵ء

حسن اختر، ڈاکٹر ملک — "اُردو شاعری میں ایہام گوئی کی تحریک" لاہور یونیورسل بکس ۱۹۸۶ء

خدیجہ شجاعت علی — "ترجمہ سہل حدائق البلاغت" از امام بخش صہبائی لاہور ۵۴ء

خلیل الرحمٰن داؤدی (مرتب) — "قواعد زبان اُردو مشہور بہ رسالہ گل کرسٹ" لاہور، مجلس ترقی ادب ۱۹۶۲ء

خلیل صدیقی — "زبان کا مطالعہ" مستونگ قلات پبلشرز ۱۹۶۴ء

خسرو، امیر — "مثنوی نہ سپہر" (مترجم: محمد رفیق عابد نبی دہلی) مکتبہ جامعہ ۶۹ء

خورشید لکھنوی — "افادات" لکھنو اتر پردیش اردو اکاڈمی ۱۹۸۲ء

خورشید یوسف — "مشینی ترجمہ کا ماضی اور مستقبل" اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء (پمفلٹ)

خیال، نصیر حسین خاں نواب — "داستان اُردو" حیدر آباد دکن ادارہ اشاعت اُردو

خیالی، محمد نعیم اللہ — "اردو ایک ہمہ گیر زبان" لکھنو دانش محل ۱۹۸۵ء

"اُردو کی بین الاقوامی حیثیت" (حصہ اوّل) لکھنؤ
دانش محل ۱۹۸۲ء

راز، ڈاکٹر رام آسرا، "اردو اور ہندی کا لسانی رشتہ" نئی دہلی مکتبہ جامعہ ۱۹۷۵ء

رام بابو سکسینہ "تاریخ ادب اُردو (ترجمہ) مرزا محمد عسکری" لاہور

رشید حسن خاں "اُردو املا" دہلی نیشنل اکادمی ۱۹۷۴ء

"زبان اور قواعد" لاہور مکتبہ عالیہ ۱۹۸۷ء

رضیہ نور محمد، ڈاکٹر "اُردو زبان اور ادب میں مستشرقین کی علمی خدمات کا
تحقیقی و تنقیدی جائزہ" لاہور، مکتبہ خیابان ادب ۱۹۸۵ء

رفیعہ سلطانہ، ڈاکٹر "اُردو، نثر کا آغاز و ارتقا" کراچی کریم سنز ۱۹۷۸ء

رے مے، آر بھر الیف جے "ایران و ہندوستان کا اثر جرمنی کی شاعری پر"
(مترجم: ریاض الحسن) کراچی پاک جرمن فورم ۱۹۷۳ء

زور، سید محی الدین قادری "اُردو کے اسالیب بیان" لاہور مکتبہ معین الادب ۱۹۶۲ء

"دکنی ادب کی تاریخ" کراچی اُردو اکادمی سندھ ۱۹۶۹ء

"سرگذشت حاتم" حیدر آباد دکن ادارہ ادبیات اُردو ۱۹۴۴ء

"ہندوستانی لسانیات" لاہور مکتبہ معین الادب ۱۹۶۱

سبط حسن "ماضی کے مزار" کراچی۔ مکتبہ دانیال ۱۹۸۴ء

سدھیشور ورما — "آریائی زبانیں" لاہور مکتبہ معین الادب ۱۹۶۰ء

سرشار، رتن ناتھ — "فسانۂ آزاد (جلد اوّل)" لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۰۴ء

سلیم الدین قریشی — "اردو کی پہلی مطبوعہ کتاب" اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء (پمفلٹ)

سلیمان ندوی، سیّد — "عرب و ہند کے تعلقات" کراچی اردو اکیڈمی سندھ ۱۹۸۶ء

"نقوشِ سلیمانی" کراچی مکتبہ مشرق

سید احمد دہلوی، مولوی — "فرہنگ آصفیہ" دہلی نیشنل اکادمی ۱۹۷۴ء

سہیل بخاری، ڈاکٹر — "اردو کا روپ" لاہور آزاد بک ڈپو ۱۹۷۱ء

"اردو کی کہانی" لاہور مکتبہ عالیہ ۱۹۷۵ء

"ہندی شاعری میں مسلمانوں کا حصہ" کراچی مکتبہ اسلوب ۱۹۸۵ء

شبیر علی کاظمی، سیّد — "پراچین اردو" کراچی مکتبہ اسلوب ۱۹۸۲ء

شرف الدین اصلاحی — "اردو سندھی کے لسانی روابط" اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان طبع دوئم ۱۹۸۷ء

شمس اللہ قادری، حکیم سید — "اردوئے قدیم" کراچی جنرل پبلشنگ ہاؤس ۱۹۶۳ء

شوکت سبزواری، ڈاکٹر — "اردو قواعد" کراچی مکتبہ اسلوب ۱۹۸۲ء

"اردو زبان کا ارتقا" ڈھاکہ پاک کتاب گھر ۱۹۵۶ء

علم ادارت (مرتب) — "اردو کے خوابیدہ الفاظ" لاہور مرکزی اردو بورڈ ۱۹۷۲ء

عین الحق فرید کوٹی — "اردو زبان کی قدیم تاریخ" لاہور اورینٹ ریسرچ سنٹر ۱۹۷۹ء

غلام حسین ذوالفقار، ڈاکٹر — خاتم - حالات و کلام" لاہور مکتبہ خیابان ادب ۱۹۶۴ء

غلام علی الانہ، ڈاکٹر — "زبان اور ثقافت" اسلام آباد. علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی

غلام مصطفیٰ، ڈاکٹر — "جامع القواعد حصہ نحو" لاہور مرکزی اردو بورڈ - ۱۹۷۳

فائق، قاضی نور الدین — "تذکرہ مخزن الشعرا (تذکرہ شعرائے گجرات)" لکھنؤ اترپردیش اردو اکادمی ۱۹۸۵ء

فرمان فتح پوری، ڈاکٹر — "اردو املا اور رسم الخط اصول و مسائل" لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۷۷ء

"زبان اور اردو زبان" لاہور آئینہ ادب ۱۹۷۳ء

فضلی، فضل علی — "کربل کتھا (دہ مجلس)" مرتبہ خواجہ احمد فاروقی دہلی شعبہ اردو دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ء

کامل قریشی، ڈاکٹر (مرتب) — "اردو اور مشترکہ ہندوستانی تہذیب" دہلی اردو اکادمی ۱۹۸۷ء

"کتاب مقدس کا پہلا حصہ یعنی پرانا عہد نامہ" (عبرانی سے اردو ترجمہ) لاہور برٹش اینڈ فارن بائیبل سوسائٹی پنجاب انگریزی طبع ہفتم ۱۹۰۸ء

کیفی، برجموہن دتاتریہ — "کیفیہ" لاہور مکتبہ معین الادب ۱۹۵۰ء

"منشورات" لاہور. مکتبہ معین الادب ۱۹۵۰ء

گستاؤلی بان، ڈاکٹر — "تمدن عرب" (مترجم شمس العلماء مولوی سید علی بلگرامی) سرگودھا ظفر ٹریڈرز -

"اردو لسانیات" کراچی مکتبہ تخلیق ادب ۱۹۶۶ء

صدیق الرحمن قدوائی — "ماسٹر رام چندر" دہلی شعبہ اُردو، دہلی یونیورسٹی ۱۹۶۱ء

صفدر حسین، ڈاکٹر سید — "لکھنؤ کی تہذیبی میراث" لاہور بارگاہ ادب ۱۹۷۵ء

طارق عزیز، ڈاکٹر — "اردو رسم الخط اور ٹائپ" اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان ۱۹۹۷ء

عابد علی عابد — "انتقاد" لاہور ادارہ فروغ اُردو ۱۹۵۶ء

"تنقیدی مضامین" لاہور مکتبہ میری لائبریری ۱۹۶۶ء

عبدالحق، ڈاکٹر مولوی — "اُردو کی ابتدائی نشو و نما میں صوفیائے کرام کا کام" کراچی انجمن ترقی اُردو ۱۹۵۳ء

"تنقیدات عبدالحق" (مرتبہ محمد تراب علی خاں باز) حیدرآباد دکن کتب خانہ عزیزیہ

عبدالقیوم (مرتب) — "تاریخ ادب اردو" کراچی پاکستان ایجوکیشنل پبلشرز

عصمت جاوید — "نئی اُردو قواعد" نئی دہلی ترقی اُردو بیورو ۱۹۸۱ء

عطش درانی — "اُردو زبان اور یورپی اہل قلم" لاہور سنگ میل پبلی کیشنز ۱۹۸۷ء

"مغربی ممالک میں ترجمہ کے قومی اور عالمی مراکز" اسلام آباد مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۶ء (پمفلٹ)

علی جواد زیدی — "انتخاب رند" لکھنؤ اتر پردیش اُردو اکادمی ۱۹۸۳ء

علی لطف میرزا — "تذکرہ گلشنِ ہند" لکھنؤ اتر پردیش اردو اکادمی ۱۹۸۶ء

Scanned with CamScanner

گوپی چند نارنگ، ڈاکٹر (مرتب) "لغت نویسی کے مسائل" نئی دہلی مکتبہ کتاب نما ۱۹۸۵ء

لطیف الزمان خان (مرتب) "خطوط رشید احمد صدیقی" کراچی مجلسِ ادبیات مشرق ۱۹۸۸ء

محمد اجمل، ڈاکٹر "نفسی طریقِ علاج میں مسلمانوں کا حصّہ (ترجمہ شہزاد احمد) لاہور ادارہ ثقافتِ اسلامیہ ۱۹۸۸ء

محمد اسحٰق صدیقی "فن تحریر کی تاریخ" علی گڑھ انجمن ترقی اُردو ۱۹۶۲ء

محمد اسماعیل پانی پتی "مقالات سرسیّد" (حصہ دہم) لاہور مجلس ترقی ادب، ۱۹۶۲ء

محمد باقر، ڈاکٹر "اُردو قدیم دکن اور پنجاب میں" لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۷۲ء

محمد سلیم، پروفیسر سیّد "اردو رسم الخط" کراچی مقتدرہ قومی زبان ۱۹۸۱ء

محمد صادق، ڈاکٹر "محمد حسین آزاد احوال و آثار" لاہور مجلسِ ترقی ادب

محمد سردار علی "تذکرہ یورپین شعرائے اُردو" حیدر آباد دکن ۱۹۴۱ء

"کچھ آبِ حیات کی حمایت میں" لاہور مجلس ترقی ادب

محمد صالح کمبوہ "عمل صالح المعروف بہ شاہجہاں نامہ" (مترجم: ڈاکٹر ناظر حسن زیدی) لاہور مرکزی اُردو بورڈ ۱۹۷۱ء

محمد عتیق صدیقی "گلکرسٹ اور اس کا عہد" علی گڑھ انجمن ترقی اُردو ۱۹۶۰ء

محمد مجیب "تاریخ تمدن ہند" لاہور پروگریسو بک ۱۹۸۶ء

محمد ہادی حسین "زبان اور شاعری" لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۸۴ء

محمود خاں شیرانی، حافظ "پنجاب میں اردو" لاہور مکتبہ معین الادب ۱۹۸۴ء

"مقالات حافظ محمود شیرانی" (مرتبہ مظہر محمود شیرانی) لاہور مجلس ترقی ادب جلد دوئم ۱۹۶۶ء

"مقالات شیرانی" لاہور کتاب منزل ۱۹۴۸ء

مسعود حسین خاں، ڈاکٹر — "مقدمہ تاریخ زبان اُردو" لاہور اُردو مرکز ۱۹۶۶ء

مہر عبدالحق، ڈاکٹر — "ملتانی زبان اور اس کا اُردو سے تعلق"، بہاول پور اردو اکیڈمی ۱۹۶۷ء

میر تقی میر — "نکات الشعرا" مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی لاہور ادارہ ادب و نقد ۱۹۸۰ء

میرزا ادیب (مرتب) — "تنقیدی مقالات" جلد اوّل لاہور، لاہور اکیڈمی ۱۹۶۰ء

ناطق لکھنوی، سید ابوالعلا حکیم — "نظم اُردو" لکھنو ۱۹۶۱ء

نصیر احمد، ڈاکٹر — "اُردو کی بولیاں اور کرخنداری کا عمرانی لسانیاتی مطالعہ" دہلی ادارہ تصنیف ۱۹۷۹ء

نصیر الدین ہاشمی — "دکن میں اردو" حیدر آباد دکن مکتبہ ابراہیمیہ طبع سوم ۱۹۳۶ء

"دکنی کلچر" لاہور مجلس ترقی ادب ۱۹۶۳ء

"دکھنی (قدیم اُردو) کے چند تحقیقی مضامین" دلی آزاد کتاب گھر ۱۹۶۳ء

نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر — "دلّی کا دبستان شاعری" کراچی انجمن ترقی اُردو پاکستان ۱۹۴۹ء

وحید الدین سلیم، سید — "افادات سلیم" لاہور مکتبہ عالیہ ۱۹۸۷ء

"وضع اصطلاحات" نئی دہلی ترقی اُردو بیورو طبع دوئم ۱۹۸۸ء

یونس جاوید (مرتب) "کلیاتِ ناسخ" لاہور مجلس ترقی ادب جلد اوّل ۱۹۸۷ء

جرائد / اخبارات

"آج کل" دہلی اُردو تحقیق نمبر اگست ۱۹۶۷ء اُردو نمبر اگست ۱۹۶۸ء

"اُردوئے معلّٰی" (قدیم اردو نمبر دہلی شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی / قائم نمبر)

"قائم نمبر" شمارہ ۸ دہلی شعبہ اُردو دہلی یونیورسٹی

"اخبارِ اردو" اسلام آباد جون ۱۹۸۲ء، فروری ۱۹۸۳ء جنوری ۸۴ء، ستمبر ۸۵، جولائی ۸۷ء

"ادبی دنیا" لاہور فروری ۱۹۴۱ء

"اُردو" (سہ ماہی) کراچی جولائی ستمبر ۱۹۷۵ء

"اُردو نامہ" ۔ لاہور سالنامہ مارچ ۱۹۸۳ء، مارچ ۱۹۸۶ء

"الناظر" لکھنو اکتوبر نومبر دسمبر ۱۹۲۵ء

"افکار" کراچی "برطانیہ میں اُردو ایڈیشن" اپریل ۱۹۸۱ء

"اقبال ریویو" لاہور جولائی ۱۹۶۵ء

"اقبال" (سہ ماہی) لاہور اکتوبر ۱۹۷۳ء

"امروز" (روزنامہ) لاہور ۲۷ جون ۱۹۶۸ء، ۲۸ جون ۱۹۷۲ء، یکم نومبر ۱۹۷۸ء، ۲۲ فروری ۱۹۸۰ء

"اوراق" نمبر ۳ نومبر ۱۹۶۸ء ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء

"اورینٹل کالج میگزین" شعبہ اُردو جامعہ پنجاب مارچ جون ۱۹۷۲ء

"خیابان" جلد ۱ نمبر ۳ جنوری ۱۹۷۲ء

"سویرا" لاہور مئی ۱۹۷۶ء

"سیپ" نمبر ۶ کراچی

"شاعر" بمبئی شمارہ نمبر ۳، ۴ ۱۹۸۶ء

"شب خون" الٰہ آباد شمارہ ۵۴ اکتوبر ۷۰ء

"صحیفہ" سہ ماہی لاہور - جولائی ۱۹۶۰ء، ۱۹۶۷ء، اپریل ۱۹۶۸ء - اکتوبر ۱۹۶۸ء، اپریل
جولائی ۱۹۷۰ء، جنوری، مارچ، اپریل، جون، جولائی، ستمبر ۱۹۸۶ء، جولائی اگست ۱۹۸۸ء

"غالب" (سہ ماہی) کراچی، اپریل جون ۱۹۷۵ء، جنوری مارچ ۱۹۷۷ء

"فنون" لاہور سالنامہ، غالب نمبر ۱۹۶۹ء - جولائی اگست ۱۹۸۲ء

"قومی زبان" کراچی دسمبر ۱۹۸۱ء جولائی ۱۹۸۸ء

"ماہ نو" لاہور مارچ ۵۳ء، اکتوبر ۱۹۷۸ء، جنوری ۱۹۷۹ء، اگست ۱۹۸۰ء، جولائی ۱۹۸۱ء
اکتوبر ۱۹۸۲ء، دسمبر ۱۹۸۷ء، جون ۱۹۸۸ء، ستمبر ۱۹۸۸ء

"مجلہ تحقیق" جامعہ پنجاب جلد ۱ شمارہ خاص ۱، ۲

"نیا دور" مارچ ۱۹۶۷ء

"نقوش" لاہور سالنامہ ۱۹۶۲ء، جنوری ۱۹۷۶ء، ادبی معرکہ نمبر ستمبر ۱۹۸۱ء

"نگار پاکستان" کراچی جنوری ۱۹۸۵ء اگست ۱۹۸۶ء، جولائی ۱۹۸۷ء، جنوری ۱۹۸۸ء،
جولائی ۱۹۸۸ء

"ہمایوں" دہلی سالنامہ جنوری ۱۹۶۹ء

"ہم سخن" (جناح گورنمنٹ کالج کراچی) حضرت امیر خسرو نمبر ۱۹۷۴ء، ۱۹۷۵ء -

"ہندوستانی" آلہ آباد - جنوری ۱۹۳۱ء

BIBLIOGRAPHY

BAILEY, T. GRAHAME	"TEACH YOUR SELF HINDUSTANI" LONDON, ENGLISH UNIVERSITY PRESS, 1950
CASSIRER, ERNEST	"AN ESSAY ON MAN N.Y DOUBLEDAY 1954
FORBES, DUNCAN	"DICTIONARY URDU AND ENGLISH" LAHORE, SANGE MEEL PUBLICATIONS 1986
HAMILTION, EDITH	MYTHOLOGY, N.Y MENTOR BOOKS 1959.
	LIFE RIBLE ISSUE 94, 1965
PLATTS, JOHN T.	A DICTIONARY OF URDU, CLASSICAL HINDI AND ENGLISH LAHORE, SANG-E-MEEL PUBLICATIONS 1983
RYBUS, G.D	URDU PROSODY AND RHETORIC LAHORE, 1924
SANDARS, N	THE EPIC OF GILGAMISH BALTIMORE PENGIN BOOKS, 1964
SHAKESPEAR, JOHN	"DICTIONARY URDU ENGLISH AND ENGLISH URDU. LAHORE SNAG-E-MEEL PUBLICATIONS 1980
SHUMAKER, WHYNE	LITERATURE AND THE IRRATIONAL N.Y
SPENCE, LEWIS	"THE OUT LINE OF MYTHOLOGY N.Y PENGIN BOOK 1961

STEITNGASS. F "A COMPREHENSHIVE PERSIAN ENGLISH DICTIONARY LAHORE SANG-E-MEEL PUBLICATIONS 1977

WHITWORTH, GEORGE CLIFFORD AN ANGLO-INDIAN DICTIONARY •LAHORE SANG-E- MEEL PUBLICATIONS 1983